حکایت از گلِ ما یار دل نواز کنید

بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنید

نقوشِ خیال

BIOGRAPHY OF MV HUSSAIN AHMED ARKANI

(دوسرا ایڈیشن)

تالیف:

محمد طاہر جمال ندوی

ناشر:

دار البحوث والمناصرة الاسلامية

چاٹگام، بنگلا دیش

کتاب : نقوش خیال (تذکرۂ مولانا حسین احمد صاحب ارکانی)

مؤلف : محمد طاہر جمال ندوی، فاضل دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، انڈیا۔

پہلا ایڈیشن : ۱۱ / مئی / ۲۰۲۴ء (خورشیدِ تاباں)

دوسرا ایڈیشن : ۱۲/مئی / ۲۰۲۶ء (نقوشِ خیال)

طباعت : مولانا صغیر احمد، اندر قلعہ شاہی جامع مسجد، چاٹگام، بنگلا دیش

تعداد : ۱۰۰۰ (ایک ہزار)

قیمت : ۵۰۰/ ٹاکا، بنگلہ دیشی۔ ۲۰/ ریال سعودی

کمپوزر : محمد طارق جمال بن محمد طاہر جمال ندوی

ملنے کے پتے : 0088-01533091784

Email : tahernadwi@gmail.com

انتساب

میں اپنی اس حقیر کاوش کو دورِ آخر میں سرزمینِ ارکان کے جلیل القدر عالم دین، مفسر و محدث، اصولی و فقیہ حضرت العلامہ جناب مولانا سلطان احمد صاحب فوئمالوی بوسیدنگی رحمۃ اللہ علیہ کے نام انتساب کر پانے کو اپنی سعادت محسوس کرتا ہوں، جنھوں نے اپنی مستعار زندگی کے دوران ظلمت کدۂ ارکان میں علم وعمل کے حقیقی چراغ جلانے کی اپنی بساط بھر کوشش کی، اور حق وصداقت کے علم بلند رکھنے میں کوئی بھی کسر باقی نہیں چھوڑی، اور اس راہ میں غیر تو غیر بلکہ اپنوں کے بھی ہزاروں تیر کھاتے ہوئے داعئ اجل کو لبیک کہا، اللہ تعالی حضرت مولانا کے درجات بلند کریں، اور ہمیں بھی آپ کے نقوشِ قدم پر چلنے کی توفیق عنایت فرمائیں، آمین۔



خاکسار:

محمد طاہر جمال ندوی

۰۲/جون/۲۰۲۲ء

چاٹگام، بنگلادیش۔

رہتا قلم سے نام قیامت تلک ہے ذوقؔ

اولاد سے ہے بس یہی دو پس و چار پشت

عرضِ ناشر

الحمدللہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، و بعد

عرض ہے کہ زیر نظر کاوش کے نامور مصنف محترم والد گرامی قدر حضرت مولانا محمد طاہر جمال ندوی (فاضل جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ہند (تلمیذ خاص مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی شخصیت ہمارے دینی وروحانی، علمی وثقافتی، فکری وسیاسی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، آپ ایک قابلِ القدر عالم دین، معروف ادیب وقلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور مفکر ومورخ بھی ہیں، جن کی چند تصانیف ماشاء اللہ چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں، اور بہت ساری تصانیف اب تک زیرِ طبع وزیرِ نظر بھی ہیں۔

مولانا کی ان تمام تصانیف میں سے ایک مقبول ترین تصنیف ''سرزمین ارکان کی تحریکِ آزادی تاریخی پس منظر میں''، جو دسمبر/ ۱۹۹۹ء میں پہلی مرتبہ چھپ کر منظر عام پر آئی، جس کے حوالے سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ: ''فاضلِ عزیز مولوی محمد طاہر جمال ندوی شکر و سپاس کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی محنت ولیاقت کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا، اپنے وطن کا حق ادا کیا، اور تاریخ کے خلا کو پر کیا، جو عرصہ سے پایا جاتا تھا'' الحمدللہ مصنف کی اور سات تصانیف اب تک منظر عام پر آچکی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

☆ سرزمین ارکان کی تحریکِ آزادی تاریخی پس منظر میں۔
☆ سازش کا طوفان عقلیت ومادیت کے روپ میں۔
☆ روہنگیا مسلمانوں کے جانگسل المیے۔
☆ تذکرۂ علامہ سید الامینؒ۔

☆ تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانیؒ۔
☆ روہنگیا مسلمان اوران کی ہجرت کے اسباب۔
☆ ارکان کے عظیم شاعر الاول، حیات وکارنامے
☆ ارکان روہنگیا یونین، ماضی وحال کے تناظر میں۔
☆ روہنگیا چیخ وپکار اور مطالبات (ترجمہ)۔
☆ وادیٔ پرخار کے گمنام مسافر۔
☆ سالارِ کارواں محمد جعفر حبیبؒ
☆ سرخیل کارواں۔
☆ نقوش رفتہ
☆ جمعیت علمائے اسلام ارکان۔
☆ روہنگیا رسم الخط کا ایک علمی اور فکری جائزہ۔
☆ روداد سخن۔
☆ نقوش خیال۔
☆ ارکان کے دو بڑے ستارے۔
☆ حیاتِ نور۔
☆ برما میں خانہ جنگی کا دور دورہ۔
☆ حیاتِ ڈاکٹر محمد یونس صاحب۔
☆ ارکانی ندوی۔
☆ مدارس اسلامیہ کا نصاب ونظام اور جدید تقاضے۔
☆ ارکان کا جغرافیہ۔
☆ ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن۔(ARNO)
☆ حرکۃ الیقین (ARSA)
☆ ارکان کے دو بڑے ستارے۔

☆ارکان کے مسلمان موت وحیات کی کشمکش میں

۔☆ جمعیت علمائے اسلام ارکان۔

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلدا)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۲)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۳)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۴)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۵)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۶)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۷)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۸)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۹)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۱۰)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۱۱)

☆ تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے (جلد ۱۲)

اللہ تعالی کا کرم ہے کہ آج مولانا کی ایک زندہ اور بے مثال کاوش ''نقوشِ خیال'' جو مولانا حسین احمد ابوالفضل ارکانی کا تذکرہ ہے، ہمیں طبع کر کے اس کی اشاعت کی توفیق ہوئی ہے، **ذالک فضل اللہ یو تیہ من یشاء و اللہ ذو الفضل العظیم۔**

ہم اپنے اس زندہ دل عظیم مصنف وقلم کار کو ان کے زندہ کارناموں پر حراجِ تحسین وگلدستۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنی خاص رحمت اور فضل وعنایات سے مصنف کی زندگی اور قلمی کاوشوں کو مزید شرفِ قبولیت سے نوازے۔

پھر میری ان سطور کے تقریباً اواخر میں عرض ہے کہ والدگرامی حضرت مولانا محمد طاہر جمال ندوی کی زیر نظر کاوش ۱۱/مئی/ ۲۰۲۴ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوکر منظر عام پر آئی تو ناظرین وقارئین کرام نے حضرت مصنف کو خراج تحسین پیش کیا، اور ہر جانب سے حضرت کی یہ اور ان جیسی دیگر کاوشوں پر تہ دل

سے شکریہ ادا کیا، تاہم بعض اہل علم وفکر اور صاحبِ مجد وبصیرت حضرات علماء اور اہل دانش کی طرف سے دادِ تحسین کے ساتھ کچھ ملاحظات/تحفظات بھی پیش کئے گئے، جنہیں سامنے رکھ کر ہم نے حضرتِ مصنف سے گزارش کی کہ اہل علم وفکر ناظرین وقارئین کی جانب سے جتنے بھی تحفظات آئے ہیں انہیں سامنے رکھ کر اس دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح کر دی جائیں، علاوہ ازیں خود مصنف کی طرف سے بھی یہ بات سامنے آئی ہے کہ دراصل اس کاوش کے طبع اول میں بعض فروگزاشتیں بھی تھیں اور بعض اضافہ وترمیم کی ضرورت والی چیزیں بھی، اس لئے ضروری ہے کہ ان تمام چیزوں کو ملحوظ رکھ کر اس دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح کر دی جائیں، الحمدللہ اس دوسرے ایڈیشن میں خود کتاب کے نام کے ساتھ (یاد رہے کہ پہلے ایڈیشن والے نام ''خورشیدِ تاباں'' پر بعض اہل نظر نے شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے) حتی المقدور بعض ضروری چیزوں کی اصلاح کر دی گئی ہیں۔

پھر بھی ظاہر ہے کہ یہ ایک انسان اور وہ بھی اردو کے ایک عجم کے مصنف کی تصنیف ہے، جس میں قوی امکان ہے کہ لسانی فروگزاشتوں کے علاوہ علمی اور فکری لغزشیں بہت ساری ہوسکتی ہیں، تو ناظرین وقارئین کرام سے امید نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ دوران مطالعہ ایسی کوئی فروگزاشتیں اور خامیاں نظر آئیں تو ہمارے ادارہ کو مطلع کرنے کی زحمت گوارہ کریں گے، آخر میں اللہ تعالی سے دعاء ہے کہ وہ اپنے خاص فضل وکرم سے مصنف کی تمام کاوشوں کے ساتھ ان کی زندگی اور ان کی جملہ قومی وملی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

محتاج دعا/

محمد طارق جمال

سکریٹری خاص

دار البحوث والمناصرة الاسلامية

چاٹگام، بنگلا دیش۔

فہرستِ عنوان

نقشِ خیال

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على أشرف الانبياء وسيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين ولا عدوان الا على الظالمين، وبعد:

اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ سرزمین اسلام ارکان علماء وصلحاء، درویش اور خدارسیدہ بزرگوں کی سرزمین ہے، جس کے چپے چپے اور گوشے گوشے میں ہمارے ان بزرگوں کی ان گنت خواب گاہیں موجود ہیں، جنھوں نے اس کو اسلام کی روشنی اور تابانی سے روشن اور تاباں کیا، اور اس گلشنِ اسلام کی آبیاری اور پاسبانی کی، اور اس کار خیر کے لئے اپنی زندگیاں کھپائیں اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے، ویسے ہم آج فخر سے سربلند کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف اور ان کی روشن اور گراں قدر خدمات اور ان کے انگنت کارنامے دنیا کی دیگر زندہ دل قوموں کے اسلاف و بزرگوں اور ان کی گراں مایہ خدمات اور کارناموں سے کسی بھی معنی میں کم نہیں ہیں، خدا سے دعا ہے کہ وہ اپنے خاص فضل وکرم سے ان کی زندگیاں اور ان کی تمام خدمات، سرگرمیوں اور کارناموں کو شرفِ قبولیت بخشے، اور ان کی بال بال مغفرت کر کے انہیں جنت الخلد میں جگہ عطا فرمائے، اور ہمیں اپنے ان زندہ دل اسلاف اور بزرگوں کے نقوش قدم پر چلتے ہوئے اسلام اور امتِ مسلمہ بشمول تمام بنی نوع انسان کی خدمات انجام دینے کی توفیق سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

لیکن ہمارے لئے یہاں ایک افسوس، یاس اور حسرت کا مقام ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے حالات چاہے اجمالی ہی سہی اپنی آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ نہیں رکھ سکے، آج کل جو حالات ہماری بھولی بسری تاریخ اور سوانحی دستاویزات میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں، ان کے متعلق ہم یقین

سے کہہ سکتے ہیں کہ دراصل وہ سب ہمارے ان روشن ضمیر بزرگوں کی خدماتِ جلیلہ کا دسواں حصہ بھی نہیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اسلاف سمیت ہماری ماضی کے بزرگانِ دین اتنے مخلص تھے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا اللہ تعالی کی رضا جوئی اور خوش نودی کے لئے کیا، اور دکھاوے سے ان کے دل و دماغ کوسوں دور تھے، شاید ان کے نزدیک ان کی خدمات اور سرگرمیوں کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ رکھنے کی کوئی بھی کوشش ان کے اخلاص وللّٰہیت کی منافی تھی، اور شاید اس لئے بھی ہو کہ انہوں نے اپنی کسی بھی خدمات، کارناموں اور سرگرمیوں کی کسی بھی روداد اپنی آنے والی نسلوں کے لئے کہیں بھی محفوظ نہیں رکھی، کہیں آنے والی نسلیں ان کی ریکارڈ کردہ چیزوں کو دیکھ کر یہ خیال نہ کریں کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا اللہ تعالی کی خوش نودی اور رضا جوئی کے بجائے لوگوں کو دکھانے اور داد حاصل کرنے کے لئے کیا ہے۔

دراصل بات یہی ہے کہ ہمارے لوگوں کو چاہے ان کا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے ریکارڈ رکھنے کی عادت ہی بہت کم ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے اسلاف اور بزرگوں کے تاباں اور درخشاں کارناموں کے حوالے سے آج کل جتنی بھی چیزیں ملتی ہیں، ان کا تقریبا نوے فیصد حصہ میرے علم کے مطابق ہماری برادری ''روہنگیاؤں'' کا نہیں بلکہ غیروں کا محفوظ کردہ ہے۔

الا یہ کہ سولھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک ہمارے اسلاف اور بزرگوں کی کچھ تحریریں اور کچھ ریکارڈ کردہ دستاویزات برصغیر ہند کے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں، جن میں کلکتہ نیشنل لائبریری میرے نزدیک ناقابلِ فراموش ہے، علاوہ ازیں شنید ہے کہ یہاں کے کتب خانوں کے علاوہ برطانیہ کے دیگر کتب خانوں میں ہماری اس نوعیت کی چیزیں محفوظ ہیں، برطانیہ سمیت یوروپ والے جن کو علم و ہنر کے حوالے سے ضروری چیزوں کو محفوظ رکھنے کی گویا لت لگی ہوئی ہے، مگر افسوس ہے کہ وہاں کی ساری چیزیں ہم جیسوں کی دسترس سے کوسوں دور اور باہر ہیں۔

بہر حال ۱۹۹۸ء کے دوران میں نے کلکتہ نیشنل لائبریری میں چند دن مطالعے و مراجعے میں گزارے، وہاں سے اپنی بساط بھر استفادہ کیا، اگر ہماری تاریخ، ثقافت اور تہذیب وتمدن کے حوالے سے وہاں پائی جانے والی چیزوں پر مزید مطالعہ کیا جائے (جو بہت اہم اور نہایت ضروری ہے) تو کام

کی ایک بڑی بات ہوگی، اللہ کرے کہ ہمارے کسی اہل نظر لکھاری کو اس کی توفیق ہو جائے۔

بطور خاص ۱۹۹۲ء سے لے کر ۱۹۹۸ء تک پھر رہ رہ کر اس کے بعد کے عرصے میں سرزمین ارکان کی تاریخ اور ثقافت کے علاوہ اس علاقے کے حوالے سے دیگر ضروری موضوعات پر بساط بھر مطالعہ کی توفیق ہوئی تھی، اس طویل مطالعہ کے دوران کوشش کی گئی تھی کہ سرزمین ارکان بشمول دیگر علاقہ جات اور خطوں میں مدفون ہمارے اسلاف کی بھولی بسری زندگیاں اور ان کی خدمات وکارناموں کو کسی بھی طریقے سے محفوظ کر لیا جائے، اس حوالے سے ابھی کوشش شروع کی تو اشہب قلم مسلسل آگے بڑھنے کی جگہ چند قدم چل کر رک سا گیا، اور آگے بڑھنے کے بجائے ہچکولے پر ہچکولے کھاتا رہا تھا، اس حالت میں اللہ تعالی کی طرف رجوع کیا گیا، الحمد للہ جس کی توفیق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین کے صدقے پھر اساتذۂ کرام اور بزرگوں کی دعا اور نیک تمناؤں کی برکت سے اس پر کٹھن اور سنگلاخ میدان میں اگرچہ رک رک کر سہی قدم آگے بڑھنے لگا تھا، اور اپنی مستعار نجی زندگی کے کچھ نجی مصروفیات کے علی الرغم دیگر علمی، فکری وقلمی مشغولیات کے ساتھ ہی ساتھ چند سال گزرتے نہ گزرتے ''سرزمین ارکان کے درخشاں ستارے'' کے عنوان سے دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک کام کی چیز مسودہ سے آگے بڑھ کر مبیضہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ یہاں ایک اور بات جو میرے نزدیک بہت اہم اور قابلِ تذکرہ ہے کہ ان مذکورہ دس مجلدات (جن میں ہمارے تقریبا ساڑھے چھ سو سے زائد اعیان کرام کی زندگیاں کسی کی اجمالی اور کسی کی تفصیلی شکل میں محفوظ ہو چکی ہیں) کے علاوہ اس سلسلے اور اسی موضوع کی کچھ اور کوششیں (جن میں سے کچھ چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں اور کچھ زیر طبع اور زیر نظر ہیں) ہو چکی ہیں، سرِ دست ان ساری کاوشوں پر کچھ لکھا جائے تو بات بڑی طویل ہونے کا شدید اندیشہ ہے، تاہم قدرے اجمال کچھ یوں ہے کہ؛

(۱) تذکرۂ علامہ سید الامین رحمۃ اللہ علیہ: یہ تصنیف تقریبا ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل خاکسار کی ایک ناچیز کوشش کا نتیجہ ہے، جو ۲۰۲۰ء میں ''دار البحوث والمناصرۃ الاسلامیہ چاٹگام، بنگلا دیش'' سے چھپ کر منظر عام پر آ گئی اور ناظرین کرام کے ہاتھوں ہاتھ پہنچ کر بے حد مقبول ہو چکی ہے، الحمد للہ، اس کا دوسرا ایڈیشن بھی سامنے آ چکا ہے۔

(۲) تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ: یہ راقم سطور کی گراں قدر تصنیف ساڑھے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل زیر طبع ہے، ظاہر ہے کہ یہ قطب زمان حضرت مولانا شاہ عبدالسلام صاحب ارکانی گودام فاروی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات ہے، اللہ کرے تو جلد طبع ہوکر منظر عام پر آنے والی ہے۔

(۳) سالار کارواں: میری یہ ناچیز کاوش بھی الحمد للہ زیر طبع ہے، تقریبا ساڑھے چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ ہمارے عظیم قائد حضرت محمد جعفر حبیب کجافوی، علی چنگی کا تذکرہ ہے، اللہ کرے تو بہت جلد منظر عام پر آنے والا ہے۔

(۴) سرخیل کارواں: یہ ہمارے ایک مرد مجاہد (جن کا نام تا حال منظر عام پر لانا مناسب معلوم نہیں ہو رہا ہے) کا تذکرہ اور اس کی نسبت سے قائم زیر زمین کام کرنے والی ایک روہنگیا تنظیم کی حسین وجمیل اور بڑی دلچسپ روداد ہے، زیر نظر یہ کاوش بھی چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔

(۵) ان مذکورہ تصانیف کے بعد راقم سطور کی اور ایک اچھی تصنیف (حیاتِ نور) تقریبا ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل حال ہی میں منظر عام پر آچکی ہے، جو سرزمین ارکان کے نامور اور عبقری قومی قائد جناب محترم نور الاسلام صاحب صدر ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کی مفصل سوانح حیات ہے، اللہ تعالی ان کی حیات میں برکت دے۔

(۶) ۲۰۲۶ء کی بات ہے کہ راقم کی اور ایک تصنیف بھی شائع ہوچکی ہے، جس کا نام ''حیاتِ ڈاکٹر محمد یونس'' ہے، یہ روہنگیا مسلم قوم کی اور ایک معروف ومشہور شخصیت، قائد محترم جناب ڈاکٹر محمد یونس صاحب صدر روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی سوانح حیات ہے۔

(۷) ابھی مئی/۲۰۲۶ء میں راقم کی ایک اور تصنیف شائع ہوچکی ہے، جس کا نام ''ارکان کے دو بڑے ستارے'' ہے، یہ ارکان کے دو بڑے عالم دین حضرت مولانا مفتی سلطان احمد صاحب ریدوی ارکانی اور خطیب ارکان حضرت مولانا سعید عالم صاحب ریدوی ارکانی کی سوانح حیات ہے۔

(۸) اللہ تعالی کے فضل وکرم سے اس ناچیز فقیر نے اپنے کمزور اور ناتواں قلم سے ہمارے بہت ساروں کے متعلق لکھی ہوئی چیزیں منظر عام پر لانے کی کوشش کی اور جس کا سلسلہ بحمد اللہ تا حال جاری ہے، تو ان

ساروں کے مابین میرے مربی گرامیٔ قدر محترم مولانا الحاج حسین احمد ابو الفضل صاحب لمبا بیلی، بوسیدنگی، ارکانی حفظہ اللہ تعالی ورعاہ کے متعلق کچھ لکھنا میری ایک دیرینہ آرزو اور دلی تمنا تھی، جو اللہ تعالی کی توفیق اور اس کی خاص عنایات سے پوری ہونے جارہی ہے، اس حوالے سے یہ ایک سچی بات ہے کہ مولانا جیسے فخر روزگار پر شایانِ شان لکھنا اور بجا طور پر لکھ کر عہدہ برآ ہونا میرے لئے مشکل ضرور ہے ، لیکن اللہ تعالی کی توفیق پر بھروسہ کر کے بطور سعادت بساط بھر خامہ فرسائی کی جا چکی ہے، جس میں اگرچہ بظاہر ناچیز کی خطاؤں کے بطور اس کی اپنی لاعلمی اور کم فہمی کا نتیجہ بھی ممکن ہے کہ سامنے آئے گا، مگر وہ چیزیں جو اپنے اندر حقائق وواقعات چھپائے رکھتی ہیں، ان کا جائز وبرمحل طور پر آشکار کرنا اور بجا طور پر کرسکنا بھی اس ناکارہ کی کرامات اور خرقِ عادات سے کسی بھی طرح کم نہیں۔

ظاہر ہے کہ مولانا محترم کسی کے لئے جو کچھ بھی کیوں نہ ہوں لیکن میرے لئے ایک عظیم انسان ہیں، اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ دنیا بارہا ان لوگوں کا تذکرہ دہراتی رہتی ہے، جن کی عظمت کی وہ قائل ہوچکی ہو، لیکن یہاں اس ضمن میں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ آیا عظمت کس چیز کا نام ہے؟ اور اس لفظ کا مفہوم کیا ہے؟؟ جوابات تو لوگ طرح طرح کے دیتے اور دے سکتے ہوں گے، مگر حقیقت یہی ہے کہ اس سوال کا کوئی فیصلہ کن اور اطمینان بخش جواب اب تک شاید کسی نے دیا ہو۔

پچھلی سطور میں عرض کی جاچکی ہے کہ مولانا محترم اس خاکسار اور اس کی طرح بہتوں کے نزدیک بلا شبہ عظیم ہیں اور اس میں شاید کوئی دو رائے ہوسکتی ہے کہ مولانا اپنی ذات میں بہت سی وہ چیزیں رکھتے ہیں، جنہیں عظمت جیسے مبہم لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، تو آپ کی یہی عظمت تھی کہ جس نے مجھے آج آپ کے تذکرے لکھنے پر مجبور کیا ہے، اس حوالے سے کم سے کم ہمارے قارئین کرام اتنی سی بات سن رکھیں کہ اس جہانِ نو و کہن میں دنیا کے عظماء ومشاہیر کے تذکرے بہت ہوچکے ہیں، تو آج ایک مظلوم قوم کے بعض کے نزدیک ایک عظیم کے تذکرہ بھی سننے اور پڑھنے کی تکلیف گوارہ کرلیں، امید نہیں کہ آج کے بعد پھر کبھی کوئی ان کا تذکرہ کرے، کیوں کہ اس حوالے سے ہماری حالت بہت ہی دگرگوں، پریشان کن اور حد سے زیادہ المناک ہے۔

یہاں اس ذیل میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ بعض حضرات اپنے کسی بزرگ کی سوانح حیات معرض وجود

پر لاتے وقت محض اس کی اچھائی کے پہلو قلم زد کرتے اور ان کے نزدیک صاحبِ سوانح کی کسی ایسی چیز لکھنا جس میں ان کی کم زوری کا پہلو مضمر، دبا ہوا یا نمایاں طور پر پایا جاتا ہو، کوئی اچھی بات نہیں ہے، لیکن میں اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ جب تک صاحب سوانح کی زندگی کے ممکنہ تمام پہلو ضبط کتابت میں نہ لائے جائیں، تب تک اس کی شخصیت نکھر کر قارئین کرام کے سامنے نہیں آسکتی، زیر نظر میری اس کاوش میں بھی میں نے اپنی نظر کی حد تک اس نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا ہے۔

یوں بھی راقم سطور کے نزدیک کسی بڑے کے افتادِ طبع، مزاج وطبیعت کی مختلف ومتنوع کیفیتوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنا کوئی اس کی توہین نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت یا اظہار واقعہ ہے، قرآن کریم میں سیدنا موسی علیہ السلام کی طبیعی سختی کا بیان فرمایا گیا ہے، لیکن اس کے باوصف وہ اللہ تعالی کے برگزیدہ اور لاڈلے رسول ہیں، حدیث اور سیرت کی کتابوں میں حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالی عنہ کی تلخ مزاجی کی طرف واضح اشارے موجود ہیں، لیکن بایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ {لو کان بعدی نبی لکان عمر}۔

یہ ایک حقیقت جو قارئین کرام کے ذہن میں ہمیشہ رہنی چاہئے کہ دنیا میں ہر انسان ایک ہی طبیعت کا مالک نہیں ہوتا، اور نہ ہی سارے علمائے کرام کا مزاج یکساں ہوتا اور نہ ہی ہوسکتا ہے، جس طرح مختلف افراد مختلف طبائع رکھتے ہیں اسی طرح علمائے کرام اور مشائخ عظام بھی الگ الگ طبیعتوں کے مالک ہیں، کسی میں سختی اور ترشی کا پہلو نمایاں ہے تو کسی میں نرمی اور شکستگی کا عنصر غالب، کوئی انتہائی نازک مزاج ہے تو کوئی حد درجہ متوازن ومعتدل، یوں ان کی عادات واطوار کو صفحاتِ قرطاس کی زینت بنانا اور ان کے طرز ادا اور نہج کلام کی مناسب الفاظ میں صراحت کرنا میرے نزدیک سوانح نگاری کا لازمی جزو ہے، کیوں کہ گلشنِ ہستی کی رونق اسی تضاد اور اسی اختلاف سے قائم ہے، اور اس عالم آب وگل کی گہما گہمی انہی اضداد وتناقضات کی مرہونِ منت ہے:

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہان کو ہے زیبِ اختلاف

یوں مولانا حسین احمد صاحب کے متعلق پڑھتے وقت یہ خیال کرنا کہ مولانا کا مزاج، طبیعت اور ان

کا افتادِ طبع فلاں جیسا کیوں نہیں ہوا؟ کاش مولانا اس شیخ یا اس عالم فاضل جیسے ہوتے یا ہوسکتے! میرے ناقص خیال میں اس قسم کی ذہنیت کے ساتھ ایک مولانا تو کیا دنیا میں کسی بھی انسان کو پڑھا نہیں جاسکتا، اس بات سے میرا مدعا یہی ہے کہ مولانا مولانا ہی ہیں، انہی پڑھنے کے دوران انہی کی شخصیت اور صفات وکمالات پر نظر رکھنا ضروری ہوگا، اور کام کے لئے یہی بس کافی ہے۔

مولانا محترم کو لکھتے وقت زبدۃ العلماء، عمدۃ المفسرین، قدوۃ الصالحین، راس الاتقیاء، فخر الاذکیاء، امام العصر، شیخ القرآن، شیخ الحدیث وشیخ الاسلام وغیرہ الفاظ سے میں نے یاد نہیں کیا، جو برصغیر میں عام بریلوی حضرات اپنے کسی بزرگ کے متعلق لکھا کرتے ہیں، البتہ یہ الگ بات ہے کہ اس خطے میں بریلویوں سے یہ متعدی مرض دیوبندی مکتبِ فکر میں منتقل ہوا، اس کے بعد اہل حدیث مصنفین اور مضمون نویسوں میں بھی یہ بیماری شدت سے لاحق ہوگئی ہے، تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ مولانا محترم بہت سوں کی نظر میں ایک ہمہ جہتی شخصیت اور کثیر الاطلاع عالم ہیں، تفسیر وحدیث، فقہ واصول، تذکرہ وسوانح، طبقات العلماء والفقہاء والمحدثین والمفسرین وغیرہ موضوعات کے متعلق ان کی معلومات کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے، غرض بعض کے نزدیک ہمارے علاقے میں یہ اور ان جیسے موضوعات پر مولانا جیسا ایک عالم کا ملنا ناممکن تو نہیں لیکن قحط الرجال کے اس عالم میں مشکل ضرور ہے۔

بعض کے نزدیک یہ قدرت کی کرشمہ سازی ہے کہ وہ اپنے خاص فضل وکرم کے بوقلموں اور بھرپور خزانوں سے مولانا صاحب کو انتہائی فیاضی اور نہایت فراخ دلی سے نوازا ہے، شک نہیں ہے کہ مولانا کی شخصیت میں بلا کی تاثیر اور غضب کی کشش ہے، ان کے نزدیک آپ کا شمار انہی حضرات میں ہونا چاہئے جن کو لوگ من موہنی شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں، علاوہ ازیں بے مثال ذہانت، گہری وعمیق علمیت، غیر معمولی وسعتِ نظر، بلندیٔ فکر وخیال، دور اندیشی وتہ بینی، اور ان تمام صفات وکمالات عالیہ پر مستزاد فراخ دلی، عالی ظرفی اور بلند حوصلگی نے آپ کی شخصیت میں سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔

مولانا محترم ہمارے زمانے کے بعض نام نہاد منطقیوں کی طرح بات بات پر تمہید ومقدمہ باندھنے اور دورانِ گفتگو بال سے کھال نکالنے اور باتوں کا بتنگڑ بنانے کے عادی نہیں ہیں، لیکن بعض ضروری حالات میں کسی لازمی اور خاص موضوع پر باتوں میں چھپے راز نکالنے کے عادی ضرور ہیں، ان کو علمی

رنگ وڈھنگ، عالمانہ انداز واطوار اور زبان وادب میں بحث وگفتگو کرنے میں حد درجہ کی لیاقت اور کمال کا ملکہ حاصل ہے، تاہم جہاں تک میرا اندازہ ہے کہ آپ کی گفتگو سے عمومی طور پر بہت کم لوگ بہرہ مند ہوسکتے ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ وہ لوگ جو آپ کی طبیعت کی نیرنگی ورنگارنگی اور آپ کے مخصوص افتادِ طبع اور شخصیت کی نزاکت سے واقف نہیں ہوتے، وہ بسا اوقات آپ کی گفتگو کے انداز و ادا سے پریشان بلکہ مضمحل ہوجاتے ہیں، لیکن وہ حضرات بہت ہی محظوظ اور مستفید ہوتے اور ہوسکتے ہیں جو آپ کی متضاد ونرالی طبیعت کی ہمہ جہتی سے واقف ہوتے اور آپ کی شخصیت سے مانوس ہونے کے تہ بہ تہ علمی اور فکری اعتبار سے وسیع الظرف اور بالغ نظر بھی ہوتے ہیں۔

یہ تو ایک عام سی بات ہے کہ کسی انسان یا کسی شخصیت کا اخلاق بتدریج ظاہر ہوتا ہے، ابتدائی صحبتوں میں ہر شاطر انسان اپنے مخاطب کو زورِ خطابت سے مسحور ومخمور کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن طویل رفاقت کے بعد اس کی حقیقت کی قلعی کھل جاتی ہے، اس دنیا میں ہم نے بہت سارے انسان دیکھے، جن میں سے بہت ساروں کو اچھا بھی سمجھا، لیکن تجربہ کے بعد بہت ہی کم لوگ میری معیار کے مطابق یا دوسرے الفاظ میں اعتدال وتوازن کی میزان میں صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ زندگی کے اس طویل سفر کے دوران ایسے تجربے بھی ہوئے ہیں کہ قریب تھا کہ خود انسانیت سے ہی اعتماد اٹھ جاتے۔ ویسے مولانا کے ساتھ اس طویل رفاقت میں مجھے آپ کی بعض حرکات وسکنات، مزاج کی رنگینی اور طبیعت کی افتاد گی، مخمصے میں ڈالنے والا متضاد ڈھنگ وادا اور طرزِ بود وماند، شخصیت کا تنوع اور گفتگو کی رنگارنگی، اور آپ کے بعض نرالے طریقۂ زندگی پر شبہ سا ہونے لگا تھا کہ کہیں آپ ایک دنیادار انسان تو نہیں ہیں؟ مگر مجھے اس حوالے سے بعد میں شرمندگی اٹھانی پڑی تھی، اور ظاہر ہوچکا تھا کہ جو کچھ میں نے آپ پر خیال باندھا، وہ ممکن ہے کہ خیال ہی تھا، اور صرف یہی نہیں بلکہ سارے کے سارے خیالات میری کور بینی، تہی دامنی، لاعلمی اور سوئے فہمی کی عین دلیل تھے، نتیجہ یہی نکلا کہ ممکن ہے کہ آپ وہی ہیں جن کو میں نے پہلے دن سے ایک انسان دوست، انسانیت کے خیر خواہ، بے لوث خدمت گزار اور دنیادار ہونے کے بجائے دین دار پایا تھا، اس کے بعد مولانا کے اخلاق اور نیک برتاؤ نے قلب پر جو اثر کیا وہ آئے دن تازہ اور خوش گوار ہوتا رہا تھا، جس کے اثرات الحمدللہ اب بھی باقی ہیں، خدا کرے کہ تا دمِ آخر

ہمارے ان خیالات کو باقی رکھے، آمین یارب العالمین۔

دراصل یہ ساری باتیں جو میرے گونگے اور ناتواں قلم سے نکل رہی ہیں، ان کی صحت وسقم کے حوالے سے ناظرین کرام ہی پرکھا اور فیصلہ کریں گے، تاہم اس ذیل میں یہ دعوی بھی کرتا چلوں کہ بعض نام نہاد علمی اور فکری انسان علمی اور فکری دہشت گرد ہوا کرتا اور خواہ مخواہ اس کی بات لوگوں سے منوانے کی کوشش کرتا ہے، اس حوالے سے مولانا محترم بڑے محتاط اور سنجیدے نکلے ہیں، علاوہ ازیں خالص دینی علوم، ثقافتی وفکری تصور، مذہبی واسلامی بصیرت، باریک بینی وظرف نگاہی کا جہاں تک تعلق ہے، ان میں آپ اس دور کے بہتوں لوگوں سے بہت ہی الگ اور آگے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالی اپنی خاص عنایات سے آپ کی زندگی میں برکت دیں، اور آپ کے علم وآگہی میں مزید اضافہ فرمائیں۔

ظاہر ہے کہ معاصرت ایک بڑی اور خطیر بیماری ہے، جو اکثر علم وہنر کے مدعیوں اور بڑے نما لوگوں میں پائی جاتی ہے، ہم آئے دن دیکھتے ہی رہتے ہیں کہ کوئی کسی پر تنقید کر رہا ہے، کوئی کسی کے علم وفن کے طول وعرض کی پیمائش میں مشغول ہے، کوئی کسی کے حوالہ جات کی غلطیوں کی نشان دہی کر رہا ہے، اور کوئی کسی کی زبان اور اندازِ بیان پر حملوں میں مصروف عمل ہے۔ تو ماضی میں مولانا حسین احمد صاحب کا دامن بھی اسی نوعیت کے مشاغل سے پاک نہیں تھا، ہاں آپ بالعموم کسی کو سمجھانے اور توجہ دلانے کے انداز واسلوب میں بات تو کرتے تھے، لیکن بسا اوقات کسی کو طنز وتحقیر اور نقد وجرح کا نشانہ بنانے میں بھی نہیں تھکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آج کل خوشی کی بات ہے کہ اللہ تعالی کے فضل وکرم سے آپ اس قسم کی چیزوں سے کافی حد تک بری ہوچکے ہیں، اہل علم وفضل کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور ہر فن کے علماء کو ان کا صحیح وبرمحل مقام دیتے ہیں، آپ کا ذہن ماشاءاللہ حسد ورقابت سے خالی ہوچکا ہے، آپ کی زبان بدگوئی سے پاک ہوچکی ہے، آپ سب کے خیر خواہ اور سب کے ہم درد بن چکے ہیں، کسی کے ساتھ آپ کی عداوت نہیں رہی، آپ لوگوں کی غلطیوں کو مزید درمزید اچھالنے کے بجائے نظر انداز کرنے کے عادی ہوچکے ہیں، دعا ہے کہ یہ سلسلہ دراز نہیں بلکہ ہمیشہ بحال رہے:

خدا کرے کہ یہی سلسلہ دراز رہے۔

ادھر مولانا کو جاننے والے بہت کم مدعیان اس بات سے واقف ہیں کہ کثیر الاطلاع اور کثیر

المعلومات کے ساتھ آپ کی ذات عالی صفات میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آپ کے نازک مزاج میں اچھی خاصی ندرت وجدت اور بظاہر بے پایاں غرور وعلمی لن ترانیوں کے ہوتے ہوئے بھی آپ کے دروں خانہ میں (میرے علم وآگہی کے مطابق) فخر وتعلی اور غرور وپندار کے بجائے حد درجہ کا تواضع، انکسار اور شکستگی پائی جاتی ہے، شاید آپ کے دیگر سرمایۂ حیات میں یہ بھی ایک ہو کہ جس نے آپ کو عام مولوی سے مولانا بنانے کا کام کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ مولانا حسین احمد صاحب طلبائے علوم دینیہ کا خاص خیال رکھتے ہیں، انہیں مدد کر کے، انہیں کسی بھی درجہ کے فائدے پہنچا کر نہایت خوش ہوتے ہیں، آپ کسی پر احسان کر کے اسے جتلانے اور کسی کے ساتھ نیکی کر کے اس کا بدلہ لینے کے سرے سے عادی نہیں ہیں، آپ کے اس نقطۂ نظر کو جہاں تک لوگ کہتے ہیں کہ نیکی کرو اور بھول جاؤ ہے، اس حوالے سے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ حتی الامکان کسی کو اس بات کا پتہ بھی ہونے نہیں دیتے۔

کہتے ہیں کہ شاگرد استاد کی معنوی اولاد ہوتا ہے، واقعات اور حقائق کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جائے تو شاگرد کے نزدیک استاد کا درجہ ماں باپ کے درجہ سے کسی بھی معنی میں کم نہیں ہوتا، وہ اس لئے بھی ہے کہ ماں باپ بچے کو آسمان سے زمین پر لانے کا باعث بنتے ہیں، جب کہ استاد اسے زمین سے آسمان تک پہنچانے کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے، یعنی استاد شاگرد کو پستی سے بلندی تک پہنچاتا ہے، اور ہر پہلو سے اس کی تربیت کرتا ہے، علمی بھی، ذہنی بھی، فکری بھی اور نظری بھی۔ یوں اس فقیر کے لئے مولانا محترم میرے اپنے ماں باپ سے کسی بھی طرح کم نہیں تھے، زندگی میں آپ سے جتنا بھی ملا، ڈنکے کی چوٹ پر کہوں تو اس علاقے کے دیگروں سے اتنا نہیں ملا، آپ کی تعلیم وتربیت کے انداز ہی الگ اور بڑی حد تک جداگانہ ہے، سچ کہوں تو آپ سے بہت کم شاگرد مستفید ہو سکتے ہیں، آپ کے مطابق دراصل آپ سے مستفید ہونے کے لئے وہ ظرف چاہئے، جس کا تقاضا آپ کرتے ہیں۔

مولانا محترم میرا ایک صرف خیر خواہ استاد نہیں بلکہ ایک روشن ضمیر محسن اور مربی بھی ہیں، ابھی میں باضابطہ دینی تعلیم کے لئے جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخل ہوا ہی تھا کہ بعض اساتذۂ کرام (جن کی اکثریت خود مولانا کے اساتذہ بھی تھی) اور بطور خاص آپ کے والد گرامی قدر شیخ الحدیث حضرت مولانا

مفتی ابوالفضل صاحب کی زبانی آپ کے متعلق اچھی خاصی باتیں کان پڑ چکی تھیں، جن سے اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ اپنی طالب علمی کے زمانے میں ایک ذہین وفطین طالب علم کی حیثیت سے نہ صرف اساتذۂ کرام بلکہ عام لوگوں میں بھی مشہور ہو چکے تھے۔ سن ۱۹۸۴ء کے ابتدائی مہینوں میں آپ سے میری باضابطہ پہلی ملاقات کی شکل میں ایک طرف میری دیرینہ تمنا پوری ہوئی تو دوسری طرف ان مذکورہ باتوں کا بھی تحقق ہوا تھا، جن کی قدرے تفصیلات انشاء اللہ اگلی سطور میں آنے والی ہیں، آپ سے یہی ملاقات میری آنے والی خوش گوار زندگی کے لئے بعض اعتبار سے خاصی بار آور اور باثمر ثابت ہوئی ہے، اس حوالے سے زیادہ کچھ لکھوں تو یہ آپ کے تذکرے کے بجائے راقم گنہگار کے تذکرے ہونے کا اندیشہ ہے، ان تمام میری اپنی ذاتیات سے قطع نظر ایک بات کا برملا اظہار کر دیتا ہوں کہ اگر آپ سے میری مذکورہ ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو (خاکم بدہن) آج یہ گنہگار جتنا بھی کچھ ہے شاید ہی اتنا ممکن ہوتا۔

زندگی میں مولانا سے مثبت ومنفی بہت ہی کچھ سیکھا اور جانا، اس ضمن میں سب سے بڑی بات یہی ہے کہ بعض وہ چیزیں جو آپ سے سیکھیں اور اس ناسمت شناس مسافر کو آپ سے ملیں، اگر یہ لکھا جائے کہ وہ آپ کے بجائے کسی سے نہیں ملیں شاید ہی دعوی غلط ہوگا۔

بہر حال مولانا کا تذکرہ اور اس کے ذیل میں دیگر بہتوں کے احوال اگلی سطور میں ناظرین قارئین کرام کو ملیں گے، ظاہر ہے کہ یہ ایک خاکسار لکھاری کی قلمی وفکری برجستگی اور بے ساختگی کے علاوہ بڑی حد تک اس کی جرأت رندانہ اور جسارت کا نتیجہ ہے، تو اہل قلب ونظر سے امید نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ فروگزاشتوں اور خطاؤں کی اطلاع دے کر مشکور ہوں گے۔ **وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔**

خاکسار:

محمد طاہر جمال ندوی

چاٹگام، بنگلا دیش۔

۲۲ / اپریل /۲۰۲۱ء

پہلا باب

خاندانی پس منظر

سرزمین ارکان درحقیقت علماء وصلحاء، دعاۃ ومرشدین اور اولیاء اللہ کی سرزمین ہے، تاریخ کی ورق گردانی سے پتہ چلا ہے کہ یہاں گزری صدی میں ایسے ایسے علماء پائے جاتے تھے، جو ارکان میں آج جیسے حالات نہ ہوئے ہوتے تو ان کا شمار دنیا کے ان بلند پایہ علماء میں ہوتا، جن کی فضیلت کا ڈنکا آج دنیا بھر میں بج رہا ہے، ارکان کے ان بڑے بڑے علمائے کرام میں ہم نے اپنی آنکھوں سے علامہ سلطان احمد صاحب فوئمالویؒ، علامہ سید الامین صاحب منگنماویؒ، حضرت شاہ مظفر احمد صاحب منگیزویؒ (خلیفہ ومجازِ بیعت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ) مولانا عبدالسبحان صاحب گراخالوی معروف بہ محدث صاحب، مولانا مفتی سلطان احمد صاحب ریدویؒ وغیرہ کو دیکھا ہے۔

دور آخر میں ارکان کے جن بڑے بڑے علمائے کرام کو دیکھا تھا، ان میں سے ایک حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب بھی تھے، آپ اپنے وقت کے ایک عظیم المرتبت عالم دین، مفسر قرآن اور جلیل القدر محدث ونکتہ سنج اور معاملہ فہم فقیہ ہونے کے ساتھ حضرت مولانا حسین احمد صاحب (جن کا تذکرہ یہاں ہمارا مقصد ہے) کے والدِ گرامی ہیں، جنہوں نے کوئی نصف صدی کی مدت تک سرزمین ارکان میں علم وعلماء کی بجا طور پر خدمات کیں، جن کی خدمات کا تذکرہ خود ان کی زندگی میں بھی ہوتا تھا، پھر آج ان کے انتقال کے بعد بھی ہو رہا ہے۔ اور خدا کرے تو تا قیامت ہوتا رہے گا۔ حقیقت یہی ہے کہ آپ ایک ایسے عالم دین تھے، جن پر نہ صرف اپنے علاقے کے لوگ بلکہ ارکان کے دور دراز کے باشندے بھی رشک وفخر کیا کرتے تھے۔

مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے خاندان کو ہمارے علاقے میں بعض لوگوں کے مطابق ایک معزز خاندان مانا جاتا ہے، گوکہ دولت وثروت کے لحاظ سے اس خاندان کا شمار اس علاقے کے بڑے زمین دار خاندانوں میں نہیں ہے، لیکن یہ خاندان بعض شرفاء، نجباء اور علمائے کرام کا خاندان ہے، دور آخر میں اس خاندان میں چند ایسے علمائے دین اور بزرگان شرع متین گزرے، جن کا شمار سرزمین ارکان میں اپنے وقت کے بڑے اور چیدہ علمائے کرام میں ہوتا تھا، ان میں سے چند علمائے کرام کا تذکرہ کرنا اگرچہ مختصرا ہی سہی زیر نظر کاوش میں بھی ضروری سمجھا گیا ہے، جن میں سے ایک حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے والد گرامی ہیں، باقی دو شخصیات میں سے ایک حضرت مولانا عبدالہادی معروف بہ قاضی مولوی صاحب لمبابیلی، جب کہ دوسری شخصیت حضرت مولانا سعید اللہ صاحب لمبابیلی ہیں۔

یہاں ایک بات عرض کردینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ غالبا حضرت مولانا قاضی عبدالہادی صاحب کی نسبت سے اس خاندان کا تعلق اس علاقے کے اور ایک نامور خاندان سے تھا، جس میں بھی وقت وقت پر بڑے بڑے علماء وصلحاء، دعاۃ ودرویش، قومی رہنما ومحرکینِ تحریکِ آزادی اور مجاہدین اسلام پیدا ہوئے تھے، جن میں شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ عبدالباری صاحب کجافویؒ معروف بہ "بڑے مولوی صاحب" (۱) اور شیخ طریقت حضرت مولانا حافظ مخلص الرحمن صاحبؒ (۲) اور بانی تحریک آزادی حضرت مولانا جعفر حسین صاحب قوال معروف بہ "مجاہد اعظم" کے علاوہ مجدد تحریک آزادی حضرت محمد جعفر حبیبؒ قابل ذکر بلکہ ناقابل فراموش شخصیات اور بزرگان قوم وملت ہیں۔

(۱) حضرت مولانا عبدالباری معروف بہ بڑے مولوی صاحب ایک زندہ دل اور صاحبِ کشف وکرامات بزرگ ترین عالم دین تھے، طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے مجاز بیعت تھے، آپ کی اولاد واخفاد میں بڑے بڑے علمائے کرام اور دعاۃ ومرشدین کے علاوہ قوم وملت کے بڑے بڑے خدام اور رہنما پیدا ہوئے، جن میں آپ کے نواسے حضرت قائد و بانی تحریک آزادی مولانا محمد جعفر حسین قوال شہید بہت ہی نامور ہیں، علاوہ ان کے حضرت قائد ومجدد تحریک آزادی محمد جعفر حبیبؒ بھی رشتے میں آپ کے بھتیجہ تھے، آپ کے مزار پاک کجافہ بوسیدنگ میں زیارت گہ خاص وعام ہے۔

(۱) دور آخر میں اس خاندان عز وشرف میں حضرت مولانا حافظ مخلص الرحمن صاحب کجافویؒ بھی ایک صاحبِ کشف و کرامات بزرگ گزرے ہیں، جن کا آستانہ بھی کجافہ بوسیدنگ میں زیارت گہ خاص وعام ہے۔

حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحبؒ

حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب بن عبدالجلیل بن عبدالمجید کی پیدائش قصبۂ علی چنگ، بوسیدنگ کی بستی لمبابیل میں تقریبا ۱۹۰۰ء میں ہوئی، شنید ہے کہ آپ کے والد ایک کاشتکار تھے، لیکن نہایت سادہ سیدھا اور عالم دوست بزرگ تھے، اور والدہ بھی نہایت نیک سیرت اور پاکیزہ خاتون تھیں، اللہ تعالی ان بزرگوں کو جنت الخلد میں جگہ عطا فرمائے۔

مفتی ابوالفضل صاحب نے اپنی تعلیمی سفر کا آغاز اپنی بستی کے مکتب سے کیا، دینیات کی مبادیات کے علاوہ ناظرۂ قرآن کریم اپنی بستی سے مکمل کر کے سرزمین ارکان میں اس زمانے کی شہرۂ آفاق دینی درس گاہ (اشرف المدارس راجاربیل، علاقۂ راسیدنگ) میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے وقت کے بڑے بڑے ارباب فضل وکمال علماء ومشائخ اور حاملانِ علوم وفنون سے اپنی علمی پیاس بجھائی، یہاں آپ نے مسلسل چند سال تعلیم حاصل کی، اور ایک روایت کے مطابق درسِ نظامیہ کی جماعتِ دوم تک کی تعلیم بڑی امتیازی شان سے پائی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان کا سفر کیا، اور سیدھے جا کر "مدرسہ قاسم العلوم شاہی مرادآباد" میں داخل ہوئے، جہاں سے آپ نے درس نظامیہ کی بقیہ ساری متداول کتابوں کی پڑھائی ختم کر کے سند فراغت حاصل کی، کہتے ہیں کہ درس نظامیہ سے فراغت کے بعد آپ نے دیگر فنون کی طرف توجہ دی، اور فن معقولات کی تمام متداول کتابوں پر عبور حاصل کیا، اس کے بعد وطن کا رخ فرمایا، ظاہر ہے کہ اسی وقت برصغیر میں برطانوی راج تھا، تو آپ کسی قدر امن وسکون کے ساتھ اپنے وطن پہنچ گئے تھے۔

شنید ہے کہ مدرسہ قاسم العلوم شاہی مرادآباد میں حضرت مفتی صاحب نے بطور خاص حضرت مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا، بات یقینی تو نہیں لیکن کہتے ہیں کہ دورانِ تعلیم آپ رہ کر دارالعلوم دیوبند بھی جایا کرتے تھے، جہاں بطور خاص حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں بیٹھ کر اپنی علمی پیاس بجھایا کرتے تھے، غرض سرزمین ارکان کے یہ قابلِ رشک طالب علم گلشنِ مرادآباد میں شبانہ روز محنت، جدوجہد اور جفاکشی پھر اللہ تعالی کے فضل وکرم سے اپنے سینے میں علوم اسلامیہ کا ایک سمندر سمیٹے اپنے وطن ارکان آ گیا۔

مفتی صاحب ابھی اپنے گاؤں میں پہنچے تو حضرت مولانا مفتی محمد حسین صاحب تنگ بازاری نے آپ کو ان کی بناء کردہ دینی درس گاہ مدرسہ تنگ بازار میں خدمت کی دعوت دی، تو آپ نے بڑی خوشی سے لبیک کہا، یوں حضرت نے یہاں سالوں تک درس دیا، اس کے بعد مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ کے اصرار پر آپ تمنگ چنگ تشریف لائے، جہاں آپ نے ایک روایت کے مطابق ۱۹۵۲ء تک تعلیم دی، اور ہزاروں تشنگانِ علوم دینیہ کی سیرابی کرائی، یہاں آپ کی خدمات کے حوالے سے اس علاقے کے بہت سارے لوگوں سے بہت ساری باتیں سنی گئیں۔

بعدازاں ۱۹۵۳ء میں آپ نے سرزمین ارکان کے ایک محسن عالم دین حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب پکتلوی اور حضرت مولانا مشتاق احمد ندوی سے مل کر "مدرسہ عالیہ بوسیدنگ" کی بنیاد ڈالی، اور اس نئی درس گاہ کی خدمت میں مگن ہو گئے، اور درمیانی چند سالوں کو چھوڑ کر آپ اپنی زندگی کے آخری دم تک اسی درس گاہ کے لئے ہو گئے، یہاں آپ نے درسیات کی ابتدائی سے لے کر منتہی کتابوں تک ساری کتابیں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پڑھائیں، اور ایک طویل مدت تک شیخ الحدیث کے منصبِ جلیلہ پر فائز بھی رہے، یوں اس منصب پر رہتے ہوئے جنوری/ ۱۹۸۴ء میں داعئ اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب ایک ذہین وفطین ایک ذی لیاقت واستعداد طالب علم تھے، اور جید الفکر وجلیل القدر عالم دین بھی، دیگر متداول کتابوں کے علاوہ آپ کے درس بخاری شریف کی شہرت ارکان کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھی، آپ سے پڑھنے کے شوق لے کر تشنگانِ علوم نبوت وطن کے کونے کونے سے آپ کے گرد جمع ہوتے اور اپنی اپنی پیاس بجھا کر واپس چلے جاتے تھے۔

اسی طرح آپ فقیہ اور بڑے معاملہ فہم قاضی اور گوہر شناس معلم ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب و سنت کے عملی ذوق کے حامل عالم دین تھے، زہد وورع اور فہم وفراست کے حوالے سے یکتائے روزگار تھے، آپ کی زندگی سادگی میں پرکاری تھی، اور شخصیت میں دل کشی، جاذبیت اور دلاویزی بھی، ہمارے زمانے میں آپ جہاں بھی بیٹھتے تو میر مجلس آپ ہی ہوا کرتے تھے، یوں حضرت مفتی صاحب اپنے زمانے میں ہر کسی علمی اور فکری مجالس کے گوہر شبِ چراغ تھے، جس کی روشنی اور ضیا پاشی سے اس

زمانے میں ہمارے علمی اور فکری ایوان منور اور تاباں تھے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحب تحقیق مفسر قرآن اور نکتہ رس محدث، اور نکتہ سنج فقیہ واصولی انسان تھے، علمی اعتبار سے آپ کی ذاتِ گرامی میں خاص جامعیت پائی جاتی تھی، دیگر علوم وفنونِ دینیہ کے تہ بتہ احادیث نبویہ صلوات اللہ علیہ وسلامہ پر آپ کی نظر بڑی گہری اور عمیق تھی، جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ کو بارگاہِ خداوندی سے جس طرح صالحیتِ بے بہا سے نوازا گیا، اسی طرح صلاحیتِ بے پایاں کی دولت سے بھی مالا مال کیا گیا تھا، **ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**۔

گزری صدی اور آج کے مسلمانوں کے حالاتِ دگرگوں سے کون واقف نہیں؟ ارکان کے مسلمانوں پر عموماً اور وہاں کے علمائے دین پر خصوصاً یہاں جو مظالم ڈھائے گئے، اور اب بھی جارہے ہیں، ان کے اجمال وتفصیل سے ساری دنیا واقف ہے، جن کی وجہ سے اور تو اور اس سرزمین کے بڑے بڑے جید اور نامور علمائے کرام نے اسے ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا، اور دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اپنی اپنی مستعار زندگی کے بقیہ حصے گزار کر اس جہانِ فانی سے رخصت لی، جن میں حضرت مفتی صاحب کے معاصر حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب پکتلوی، حضرت مولانا محمد حسین صاحب تنگ بازاری، حضرت مولانا محمد صالح صاحب زوفرانگی/ یونگ چنگی، حضرت مولانا مشتاق احمد ندوی سرفہرست بزرگانِ دین ہیں، لیکن حضرت مفتی صاحب نے کبھی بھی اور کسی بھی حالت میں اپنے مادری وطن کو چھوڑنے اور بعض حضرات کے الفاظ میں ''ہجرت کرنے'' کا نہیں سوچا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ مفتی صاحب مسلمانانِ ارکان پر بیتنے والے ایسے حالات میں بطور خاص علمائے کرام کے اس بے دردی سے وطن چھوڑنے کو ایک طرح کی بزدلی اور فرض ناشناسی سمجھتے تھے، اس حوالے سے آپ کی رائے تھی کہ اگر علمائے کرام اپنے بھائی بند اور وطن عزیز کے بے یار ومددگار مسلم عوام کو چھوڑ چھاڑ کر اپنے بچاؤ کے لئے کہیں چلے جائیں گے تو یہاں کے مسلم عوام کی رہی سہی ہمت بھی جاتی رہے گی، اور یہ سراسر بے سہارے ہوئیں گے، جس کے نتیجے میں وطن عزیز کلی طور پر خالی ہوجائے گا، حضرت کی رائے میں یہاں کے علمائے کرام کو وطن کے مسلم عوام کی ہر حالت میں رہنمائی ناگزیر تھی، ویسے آپ نے اپنے وطن کو نہیں چھوڑا، اور آخر کار وطن ہی کی زمین کو اپنے سینے سے لگالیا۔

بعض حضرات کے نزدیک مفتی ابوالفضل صاحبؒ اپنے زمانے میں سرزمین ارکان کی معروف دینی وعلمی شخصیتوں میں درجۂ اول میں شمار تھے، آپ کے اعمال وکردار یہاں کے مسلم عوام کے لئے مثالی درجہ رکھتے تھے، اور آپ کی شخصیت ایک حیثیت سے مرجع کا درجہ رکھتی تھی، ویسے حضرت کی سلامتِ طبع اور جودتِ فکر وعمل کا نتیجہ تھا کہ آپ کے تلامذہ کے علاوہ آپ کے احباب اور خوشہ چینوں میں بھی آپ کی شان نمایاں طور پر نظر آتی تھی، اور تو اور علاقۂ بوسیدنگ اور بطور خاص شہر کے چیدہ حضرات آپ کو ایک مثالی انسان مان کر آپ کی نہایت عزت اور توقیر کیا کرتے تھے، آپ کے اعمال اور کردار کی خوشہ چینی کو قابل فخر خیال کرتے تھے، یہ چیزیں جہاں ایک طرف حضرت کی عظمت ورفعتِ شان کی دلیل تھیں، وہاں عوام میں آپ کی مقبولیت کا بین ثبوت بھی۔

حضرت مفتی صاحب کو میں نے عرصۂ دراز تک بہت ہی قریب سے دیکھا، آپ کی علمی وفکری صحبت سے اپنی بساط بھر استفادہ کرنے کی توفیق بھی ہوئی، جہاں تک دیکھا کہ آپ کی جلوتیں قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گزریں اور شبانہ خلوتیں اپنے خالق کے سامنے سربسجود عبادت گزاریوں میں بسر ہوئی تھیں، آپ ایک دلِ زندہ دار عالم دین ہونے کے علی الرغم بڑے فقیہ النفس انسان تھے، میرے نزدیک آپ کی زندگی پوری کی پوری ایک مثالی زندگی تھی، اور ہمارے بہت سارے اساتذہ حضرت کے تلامذہ میں سے تھے، جن میں سے بعض حضرات کی زندگیوں میں جہاں تک محسوس کیا گیا کہ حضرت مفتی صاحب کا رنگ بھرا دیکھا گیا تھا۔

میرے علمی استفادہ کے حوالے سے ایک ضروری بات بتاتا چلوں کہ اگرچہ میں نے حضرت مفتی صاحب کو جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ عرصۂ دراز تک بہت ہی قریب سے دیکھا تھا، لیکن علمی استفادہ اتنا نہیں ہوسکا، جتنا ہونا چاہئے تھا، وجہ یہی تھی کہ میں جس وقت ہفتم وششم کا طالب علم تھا، تب حضرت درجۂ علیاء کے استاد بلکہ شیخ الحدیث تھے، بطور خاص بخاری شریف کا حصۂ اول اور ترمذی شریف کامل جیسی کتابیں آپ کے حصے میں تھیں، لیکن فرصت ملتے ہی میں حضرت کے درس بخاری میں کہیں چپکے سے بیٹھ جایا کرتا تھا، اور آپ نے اپنے عزیز خادم کو کبھی اس طرح کے بیٹھنے سے منع بھی نہیں فرمایا، علاوہ ازیں بعض خاص وعام علمی مجالس میں آپ کے نفع بخش ارشادات، فرمودات

اور علمی اور فکری گفتگو سننے اور آپ سے اپنی بساط بھر اخذ نتائج کرنے کی توفیق ضرور ہوئی تھی۔

راقم سطور کے علم و معلومات کے مطابق حضرت مفتی صاحب مشرقی طرز کے عالموں، خدا رسیدہ درویشوں کا ایک اچھا نمونہ تھے، خوب صورت عمامہ، نفیس سے نفیس ترین جبہ، اور سفید چادر میں ملبوس ہاتھ میں لاٹھی تھامے عالمانہ، مدبرانہ اور درویشانہ چال چلتے ہوئے اب بھی آپ میری نظروں کے سامنے ہیں، اللہ تعالی آپ کی قبر پر باران رحمت برسائیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت کی تعلیم و تربیت مشرقی درس گاہوں میں مشرقی انداز میں ہوئی، آپ نے علوم دینیہ و اسلامیہ کے مطالعے مشرق کی مثالی درس گاہوں میں کئے، مشرق کے تعلیمی، اخلاقی اور روحانی گنجینوں سے خوب خوب مستفید تھے، یوں آپ کے تمام اعمال و کردار میں مشرق کے صالح بزرگوں اور شریفوں کی نورانی جھلکیاں اور رعنائیاں نمایاں طور پر نظر آتی تھیں۔

میرا حضرت مفتی صاحب سے ایک طویل مدت تک خاص لگاؤ تھا، حضرت کو جبھی کسی لازمی چیز کی ضرورت پیش آتی تو اسے پورے کرنے کا مجھے حکم ہوا کرتا تھا، جہاں تک دیکھا اور اندازہ کیا کہ حضرت اپنے تلامذہ اور خوشہ چینوں کو عموما اور راقم کو خصوصا بڑی شفقت بھری نظروں سے دیکھتے تھے، اور ہمیشہ اس ناچیز کو علم و عمل کی توفیق ہونے کی دعائیں دیا کرتے تھے۔ آہ! آج آپ اور آپ جیسوں کی کفش برداری کے تذکار کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں بچی ہے، آہ! آپ ہمیں اس غربت و بے کسی کے عالم میں چھوڑے خالق حقیقی سے جا ملے، اللہ تعالی آپ کو غریق رحمت کرے اور آپ کے درجات کو بلند فرمائے۔

حضرت مفتی صاحب نے تین شادیاں کیں، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ زرینہ خاتون بانگلونوی، بوسیدنگی مرحومہ: والدۂ مسٹر عبد المتین مرحوم وغیرہ۔

۲۔ کلثوم خاتون رنگیادنگی مرحومہ: والدۂ مولانا حسین احمد صاحب وغیرہ۔

۳۔ مصطفی خاتون تمنگ چونگی: والدۂ محمودہ خاتون مرحومہ۔

اب ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی چھوڑی ہوئی یادگار اولاد کا مختصرا ہی سہی تبصرہ یہاں کر دیا جائے، تو حاضر خدمت ہے۔

حضرت کی پہلی اہلیہ کے بطن کی اولاد:

(۱) جناب عبد المتین ابو الفضل صاحب مرحوم:

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول میں پائی، اس کے بعد بوسیدنگ ہائی اسکول میں داخلہ لیا، جہاں سے آپ نے مٹرک تک تعلیم حاصل کی، مولانا حسین احمد کے مطابق وہاں آپ نے عمل و کردار کے حوالے سے بڑا نام پایا، اس حوالے سے بہت ساری باتیں سنی گئیں۔

نہ جانے بات کہاں تک صحیح ہے کہ عبد المتین صاحب کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب کا دعوی ہے کہ آپ ایک ذی علم و شعور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ سرزمین ارکان کے حوالے سے زیر زمین کام کرنے والے انقلابیوں سے خاص لگاؤ رکھتے تھے، مولانا صاحب مزید یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت محمد جعفر حبیب مرحوم صدر روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کے ساتھ آپ کا ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا، علاوہ ان کے مرحوم شبیر حسین (BA) فوئمالوی سابق مؤسس صدر ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (AIRF) نے بھی آپ کو اپنا ایک قریبی ساتھی اور بڑے مخلص دوست مانتے تھے، ظاہر ہے کہ مذکورہ دونوں لیڈروں کا شمار ہمارے قومی لیڈروں میں ہے، مولانا کے دعوی کے مطابق ان دونوں کا آپ پر اعتماد اس بات کا ثبوت ہے کہ قومی امور کی انجام دہی کے حوالے سے آپ کا مقام بہت ہی بلند تھا۔

(۲) جناب عبد الحکیم ابو الفضل صاحب:

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول میں پائی، برمیز چوتھی جماعت پڑھ کر مدرسہ میں داخلہ لیا، اور جماعت ششم تک دینی تعلیم حاصل کی، آج کل سعودی عرب میں مع اہل خانہ مقیم ہیں، اللہ تعالی ان کو سلامت رکھے۔

(۳) جناب محمود الحسن ابو الفضل صاحب:

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی لمبابیل کے مکتب اور سرکاری اسکول میں پا کر شہر بوسیدنگ کے مڈل اسکول میں داخلہ لیا، جہاں سے آٹھویں جماعت کی تعلیم پائی، اس کے بعد پاکستان چلے گئے، گزری صدی کی اسی کی دہائی میں آپ کراچی سے وطن کی زیارت کو آئے تھے، یہاں آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی، جہاں تک اندازہ کیا کہ آپ کراچی کے ماحول سے کافی متاثر ہو چکے تھے،

قومی غیرت کے ساتھ قدرے علمی مذاق بھی رکھتے تھے، کراچی میں تا حال مع اہل خانہ مقیم ہیں، اللہ تعالی حیات دراز کرے۔

(۴) مسعودہ خاتون بنت ابوالفضل:

شادی وخانہ آبادی کے بعد آپ مع اہل خانہ برما کے دارالحکومت رنگون پہنچیں، وہاں تا دم تحریر مع اہل وعیال سلامت سے ہیں، اگر چہ وہاں کے حالات بڑے تشویشناک ہیں، لیکن اللہ تعالی کے فضل و کرم سے آپ کسی قدر خوش وخرم ہیں، اللہ تعالی ان کو سلامت سے لکھے۔

حضرت مفتی صاحب کی دوسری اہلیہ محترمہ کلثوم خاتون کے بطن کی اولاد:

(۱) جناب عبدالحق ابوالفضل صاحب مرحوم:

آپ نے تعلیم آپنی آبائی بستی کے علاوہ بوسیدنگ ہائی اسکول میں پائی، اس کے بعد گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گئے، یوں تو ماشاء اللہ بڑے ہشیار دانشور ہیں، لیکن ان کا وضع قطع ہمیشہ عالموں جیسا ہوتا ہے، گھر بار کے کام کاج میں مشغول تو رہتے ہیں، لیکن آپ کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا اور انداز واطوار بزرگوں جیسا ہے، غرض آپ کا وضع قطع عالمانہ اور داعیانہ ہے، آپ کو جہاں تک دیکھا کہ آپ جماعتِ دعوت وتبلیغ سے لو لگائے ہوئے ہیں، جسمانی اعتبار سے مجھے لگتا تھا کہ آپ اپنے چھوٹے بھائی مولانا حسین احمد صاحب کی تقریبا ہم شکل ہیں، ویسے بھی آپ کو بہت ہی اچھا لگتا تھا، آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت مولانا قاضی عبد الہادیؒ صاحب لمبابیلی کی پوتی ہیں، اطلاع ہے کہ وہ نہایت پاک باز اور خدا ترس خاتون اسلام ہیں۔

(۲) جناب الحاج عبدالغفار ابوالفضل صاحب مرحوم:

آپ نے کچھ دینی وعصری تعلیم اپنی آبائی بستی میں حاصل کی۔ ۱۹۹۲ء کے دوران آں جناب کو میں نے چاٹگام میں عرصۂ دراز تک دیکھا، جہاں تک اندازہ کیا کہ آپ نہایت پاک باز، مخلص اور خدا ترس انسان تھے، کم گو مگر حق گو تھے، آں جناب کے حوالے سے ایک بات یاد آئی کہ اسی زمانے کی بات تھی کہ کبھی کبھار بعض امور کے متعلق میری اور محترم مولانا حسین احمد صاحب کے مابین کچھ کشمکش سی ہوتی تو راقم بسا اوقات آں جناب کا سہارا لیا کرتا تھا، آپ بھی کیا ہی خوب کردار کے انسان تھے کہ ہر چند

دیکھا گیا تھا کہ آپ ہم دونوں کے مابین صلح کرا دینے کی حد درجہ کوششیں کیا کرتے تھے، اس دوران لگتا تھا کہ آپ کا ذہنی اور دلی رجحان میرے حق میں تھا، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر دے، آپ نے عرصۂ دراز تک زندگی سعودی عرب کی پاک سرزمین مدینہ منورہ میں گزاری، گئی صدی کی آخری دہائی میں مع خانہ چاٹگام میں مقیم تھے، پھر اس کے بعد دوبارہ سعودی عرب چلے گئے، جہاں آپ کا انتقال ہو گیا، اور مدینہ کی مقدس سرزمین میں مدفون ہیں، اللہ تعالی آپ کی مغفرت فرمائے۔

(۳) مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب:

میرے نزدیک آپ ارکان کے قابل فخر سپوت ہیں، دینی، علمی، فکری اور منہجی اعتبار سے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قحط الرجال کے اس عالم میں آپ ولی اللہی مکتبِ فکر کا ایک روشن ومنور، تابناک اور درخشاں چراغ ہیں، بعض حیثیت سے مولانا محترم زمانے کے ان نایاب اور انمول نوادر میں سے ایک ہیں، جن کی قدر وقیمت کا اندازہ عوام تو کیا خواص الخواص بھی لگانے سے قاصر ہیں، میں یہ بات سر عام بانگ دہل کہنے پر تلا ہوا ہوں کہ ارکان کی اس نادرۂ روزگار شخصیت پر قلم اٹھانا اور اس فرض پر قلم اٹھا کر عہدہ برآ ہونا اور بجا طور پر ہو سکنا ایک کٹھن اور دشوار گزار کام ہے، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ لیاقت وصلاحیت، بلند نظری اور بلند حوصلگی، اولوالعزمی وفکری پرواز، وسیع الخیالی اور دقیق النظری جیسی صفات وکمالات سے متصف انسانوں پر قلم اٹھانے کے لئے ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی اور ان کی زندگی کی تمام جوانب اور پہلوؤں سے گہری واقفیت، بصیرت اور آگہی کی ضرورت ہے، جو مجھ میں نہیں ہے، لیکن اس قحط الرجال کے عالم میں ایسے قلم کار لائیں تو کہاں سے لائیں؟ یوں راقم سطور نے اپنی تہی دامنی اور کور بینی کے باوصف مولانا کے ایک عزیز اور کسی قدر قریبی خوشہ چین اور نالائق تلمیذ ہونے کے ناطے ایک سعادت کے بطور آپ کی زندگی کے بعض پہلوؤں اور جوانب پر مشتمل کچھ چیریں زیبِ قرطاس کرنے کی بساط بھر کوشش کی، خدا کرے تو اس ناچیز کی یہ کوشش بھی ایک ضخیم جلد کی شکل اختیار کرے گی، اور خدا کرے کہ ناچیز کی اس کوشش میں برگ وبار آئے، ساتھ ہی ساتھ مولانا کی زندگی میں برکت دے، اور آپ کا سایہ ہم جیسے مسکینوں پر تا دیر باقی رکھے۔

مولانا محترم کی اکثر اولاد واہل تا دم تحریر شہرِ چاٹگام میں کسی قدر خوش وخرم رہائش پذیر ہیں، سب

کے سب ماشاءاللہ زیورِ علم وآگہی سے آراستہ ہیں، لیکن آپ سرزمین مقدس مکہ مکرمہ میں مسافرت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، اللہ تعالی آپ کی تمام پریشانیوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی اولاد واہل کو خوش وخرم رکھے، اور اپنے فضل وکرم سے آپ کی اولادواخفاد کو ملی وقومی کاموں میں شریک ہونے کی سعادت بخشے، آمین۔

(۴) مولانا محمد جلیل ابوالفضل صاحب:

مولانا محمد جلیل صاحب اپنی آبائی بستی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول کے علاوہ اپنے والد بزرگوار سے پائی، کچھ بڑے ہوئے تو جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ (جہاں آپ کے والد صاحب شیخ الحدیث تھے) میں داخلہ لیا، یہاں سے درسیات کی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم پاکر اعلی دینی تعلیم کے لئے بنگلا دیش کا سفر کیا، اور جامعہ اسلامیہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ میں داخلہ لیا، یہاں جماعتِ اولی کے علاوہ دیگر فنونات کی تعلیم پاکر پاکستان پہنچے، اور جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد آپ وطن واپس آئے، اور تمنگ چنگ والی ایک نیک سیرت اور دین دار خاتون سے شادی کی، اس کے بعد آپ حجاز مقدس پہنچے، چند سال وہیں گزار کر پھر وطن آئے، اور کچھ دن کے بعد اپنے اہل خانہ سمیت ترک وطن کرکے چاٹگام میں رہائش پذیر ہوگئے تھے۔

مولانا محمد جلیل صاحب سے راقم کی طول طویل ملاقات رہی ہے، ۱۹۸۶ء کے دوران مولانا حسین احمد صاحب جس زمانے میں خطیبر ہاٹ، چاٹگام میں رہائش پذیر تھے، مولانا محمد جلیل صاحب بھی مع اہل خانہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتے تھے، دراں حالیکہ راقم دارالمعارف الاسلامیہ چاٹگام میں طالب علم تھا، اور میرا اس رہائش گاہ میں سدا آنا جانا رہتا تھا، وہاں مولانا محمد جلیل صاحب سے کبھی اکیلے میں اور کبھی کبھار مولانا حسین احمد صاحب کی شمولیت میں طول طویل گفتگو اور باتیں ہوتی تھیں، خاص طور پر علمی، فکری، ثقافتی اور روحانی مذاکرات ہوا کرتے تھے، اسی طرح رہ رہ کر حالات کی نزاکت کے پیش نظر سیاسی اور انقلابی امور میں بھی گفتگو چھڑ جاتی تھی، لیکن مولانا محمد جلیل صاحب انقلابی اور سیاسی گفتگو میں بہت کم دل چسپی لیتے تھے، تاہم فکری اور ثقافتی موضوعات میں خاص دل چسپی لیا کرتے تھے،

قومی اور ملکی حالات پر کافی فکرمند ہونے کے باوجود ان موضوعات پر گفتگو کرنے کا جہاں تک سوال ہے، آپ کا ان امور کی طرف ذہنی رجحان بہت کم دیکھا گیا تھا، خاص طور پر مولانا حسین احمد صاحب کی موجودگی میں آپ ان موضوعات میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔

مولانا محمد جلیل صاحب بڑے ذہین وفطین اور بڑے زیرک عالم دین ہیں، لیکن میرے ناقص خیال میں فراغتِ تعلیم کے بعد ان کو ایک عالم دین کی شایان شان مطالعہ کرنے کی نوبت بہت کم ملی، ورنہ آپ کی شخصیت اور کمالات میں چار چاند لگ گئے ہوتے۔

یوں تو میرے علم اور جانکاری کے مطابق مولانا حسین احمد صاحب کے تمام بھائیوں نے آپ کی بڑی بڑی خدمات کیں، لیکن ان میں بھی مولانا محمد جلیل صاحب کی مادی اور معنوی خدمات ناقابل فراموش ہیں، اللہ تعالی آپ کی عمر اور اولادواخفاد کے علاوہ تجارت میں مزید درمزید برکت دے، آمین۔

طالب علمی کے زمانے میں اور وہ بھی جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے دورانِ تعلیم مولانا محمد جلیل صاحب کو مولانا حسین احمد صاحب ایک جید طالب علم کی حیثیت سے نہیں دیکھتے تھے، مولانا حسین احمد صاحب کے بیان کے مطابق آپ ان کی معیار میں نہیں اترتے تھے، لیکن بعد میں مولانا حسین احمد کی رائے میں کافی تبدیلی آئی، اس حوالے سے ایک واقعہ خود مولانا حسین احمد صاحب کی زبانی سنئے کہ:

> ''جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں حضرت مولانا انورالعظیم صاحب میرے اور محمد جلیل کے استاد تھے، محمد جلیل کی لیاقت واستعداد کے متعلق میں مطمئن نہیں تھا، نہ جانے کیسے کہ مولانا انورالعظیم صاحب میرے اس خیال سے واقف ہوگئے تھے، ایک روز آپ نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ حسین احمد! تم محمد جلیل کی لیاقت واستعداد پر اپنی رائے میں نظرثانی کرلیا کرو، کیوں کہ فنونات پڑھنے کے بعد وہ کافی مستعد ہوچکا ہے، حضرت کی اس تصدیق کے بعد مجھے محمد جلیل پر اطمینان ہوا''۔

۱۹۸۶ء کی بات تھی کہ مولانا محمد جلیل صاحب چاٹگام میں تقریبا ایک سال گزار کر دوبارہ سعودی عرب چلے گئے، بعد میں اپنے اہل خانہ کو بھی وہیں منتقل کرلیا، آپ نے جدہ میں نجی تجارت شروع کی، اور اللہ تعالی نے آپ کی تجارت میں کافی برکت دی، تاحال کسی قدر خوش حال ہیں۔

(۵) <u>عبدالحلیم ابوالفضل مرحوم:</u>

مفتی صاحب کا یہ صاحب زادہ راقم کے قریبی دوستوں اور چاہنے والوں میں سے ایک ہے، ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول میں پاکر متوسطہ تک کی تعلیم بوسیدنگ میڈل اسکول سے حاصل کی، ذہین وفطین ہونے کے باوجود بعض وجوہات کی بنیاد پر آٹھویں کلاس سے آگے نہ بڑھ سکا، اسے کھیل کھود سے کافی دل چسپی تھی، فٹ بال کا کھلاڑی تھا، اندرون وطن کے علاوہ چاٹگام اور سعودی عرب کے اس کے سفر کے دوران راقم سے اس کی رسم وراہ تھی، بعد میں نہ جانے کیوں کہ اس راہ ورسم میں کافی سردمہری آگئی، اس نے سعودی عرب کے علاوہ ملائشیا کا بھی سفر کیا تھا، شنید ہے کہ چاٹگام کے قریبی علاقہ ''شانتر ہاٹ'' میں مع اہل وعیال مقیم تھے، سن ۲۰۲۲ء میں ان کا انتقال ہوا، دعا ہے کہ اللہ تعالی اسے غریق رحمت کرے۔

(۶) <u>ساجدہ بیگم بنت ابوالفضل:</u>

اپنی آبائی بستی میں پیدا ہوئی، نشوونما وہیں ہوا، اور دینیات کی تعلیم بستی کے مکتب کے علاوہ اپنے والدگرامی سے پائی، لائق ہوئی تو اس کی شادی مولانا نورمحمد صاحب خیرمورہ فاروی (برادر حضرت مولانا ولی احمد صاحب) سے ہوئی، آج کل مدینہ منورہ میں مع اہل خانہ مقیم ہے، مولانا نورمحمد صاحب بھی حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب کے تلامذہ میں سے ہیں، راقم سطور کو چاہنے والوں میں سے ہیں، آپ سے راقم کی ملاقات تو تھی، لیکن زیادہ نہیں، جہاں تک اندازہ کیا کہ آپ جیدالفکر عالم دین ہونے کے ساتھ قومی وملی امور کے متعلق کافی فکرمند ہیں، آپ کے حوالے سے مزید باتیں اگلی سطور میں آرہی ہیں، چاہے خدا کرے۔

(۷) <u>عبدالشکور ابوالفضل:</u>

حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب کے اس صاحب زادہ نے آٹھ سال کی عمر میں داغ فراغ دے گیا، اناللہ وانا الیہ راجعون، آبائی بستی کی قبرستان میں مدفون ہے۔

(۸) <u>فاطمہ بنت ابوالفضل:</u>

آبائی بستی میں پیدا ہوئی، کچھ دینیات کی تعلیم بستی کے مکتب کے علاوہ اپنے والدگرامی سے پائی،

لائق ہوئی تو اپنی بستی کے ایک صاحب سے شادی ہوئی، خدا کو منظور تھا کہ شادی کے کچھ سال بعد اس کے شوہر کا انتقال ہوگیا، اس کے بعد خائندہ فارہ منگڈو کے ایک صاحب سے دوبارہ شادی ہوئی، عرصہ دراز تک اپنے بھائی مولانا حسین احمد صاحب کے پاس چاٹگام میں رہی، بعد میں وطن چلی گئی تھی، آج کل کاکس بازار کے علاقے میں مہاجرت کی زندگی گزار رہی ہے۔

حضرت مولانا مفتی صاحب نے مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ کے دوران تدریس ایک شادی کی تھی، اس اہلیہ کا نام مصطفی خاتون تھا، اس کے بطن سے حضرت کی ایک بیٹی پیدا ہوئی، جس کا نام محمودہ خاتون تھا۔ ادھر حضرت کی یہ صاحب زادی عنفوانِ شباب میں انتقال کرگئی تو ادھر بعض ناقابلِ بیان وجوہات کی بنیاد پر میاں بیوی کے درمیان ناچاقی ہوکر آخرنوبت طلاق تک پہنچ گئی۔

شنید ہے کہ مصطفی خاتون نے دوسری شادی کرلی، وطن کو خیرباد کہہ کر مع اہل خانہ سعودی عرب چلی گئی، مدینہ منورہ میں مقیم ہے، مولانا حسین احمد کے مطابق مفتی صاحب کی بعض اولاد گاہے گاہے اس کی زیارت کو جاتی تو ان کے ساتھ باوجودیکہ مفتی صاحب سے علیحدگی ہوچکی ہے، اپنی اولاد جیسا برتاؤ کرتی ہے، اللہ تعالی اسے خوش وخرم رکھے۔

<u>مولانا نورمحمد صاحب خیرمورہ فاروی:</u>

الحاج مولانا نورمحمد بن علیم اللہ بن عبدالحمید بن علیم الدین شاہ صاحب کی ولادت ۱۹۶۰ء میں جنوبی بوسیدنگ کی معروف ومردم خیز بستی خیرمورہ فارہ میں ہوئی، مکتب نشینی آپ کی آبائی بستی میں ہوئی، پھر یازدہم سے لے کر جماعتِ سیوم تک کی تعلیم جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں ہوئی، اس کے بعد اگلی تعلیم کے سلسلے میں ۱۹۷۷ء میں بنگلا دیش کا سفر کیا، اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں داخل ہوئے، یہاں اگلے دوسال پڑھ کر ۱۹۷۹ء میں سندِفراغت حاصل کی۔

جہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نورمحمد صاحب جس زمانے میں جامعہ اسلامیہ عالیہ میں پڑھ رہے تھے، اسی زمانے میں آپ کے بڑے بھائی حضرت مولانا ولی احمد صاحب (مرحوم ومدفون مکہ مکرمہ) اسی جامعہ کے مدرس تھے، جنہوں نے اپنے عزیز بھائی کو اپنی نگرانی میں تعلیم دلائی تھی۔

فراغتِ تعلیم کے بعد آپ وطن واپس لوٹے، اور حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب لمبا بیلی

بوسیدنگی کی لاڈلی اور پڑھی لکھی بیٹی ساجدہ بیگم سے شادی کی۔مولانا نور محمد صاحب نے ۱۹۸۲ء میں وطن سے ہجرت کی،اور مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر ہو گئے،بعد میں اپنی اہلیہ کو بھی وہاں بلا لیا،آپ ابھی مدینہ منورہ میں مع اہل خانہ مقیم ہیں۔

آپ نے سالہا سال تک سرزمین مقدس میں مساجد کی امامت کے ساتھ ہی ساتھ دینی مدارس کی خدمات بڑی خوش اسلوبی سے نبھائیں، پھر کبھی کبھار جوارِ حرم پاک میں کچھ نجی تجارت سے بھی دل چسپی لی،جس میں اللہ تعالی نے خاصی برکت دی تھی۔

مولانا کی نو اولاد ہیں،جن میں سے چھ صاحب زادیاں ہیں اور تین صاحب زادے ہیں،صاحب زادیوں میں سے تین حافظۃ القرآن اور درجۂ متوسطہ تک کی تعلیم یافتہ ہیں،جب کہ صاحب زادے تمام کے تمام حافظ القرآن اور درجۂ ثانویہ تک کے تعلیم یافتہ ہیں،اللہ تعالی ان سب کی حیات دراز کرے۔

مولانا سے راقم سطور کی ملاقات مکہ مکرمہ میں ہوئی،جب کہ آپ کا تذکرہ عنفوانِ شباب سے مولانا حسین احمد صاحب کی زبانی سنتا آرہا تھا،اتنے دنوں تک جہاں تک سنا تھا ملاقات کے بعد آپ کو اس سے بھی بڑھ کر پایا،اور اندازہ ہوا کہ آپ اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا ولی احمد صاحب کے عزیز بھائی کہلانے کے مستحق ہیں،بڑے خوش اخلاق،متواضع اور ایک متقی عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ سرزمین ارکان اور وہاں کے مظلوم مسلمانوں کے حوالے سے کافی فکر مند انسان ہیں،اور بڑے دل درردمند بھی۔

مولانا حسین احمد صاحب اور ان کی بلند و بالا شخصیت اور قوم و ملت کے حوالے سے ان کے کردار پر مولانا نور محمد صاحب کو کافی مطمئن دیکھا گیا تھا،اور جہاں تک اندازہ ہوا کہ زندگی میں آپ نے مولانا حسین احمد صاحب کی مقدور بھر خدمات کی ہیں۔

مولانا نور محمد صاحب ملاقات کے دوران راقم سطور سے بھی شفقت اور محبت سے پیش آئے تھے،تا دم تحریر آپ سے رابطے بحال ہیں،دعائیں دیتے بھی ہیں اور دعائیں چاہتے بھی،راقم کو آپ کے ہر انداز و ادا میں اخلاص وللّٰہیت دیکھائی دیتی ہے،اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دے،اور آپ کی شفقت و محبت کا سایہ ہم پر تادیر باقی رکھے،آمین۔

حضرت مولانا قاضی عبدالہادی صاحبؒ

حضرت مولانا عبدالہادی معروف بہ قاضی مولوی صاحب کی پیدائش قصبۂ علی چنگ،بوسیدنگ کی بستی لمبا بیل میں ہوئی،آپ کا خاندان ایک کاشتکار خاندان ہے،ماضی قریب میں اس خاندان میں بڑے بڑے علمائے ملت پیدا ہوئے،جن میں مولانا مفتی ابوالفضل کے علاوہ حضرت مولانا سعید اللہ صاحب لمبا بیلی ناقابل فراموش ہیں علمائے دین ہیں۔

عام روایت کے مطابق حضرت قاضی صاحب کی مکتب نشینی بستی کے مکتب میں ہوئی،کچھ بڑے ہوئے تو ایک روایت کے مطابق مدرسہ اشرف المدارس راجار بیل راسیدنگ میں داخل ہوئے،یہاں آپ نے متوسطہ تک کی تعلیم حاصل کی،اس کے بعد آپ کلکتہ گئے،اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔تعلیم سے فراغت کے بعد آپ وطن واپس آئے اور اپنی بستی کے مسلم بچوں کو پڑھاتے رہے،برطانوی حکومت نے آپ کو قضاء کا عہدہ دیا تو آپ اپنے علاقے میں ''قاضی مولوی صاحب'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بعض اہل علم کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ آپ بڑے جید عالم دین اور صاحب ورع و تقوی بزرگ تھے،فقہ وفتاوی میں ید طولی رکھتے تھے،ویسے بھی معروف ہے کہ آپ بڑے مدبر اور معاملہ فہم انسان تھے،برطانوی دور حکومت میں اس خطے میں منصب قضاء کا روج تھا،یوں برطانوی حکومت نے بڑی جانچ پڑتال کے بعد آپ کو منصبِ قضاء پر فائز کیا تھا،ورنہ اسی زمانے میں اس علاقے میں اتنے بڑے بڑے علماء اور صلحاء کے ہوتے ہوئے آپ کو اس منصبِ جلیلہ پر کیوں فائز کیا گیا تھا؟

قاضی صاحب کی والدہ ثقیلہ خاتون بنتِ خیر النساء بنت حضرت مولانا شاہ عبدالباری معروف بہ بڑے مولوی صاحب کجا فویؒ ایک عالی صفات والی خاتون اسلام تھیں،حضرت شاہ صاحب اور سرزمین ارکان کے دور آخر کے قائد تحریک حضرت جعفر حبیب مرحوم کا دادا جناب ابوالخیر صاحب مرحوم آپس میں چچا زاد بھائی تھے،یوں ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے خاندان اور قاضی صاحب کے خاندان کے مابین رشتہ داری تھی،راقم سطور نے حضرت قاضی صاحب کے متعلق اپنی تصنیف ''تذکرۂ علامہ سید الامینؒ'' میں یوں لکھا کہ:

"قاضی مولوی عبدالہادی صاحبؒ بن ثقلیہ خاتون بنت خیر النساء بنت حضرت مولانا شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں اس علاقے کے بڑے علماء میں شمار تھے، آپ تفسیر وحدیث اور فقہ وکلام میں ید طولی رکھتے تھے"۔

اس ضمن میں یہاں اور ایک بات قابل تذکرہ ہے کہ دورِ آخر میں سرزمین ارکان کے بانی تحریک حضرت مولانا جعفر حسین قوال شہید اور قاضی صاحب کے درمیان بھی رشتہ ہے، اس کا اجمال کچھ یوں ہے کہ بانی تحریک کی والدہ بنوشاہ خاتون اور قاضی صاحب کی نانی خیر النساء دونوں حضرت مولانا شاہ عبدلباری صاحب کی صاحب زادیاں تھیں۔

حضرت مولانا قاضی عبدالباری صاحب حضرت مفتی ابوالفضل صاحب کا چچا تھے، لوگوں سے سنا کہ حضرت مفتی صاحب قاضی صاحب کو بہت ہی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، اس حوالے سے مولانا حسین احمد صاحب کا بھی بیان ہے کہ:

"میرے والد گرامی حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحبؒ دادا حضرت مولانا قاضی عبدالہادی صاحبؒ کو بڑی عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، والد صاحب جس زمانے میں تنگ بازار کے مدرسہ میں درس دیتے تھے، گھر آتے ہی حضرت قاضی صاحب کی زیارت کو کوجایا کرتے تھے، اور انہی اپنے حقیقی والد کی طرح جانتے اور ان کی خدمت کرتے تھے، قاضی صاحب ایک جید اور معاملہ فہم عالم دین ہونے کے علاوہ نہایت متقی اور درویش صفت بزرگ تھے، ہمارے علاقے میں حضرت کو بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے"۔

میں نے حضرت قاضی صاحب کو نہیں دیکھا، شاید میری پیدائش سے بہت پہلے آپ انتقال کر گئے ہوں، یوں کوشش کے باوجود حضرت کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتہ نہیں چل سکا، البتہ جہاں تک پتہ چلا کہ آپ ایک جید عالم دین، فقیہ اور مفتی ہونے کے علاوہ شب زندہ دار بزرگ تھے، اللہ تعالی حضرت کے درجات بلند کرے، اور ماضی قریب وبعید میں جس طرح حضرت کی اولاد واحفاد اور خاندان کے دیگر بزرگوں کو ملت وملک کی خدمات توفیق دی تھی، اسی طرح مستقبل میں بھی مزید توفیق سے نوازے۔

حضرت مولانا سعید اللہ صاحبؒ

حضرت مولانا سعید اللہ صاحب کی پیدائش قصبۂ علی چنگ، بوسیدنگ کی بستی لمبا بیل میں ہوئی، سنا ہے کہ آپ کے والد صاحب نہایت دین دار ہونے کے علاوہ بڑے علماء دوست بزرگ تھے، اور والدہ بھی بڑی نیک صفات خاتون تھیں۔

مولانا کی مکتب نشینی اپنے گاؤں کے مکتب میں ہوئی، مزید پڑھنے کے قابل بنے تو اشرف المدارس راجاربیل راسیدنگ میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے متوسطہ تک کی تعلیم پائی، اس کے بعد آپ کلکتہ گئے، اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہو کر علوم اسلامیہ کی تکمیل کی۔

ہمارے علاقہ بھر میں ایک بات یہ مشہور تھی کہ کلکتہ کے دوران تعلیم آپ علالت میں مبتلا ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے آپ کی پڑھائی میں کافی خلل پیدا ہو گیا تھا، راقم سطور اگرچہ آپ کا تلمیذ ہے، لیکن اسے کبھی بھی اس حوالے سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

مولانا بڑے قابل اور پائے کے عالم دین تھے، علوم اسلامیہ میں ید طولی رکھتے تھے، علاوہ اس کے آپ انگریزی زبان وادب میں خاصی مہارت بھی رکھتے تھے، ہم نے اپنے عنفوان شباب میں جہاں تک دیکھا کہ ہمارے پورے علاقے میں دو عالم دین ایسے تھے، جو بیک وقت عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان وادب میں ید طولی رکھتے ہوں، ان میں سے ایک حضرت مولانا سعید اللہ صاحب، جب کہ دوسرا محدث العصر والفقیہ حضرت علامہ سلطان احمد فوئما لوی۔ ویسے علماء میں ان دونوں کی عزت تو تھی ہی، علاقے بھر کے دانش وران بھی ان دونوں کو بڑی توقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، میں اپنی تہی دامنی کے باوصف اس حوالے سے مزید کچھ لکھنا چاہوں تو بہت کچھ لکھ سکتا ہوں، لیکن طوالت کا خوف ہے۔

مولانا کو جہاں تک دیکھا اور ان کے بیانات اور گفتگو سننے کا جہاں تک موقع ملا، ان تمام چیزوں سے اندازہ ہوا کہ آپ بڑے پائے کے عالم دین اور انگریزی زبان وادب میں مہارت رکھنے کے علاوہ بین الاقوامی سیاسی حالات اور ملک کے داخلی سیاسی نزاکت سے بخوبی آگاہ تھے، تو اسی وجہ سے بھی ہمارے علاقہ بھر کے سیاست سے دل چسپی رکھنے والے حضرات آپ کو ایک عالم دین ہونے

کے ساتھ ایک جہاں دیدہ سیاسی اور مفکر سمجھتے تھے، اس حوالے سے ہر ایک آپ کی گفتگو کو بڑے غور سے سنتے تھے۔ علاوہ ازیں وقت کے جید سے جید ترین علماء آپ سے ڈرتے تھے، وجہ یہی تھی کہ ظاہر ہے کہ عام طور پر ہمارے اس وقت کے علمائے کرام عالمی اور داخلی سیاسیات سے اتنے واقف نہیں تھے، جتنے آپ تھے، تو سیاسیات کے موضوع پر جہاں بھی گفتگو چھڑ جاتی تھی، وہاں علمائے کرام کی آراء پر آپ کی رائے بھاری پڑ جاتی تھی، اور لوگ کہتے تھے کہ عالم ہو تو مولانا سعید اللہ صاحب جیسے، یوں علماء آپ سے دب جانے کے ڈر سے بھی آپ سے پہلو تہی کیا کرتے تھے۔

مولانا کی علوم عصریہ یعنی سائنس اور ٹکنالوجی پر بھی خاصی نظر تھی، علمائے کرام کے لئے آپ ان فنون کو سیکھنا ضروری سمجھتے تھے، اس حوالے سے میرے ایک سینئر ساتھی مولوی عبید اللہ صاحب پانچکری بیلی کا یہ بیان آج بھی جوں کا توں یاد ہے کہ:

> ''میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا، آئے دن میری حضرت مولانا سعید اللہ صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں، ایک دن کا واقعہ تھا کہ بوسیدنگ شہر میں آپ سے ملاقات ہوگئی، تو حضرت نے مجھ سے پوچھا کہ لندن سے ریڈیائی گفتگو یہاں والے کیسے اور کس وجہ سے سن سکتے ہیں؟ تو میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ حضرت یہ تو سائنس اور ٹکنالوجی کی بات ہے، جس سے میں ناواقف ہوں، تو حضرت نے فرمایا کہ تم لوگ اسے سیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ تو میں نے جواب دیا کہ حضرت! اس قسم کے علوم تو ہمارے مدارس میں سکھائے نہیں جاتے، تو حضرت نے فرمایا کہ تم کہاں سے سیکھو گے، خود تمہارے اساتذہ ان علوم وفنون سے ناواقف اور بے خبر ہیں۔ آپ کی اتنی سی بات نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، اور دل سے دل نے کہا کہ واقعتاً ہمارے علمائے کرام کو بھی ان علوم کا سیکھنا ضروری ہے''۔

صحت اور تن درستی کی حالت میں مولانا روز اپنی بستی سے شہر بوسیدنگ جایا کرتے تھے، صبح نو دس بجے گھر سے نکل کر پیدل بوسیدنگ پہنچا کرتے تھے، (اس زمانے میں شاید اب بھی ہو کہ مواصلات کے کوئی بھی ذرائع نہیں تھے) اور شام ہونے آتی تو آپ گھر لوٹ آتے تھے، جہاں تک میں نے

دیکھا کہ بوسیدنگ شہر میں آپ کے خاصے چاہنے والے تھے، جن کو روز انتظار ہوتا تھا کہ مولانا تشریف لائیں گے اور اپنی مفید باتوں سے مستفید کریں گے، اور جس دن آپ نہیں آتے تو لوگ سمجھتے تھے کہ آپ کو ضرور کوئی بیماری لاحق ہوگئی ہے، مرتے دم تک آپ کا یہی معمول بحال تھا، ویسے آپ آج بھی میری نظروں کے سامنے ہیں، مدبرانہ چال چلتے ہوئے آپ کو بوسیدنگ جاتے اور آتے دیکھ رہا ہوں، میں جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں پڑھتا تھا، راستے پر کہیں آپ سے ملاقات ہو جاتی تو آپ میرے ساتھ بڑی شفقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔

اس ضمن میں چلتے چلتے ایک بات یاد آ گئی ہے کہ ۱۹۸۴ء کے دوران مولانا سعید اللہ صاحب کے بڑھاپے کا عالم تھا، دھوپ کی شدت تھی پھر بھی آپ اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق صبح نو دس بجے پیدل بوسیدنگ جا رہے تھے، ادھر پیچھے سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور راقم سطور لمبا بیل سے بوسیدنگ کو نکلے (یاد رہے کہ اسی زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب بنگلا دیش سے واپس آ کر اپنی بستی لمبا بیل میں مقیم تھے) دیکھتے ہیں کہ بستی لمبا بیل اور چانچکری بیل کی درمیانی سڑک پر حضرت مولانا سعید اللہ صاحب بڑھاپے کی دھیمی چال چلتے ہوئے بوسیدنگ جا رہے ہیں، ظاہر ہے کہ میں نوجوان اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب پورے جوان تھے، ہم دونوں کی چالیں تیز تھیں، ہم آگے بڑھے تو مولانا سعید اللہ صاحب کو راستے میں پالیا، ہم دونوں آپ کے پیچھے تو ہو گئے، لیکن مولانا حسین احمد صاھب چاہتے نہیں تھے کہ آپ کو کسی بھی طرح کراس کر کے آگے نکل جائیں، ادھر آپ کو خبر نہیں تھی کہ ہم دونوں آپ کے پیچھے ہیں، ویسے کافی وقت گزر جانے کے بعد شاید ہماری آہٹ پر ہو کہ اچانک آپ پیچھے مڑے، تو ہم نے آپ کو سلام مسنون کیا، تو سلام کے جواب کے معا بعد آپ نے فرمایا کہ ''میں تو ایک بوڑھا، ضعیف اور کم زور آدمی ہوں، یوں میری چال بڑی دھیمی ہے، جب کہ تم جوان ہو، آگے نکل جاؤ، کوئی مضائقہ نہیں'' ویسے نہ چاہتے ہوئے بھی تعمیل حکم پر ہم دونوں آگے نکل گئے تھے۔ اب چلتے چلتے مولانا حسین احمد صاحب فرمانے لگے کہ: دل نے یہ تک گوارہ نہیں کیا کہ چچا جان (مولانا حسین احمد صاحب آپ کو چچا جان کہہ کر پکارا کرتے تھے) سے اجازت لوں کہ آپ کو پیچھے چھوڑ کر ہم دونوں آگے نکل جائیں، لیکن کیا کروں کہ آپ کی تعمیل حکم کی

بات ہوچکی ہے۔ مجھے اس واقعہ سے بزرگوں کے ساتھ ادب کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب کے ایک بلند اخلاق کا اندازہ ہوا۔

مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا سعید اللہ صاحب کے گھر کے مابین تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ ۱۹۸۴ء کے دوران میں ان دونوں سے پڑھتا تھا، مولانا حسین احمد صاحب سے عربی اور اردو انشاء کے علاوہ علم و فکر کی دیگر کتابیں بھی پڑھتا تھا، جن میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی ندویؒ کی کتاب ''روائع محمد اقبال'' اور سیرت رسولؐ پر مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''رسول رحمت'' ناقابلِ فراموش ہیں، اور مولانا سعید اللہ صاحب سے انگریزی ریڈرز کے ساتھ گرامر کا بھی درس لیا کرتا تھا۔ ایک روز مولانا سعید اللہ صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم حسین احمد سے کیا پڑھتے ہو؟ جواب میں میں نے مذکورہ چیزیں بتائیں، تو آپ نے فرمایا کہ انشاء کی کون سی کتاب تمہارے سامنے ہوتی ہے؟ تو میں نے جواب دیا کہ یہاں تو انشاء کی کوئی معیاری کتاب ملنی مشکل ہے، اس لئے مولانا اپنی یادداشت سے پڑھاتے ہیں، میرے اس جواب پر آپ پریشان ہو گئے، اور فرمایا کہ انشاء کے لئے کوئی کتاب کا ہونا بہت ضروری ہے، ورنہ فائدے مطلوبہ حد تک نہیں ہو سکتے۔

جہاں تک میری معلومات ہیں کہ مولانا سعید اللہ صاحب کے پاس کچھ خاندنی جائدادیں تھیں، جن کی آمدن سے آپ کا گزارا ہوتا تھا، سردی کے موسم میں آپ اپنے گھر کی سامنے والی زمین پر کھیتی باڑی کیا کرتے تھے، بڑھاپے کے زمانے میں بھی کبھی کبھار دن چڑھے اس میں کام کاج کرتے تھے، میں پڑھنے جاتا تو آپ اکثر کھیتی میں ملتے، مجھے دیکھتے ہی کھیتی کے بیچ میں بیٹھ جاتے، اور دورانِ درس کبھی کبھی یہی فرمایا کرتے تھے کہ پڑھنے والوں کے لئے ہر کہیں پڑھائی میسر ہو جاتی ہے، کسی خاص جگہ کی ضرورت نہیں ہوتی، طلب اور تڑپ کا ہونا شرط ہے۔

مولانا بڑے آن بان اور شان کے بزرگ تھے، عبادت و بندگی گویا آپ کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی، ہر کسی کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی سے ملتے تھے، تاہم بعض علمائے کرام کو اس حوالے سے کوستے تھے کہ آپ کے نزدیک ہمارے یہاں کے علماء نہ خود پڑھائی کی طرح پڑھتے اور نہ مسلمانوں کے بچوں کو مفید اور ضروری پڑھائی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ویسے بعض علماء کو بھی آپ سے یہی

شکایت تھی کہ آپ علمائے کرام کا پاس لحاظ بہت کم کرتے ہیں، جس کی وجہ سے علماء کے خلاف دانش وروں کے علاوہ عوام کی زبانیں تک کھل جاتی ہیں۔

مولانا نے بھرپور عمر پائی، تقریباً اسی سال کی عمر میں ۱۹۸۷ء میں داعئ اجل کو لبیک کہا، اور خاکِ لمبا بیل میں مدفون ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دوسرا باب

ولادتِ باسعادت

دور حاضر میں ارکان کے معروف عالم مولانا حسین احمد ابوالفضل کی ولادت ۱۹۵۵ء میں قصبۂ علی چنگ، بوسیدنگ کی بستی لمبا بیل میں ہوئی، آپ کے والد مولانا مفتی ابوالفضل صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے عالم دین، مفسر، محدث، فقیہ اور اصولی انسان تھے، جن کا تذکرہ سطور بالا کے علاوہ راقم الحروف کی تصنیف ''سرزمین ارکان کے درخشاں ستارے'' میں بھی قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔

مولانا کی والدۂ محترمہ کلثوم خاتون رنگیا دنگی، بوسیدنگی مرحومہ ایک نہایت نیک ہونے کے علاوہ علمائے اسلام اور طالبانِ علوم دینیہ سے محبت اور احترام کرنے والی خاتون تھیں، ویسے اللہ تعالی نے ان کے بطن میں مولانا حسین احمد صاحب کے علاوہ مولانا محمد جلیل صاحب جیسے قابلِ قدر علماء عطا کئے۔ مرحومہ اپنی عمر کے بعض مراحل میں نفسیاتی مرض (پاگل پن) کی شکار ہوگئی تھیں، جس کی وجہ سے ان کو اپنی زندگی میں بڑی سی بڑی تکلیفیں سہنی پڑیں، مگر ایک عجیب بات تھی کہ وہ ہر حالت میں علمائے دین اور طالبانِ علوم دینیہ کا پاس ولحاظ رکھتی تھیں، بہر حال وہ اپنی عمر کے آخری مراحل میں اپنے فرزند مولانا حسین احمد صاحب کی رہائش گاہ میں رہیں، مولانا نے ان کی اچھی خاصی خدمات کیں، اس دوران ان کا علاج ومعالجہ بھی کیا گیا، افاقہ تو ہوتا تھا مگر بہت کم، ایسی حالت میں قدرت کو جومنظور تھا آخر وہی ہوگیا، کہ انہوں نے ۱۹۹۲ء میں وفات پائی، اور خاک چاٹگام میں مدفون ہیں، مرحومہ کی نمازِ جنازے میں کافی لوگاں نے شرکت کی تھی۔

نشوونما اور تعلیم

مولانا حسین احمد صاحب کا نشوونما اپنی بستی لمبا بیل اور اپنے علاقے میں ہوا، لیکن جہاں تک میرے علم وآگہی کا تعلق ہے، اس کے مطابق آپ کا نشوونما گاؤں کے عام بچوں کی طرح نہیں ہوا تھا، کیوں کہ ایک طرف گھر کا ماحول ہی طبیعی طور پر علم وعمل، دین داری اور خداترسی کا تھا، تو دوسری طرف ظاہر ہے کہ جس گھر کا نگران اعلی اور رکھوالا حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب جیسے عالم دین، بالغ نظر اور درویش صفت انسان ہوگا، اس گھر میں مولانا حسین احمد جیسا انسان کا پیدا ہوکر اچھا خاصا نشوونما پانا ایک طبیعی اور قدرتی امر ہے، ویسے آپ کا نشوونما ایک دینی ماحول میں اور وہ بھی اپنے والد گرامی کے سایۂ لطف وعاطفت اور ربوبیت میں ہوا۔ غرض آپ کا بچپن اور لڑکپن ایک دینی، علمی اور اخلاقی ماحول میں گزرا، اس حوالے سے آپ کے والد بزرگوار حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب کا ایک بیان مجھے آج تک جوں کا توں یاد ہے کہ:

> ''حسین احمد کی ولادت ہوئی تو نہ جانے کیوں کہ دل ہی دل میں یہ خیال جاگزین ہوگیا تھا کہ میرے گھر میں ایک باسعادت بچہ پیدا ہوچکا ہے، اور خدا کرے تو یہ بچہ ایک دن ملت وقوم کے حوالے سے کام کا انسان بنے گا، اس لئے ہم نے اسے دیگر بچوں کی طرح نہیں پالا، اس کی دیکھ بال میں خصوصی توجہ دی، اور وہ کچھ بڑا ہوا تو میری امید کے مطابق اس کے ستارۂ اقبال کو کافی بلند پایا، یوں اس کی تعلیم و تربیت کے دوران اس کی خاصی نگرانی کی گئی تھی، تاکہ بستی اور علاقے کے عام بچوں کی طرح اس کا کوئی بھی وقت ضائع نہ ہونے پائے''۔

حضرت مفتی صاحب کا یہ بیان اس وقت کا ہے، جب مولانا حسین احمد صاحب فراغتِ تعلیم کے معا بعد جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے، دراں حالیکہ مفتی صاحب جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں شیخ الحدیث کے منصبِ جلیلہ پر فائز تھے، افسوس ہے کہ مفتی صاحب کے اس بیان کے چند سال بعد آپ کی وفات ہوگئی، کاش حضرت آج زندہ ہوتے تو اپنے بیٹے کی ترقی، کچھ کامیابی اور بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کو دیکھ کر آپ کا دل کتنا باغ باغ ہوچکا ہوتا۔

مولانا محترم کی تعلیم کا آغاز خود اپنے والد کے مبارک ہاتھوں اپنے گھر میں ہوا، اس کے بعد مکتب نشینی ہوئی، ایک طرف دینیات کی ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی اور بستی کے مکتب میں ہوتی رہی تو دوسری طرف عصری تعلیم بستی کے سرکاری پرائمری اسکول میں ہوتی رہی تھی، یوں بستی کے اسکول سے چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد بوسیدنگ میڈل اسکول میں بھی ایک دوسال پڑھتے رہے تھے۔

اس کے بعد شہر بوسیدنگ کی معروف دینی درس گاہ ''جامعہ اسلامیہ عالیہ'' میں داخلہ لیا، جس میں آپ کے والد گرامی سالہا سال سے بزم قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شمع فروزاں تھے، اور علوم دینیہ واسلامیہ کے حوالے سے باضابطہ طور پر یہیں سے آپ کے سفر کا آغاز ہوگیا، یوں اپنے عظیم والد کی زیر نگرانی آپ نے اس درس گاہ سے جماعت دوم تک کی تعلیم پائی۔

مذکورہ اس درس گاہ میں آپ کے والد صاحب کے علاوہ بڑے بڑے جید علمائے کرام مدرس تھے، جن میں: حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بانگونوی، حضرت مولانا ولی احمد صاحب خیر مورہ فاروی، حضرت مولانا تمیز الرحمن صاحب گوفیوی، بوسیدنگی، حضرت مولانا ابوسعید صاحب ہولی مرنگی، حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب تمنگ چنگی، حضرت مولانا نور احمد صاحب، صاحب بازاری، حضرت مولانا ابوالحسین صاحب کوائندنگی نا قابل فراموش ہیں۔

آپ کی تعلیم کے متعلق یہاں ایک بات کا تذکرہ شاید دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ابھی جامعہ اسلامیہ عالیہ میں مولانا حسین احمد صاحب جماعتِ نہم کے طالب علم تھے، اس دوران سرزمین ارکان کے مایۂ ناز عالم دین، داعی الی اللہ، شیخ طریقت و ماحی بدعت وخرافات حضرت مولانا شاہ محمد ادریس صاحب مہتمم دار العلوم سعد اللہ سر (خلیفہ ومجازِ بیعت حضرت مولانا عبد الوہاب صاحب سابق مہتمم دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری، چاٹگام، بنگلا دیش) دینی ودعوتی خدمات کے بطور بوسیدنگ تشریف لائے تھے، تو حضرت مفتی صاحب نے اپنے لاڈلے اور چہیتے حسین احمد کو حضرت کا حوالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ: آپ حسین احمد کو آپنے ساتھ لے جائیں، اور اپنی خاص نگرانی میں اس کی تعلیم وتربیت فرمائیں! لیکن مولانا محمد ادریس صاحب نے مفتی صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا: حسین احمد ابھی بہت چھوٹا ہے، ایک طرف والدین کی مسلسل جدائی تو دوسری طرف سفر کی صعوبت برداشت نہیں کر پائے

گا، اسے تاحال آپ کے پاس رکھیں، میں اسے مولانا محمد شفیع (۱) کا حوالہ کرتا ہوں، جن پر میرا اعتماد ہے، جو اس کی تعلیم وتربیت کریں گے، اس کی نگرانی میں خدا کرے تو اس کی اچھی تعلیم اور تربیت ہوگی، یہاں اس واقعہ کے حوالے سے خود مولانا حسین احمد صاحب کا ایک ٹیلیفونک بیان ملاحظہ ہو کہ:

> ''جامعہ اسلامیہ عالیہ میں میرا جماعت نہم کا سال تھا، مولانا محمد ادریس صاحب تشریف لائے، والد صاحب نے مجھے آپ کا حوالہ کیا، لیکن آپ نے میری عمر اور حالت پر ترس کھاتے ہوئے فرمایا کہ: حسین احمد ابھی چھوٹا ہے، میں اسے مولانا محمد شفیع صاحب کا حوالہ کرتا ہوں، جن پر مجھے اعتماد ہے، انشاء اللہ وہ اچھی تعلیم دیں گے، اور اس کی تربیت میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑیں گے، بعد میں انشاء اللہ دیکھا جائے گا''۔

مذکورہ واقعہ سے ایک طرف اندازہ ہوا ہے کہ حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب بذاتِ خود ایک عالم دین اور منجھے ہوئے مدرس ومعلم ہونے کے باوجود حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سے کتنی عقیدت ومحبت رکھتے تھے، تو دوسری طرف حضرت مفتی صاحب کو اپنے چہیتے بیٹے حسین احمد کی تعلیم وتربیت کا کتنا ہی خیال تھا۔ پھر اس واقعہ سے ایک بات سامنے آئی ہے کہ بعض نادان شاید کہ حاسدین

(۱) سرزمین ارکان کے جید اور باصلاحیت لیکن گمنام عالم دین، عابد وزاہد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کی پیدائش مردم خیز بستی کوائندنگ، بوسیدنگ میں ہوئی، آپ کا نشو ونما اپنی آبائی بستی میں ہوا، اور ابتدائی ومتوسطہ کی تعلیم علاقے کے دینی مدارس میں ہوئی، اس کے بعد بنگلا دیش کی معروف دینی، علمی اور روحانی درس گاہ دار العلوم معین الاسلام ہاٹہزاری میں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ فراغت تعلیم کے بعد آپ وطن واپس آئے، اور علاقے کے چند دینی مدرسوں میں پڑھاتے رہے، جن میں جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے علاوہ مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ بوسیدنگ قابلِ ذکر درس گاہیں ہیں، آپ ہمارے علاقے میں ایک قابل مدرس ومعلم کی حیثیت سے بہت ہی مشہور تھے، سنا تھا کہ آپ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سعد اللہ سری قدس سرہ کے مرید اور مجازِ بیعت ہیں۔ نہ جانے کس وجہ سے کہ آپ ترک وطن کر کے پاکستان پہنچے، اور عرصۂ دراز تک وہاں کے مختلف دینی وعلمی مدارس میں پڑھاتے رہے تھے، حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی نیت سے حجازِ مقدس کا سفر بھی کیا، اطلاع کے مطابق وہاں چند سال رہے، اور بعد میں پاکستان چلے گئے، شنید ہے کہ تادم تحریر آپ حیات سے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دے، اور جہاں کہیں بھی ہوں سلامت سے رکھے۔ آمین۔

ہوں کہ حضرت مفتی صاحب پر الزام دیتے نہیں تھکتے ہیں کہ ''مفتی صاحب ایک غرور و پندار کا شکار انسان ہیں، دانش وران تو خیر دانش وران علماء تک کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، آپ کی نظر میں کوئی بھی آدمی جچتا نہیں ہے''، لیکن ظاہر ہے کہ حضرت مفتی صاحب لوگوں کے یہ اور اس قسم کے دیگر الزامات سے کلی طور پر بری اور پاک تھے، تاہم یہ بات صحت پر مبنی ہے کہ مفتی صاحب **''انزل الناس بقدر منازلھم''** کے قائل نہیں بلکہ اس پر عامل ضرور تھے۔

بہر حال مولانا حسین احمد نے دیگر اساتذۂ کرام کے تہ بتہ حضرت مولانا محمد شفیع صاحب سے بھی پڑھا تھا، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ مولانا کو اپنے استاد مولانا محمد شفیع صاحب سے خاصی عقیدت ہے، ہمیشہ بلند و برتر الفاظ والقاب سے یاد کرتے ہیں، آپ کے تذکرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا بڑے باکمال عالم دین اور بزرگ ترین شخصیت ہیں، جس کا اندازہ علاقے کے عام لوگوں تھا اور نہ بعض علمائے کرام کو۔ ادھر مولانا حسین احمد صاحب بھی اپنے والد بزرگوار حضرت مفتی صاحب کی طرح **''انزل الناس بقدر منازلھم''** کے نہ صرف قائل بلکہ اس اصول کے شدید پابند ہیں، ایسے انسان کی زبان سے تعریفی کلمات کا نکلنا مولانا محمد شفیع صاحب کے کمالات کی دلیل ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب نے جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ سے جماعت دوم تک کی تعلیم پا کر اعلی دینی تعلیم کے لئے بنگلا دیش کا سفر کیا، اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں داخلہ لیا، اور اسی دینی وعلمی درس گاہ میں دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، مولانا کا دعوی ہے کہ آپ دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں دورۂ حدیث کے کل طالب علم میں دوسرے نمبر پر آئے تھے، جب کے مولانا رشید نامی آپ کے ایک ساتھی نے نمبر اول کا پوزیشن حاصل کیا تھا، جس پر مولانا کو بعض اساتذہ کی شکایت کرتے ہوئے سنا گیا، اس حوالے سے حقیقت کی دریافت تا حال نہیں ہو سکی، پھر آپ سے جہاں تک سنا اسے من وعن بیان کر دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ تلخیوں کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں مولانا حسین احمد صاحب نے جن نامور علمائے کرام و اساتذۂ عظام سے استفادہ کیا تھا، ان بزرگوں کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت مولانا امیر حسین صاحب معروف بہ میر سنؒ۔

۲۔ حضرت مولانا علی احمد صاحب معروف بہ بوالی صاحب حضورؒ۔

۳۔ حضرت مولانا احمد صاحب معروف بہ امام صاحب حضورؒ۔

۴۔ حضرت مولانا نور العظیم صاحبؒ۔

۵۔ حضرت مولانا نور الاسلام صاحبؒ (قدیم)

۶۔ حضرت مولانا نور الاسلام صاحبؒ (جدید)

۷۔ حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب۔

۸۔ حضرت مولانا محمد ایوب صاحبؒ۔

۹۔ حضرت مولانا مظفر احمد صاحبؒ۔

۱۰۔ حضرت مولانا مفتی عبد الرحمن صاحبؒ۔

مذکورہ سارے کے سارے بزرگانِ دین وعلمائے شرع متین مولانا کے محسن اساتذہ ہیں، تاہم میری جانکاری کے مطابق آپ نے بطور خاص حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی سے استفادہ کیا تھا، حضرت ذوقؔ کے ساتھ آپ کی وابستگی الحمد للہ تادم تحریر باقی ہے، اللہ کرے تو مزید باقی رہے گی۔

جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں مولانا حسین احمد صاحب نے جن اساتذہ سے استفادہ کیا تھا، ان میں سے اکثر اساتذہ خود راقم سطور کے بھی استاد ہیں، تو ضرورت اس بات کی تھی کہ ان اساتذۂ کرام پر اجمالا ہی سہی کچھ نہ کچھ لکھا جائے، مگر ایک طرف خاطر خواہ معلومات کی کمی تو دوسری طرف طوالت کے خوف سے ان حضراتِ بزرگانِ دین پر یہاں قلم اٹھایا نہیں جا رہا ہے، پر شنید ہے کہ آج کل جا معہ اسلامیہ پٹیہ میں اس حوالے سے کام ہو رہا ہے، خدا کرے کہ ان حضراتِ بزرگانِ دین کی سوانح حیات مرتب ہو کر منظرِ عام پر آ جائے۔

پھر حال ہی کی بات ہے کہ استاد محترم مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی کے جاندار قلم سے اردو میں خود ان کی آپ بیتی ''نقوش زندگی'' چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے، راقم سطور کو ہدیہ میں ملی، من وعن مطالعہ کیا، جس میں کام کی خاصی چیزیں دیکھنے میں آئیں، تعجب ہوا کہ ان کی اتنی بڑی آپ بیتی میں مولانا حسین احمد کا نام تک کہیں نہیں آیا، اللہ تعالی حضرتِ استاد کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

بہرصورت اہل بنگلا دیش میں سے آج کل بہت سارے قلم کار راقم کے سامنے ہیں، شکر ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر ابورضا محمد نظام الدین ندوی صاحب ایم پی کی زیر سرپرستی ندوی فضلاء جن میں راقم بھی شامل ہے کی ایک مضبوط ومنظم جماعت ضروری اور لازمی موضوعات پر کام کر رہی ہے، توقع یہی ہے کہ آج نہیں تو کل یہاں کے بزرگانِ دین متین (جن میں سے الحمد للہ بہتوں کی سوانح حیات طبع ہو کر منظر عام پر آ بھی چکی ہیں) کی سوانح وتذکرے سامنے ضرور آئیں گے۔

لیکن اس حوالے سے سرزمین ارکان تقریبا بانچپن کی شکار ہے، ویسے بھی ہم جیسی غریب اور مفلوک الحال قوموں کی قومی کشتیاں ہر دم ناپید کنار سمندر کی موج وطلاطم اور گرداب وبھنور میں ڈگر کھاتی رہتی ہیں، یوں زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے حالات بڑے پریشان کن اور دگرگوں ہیں، تاہم خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ایسے مایوس کن حالات میں بھی ماضی قریب میں ہمارے دو فاضل دوستوں نے ہمارے بعض بزرگوں اور قومی خادموں کی سوانح حیات اور تذکرے پر کام کر کے نہ صرف مجھ ناچیز پر بلکہ پوری روہنگیا قوم کے اہل فکر ونظر پر بھاری احسان کیا ہے، جن میں سے ایک ہمارے معروف اور منجھے ہوئے صحافی اور جان دار اہل قلم مولانا سیف اللہ خالد صاحب مرحوم ہیں، جب کہ دوسرا ہمارے فاضل دوست، صاحب فکر وجہود اہل قلم مولوی حافظ محمد صدیق صاحب بارک اللہ تعالی فی حیاتہ ہیں، ان دونوں نے سرزمین پاکستان کے شہر کراچی سے اس موضوع پر قلم اٹھا کر ہماری آنکھیں کھول دی ہیں، اور ہم یہ جان چکے ہیں کہ ہمارا تعلق بھی ایک ایسی قوم سے ہے، جس کے بزرگوں نے اپنے دین وملت اور اپنے ملک وقوم کی خدمات انجام دینے میں کسی بھی قسم کی کسر نہیں چھوڑی، سردھڑ کی بازیاں لگائیں، زندگیاں کھپائیں اور اپنی جان تک کے نذرانے پیش کئے تھے۔ یوں میں اپنی اور اپنی قوم کی طرف سے ہمارے ان دونوں فاضل قلم کاروں کو داد تحسین اور گلدستۂ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

آب آمدم برسر موضوع، وہ یہ ہے کہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے ان ارکانی اساتذہ کرام پر کچھ لکھا جائے، جن کے سامنے آپ نے زانوئے تلمذ خم کر کے خوب خوب استفادہ کیا تھا، تو لیجئے حاضر خدمت ہیں:

حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب باغکونویؒ

استاد الحدیث حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب کی ولادت تقریبا ۱۹۰۵ء میں جنوبی بوسیدنگ کی معروف بستی باغکونہ (علی چنگ) بوسیدنگ میں ہوئی، آپ کے والد مرحوم کے متعلق بس اتنی سی بات معلوم ہو سکی کہ وہ ایک سادہ لوح، علم دوست اور نہایت عبادت گذار کاشتکار بزرگ تھے، اور والدہ بھی عابدہ وپارسا خاتون تھیں۔

حضرت کی دینی تعلیم بستی کے مکتب (فرقانیہ) سے شروع ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو معروف مدرسہ "اشرف المدارس راجار بیل" راسیدنگ میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے متوسطہ اور ایک روایت کے مطابق جماعت سیوم تک کی تعلیم پائی، اس کے بعد اساتذۂ کرام کے مشورے اور والدین کی خواہش پر اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور سیدھے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے جماعتِ دوم سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم پائی، بڑے ذہین وفطین طالب علم تھے، یوں بڑے سے بڑے اساتذہ کی نیک توجہ اور ذاتی محنت کے ساتھ اللہ تعالی کی رحمت شامل حال ہوئی تو علمی اعتبار سے آپ کی لیاقت واستعداد میں چار چاند لگ گئے، اور یہاں سے بڑی امتیازی شان سے سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے معا بعد آپ وطن واپس آئے، اور بوسیدنگ میں پائے جانے والے اس وقت کے مختلف مدارس میں تعلیم دیتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں بوسیدنگ کے عین شہر میں جامعہ اسلامیہ عالیہ کی بنیاد پڑی تو ایک روایت کے مطابق حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب کی دعوت پر آپ یہاں تشریف لائے، اور مرتے دم تک کے لئے یہاں کے ہو گئے، آپ نے اس درس گاہ میں ابتدائی کتابوں سے لے کر منتہی کتابوں کی تعلیم دی، اور کبھی شیخ الحدیث جیسے منصبِ جلیلہ پر بھی فائز رہے۔

جس طرح سطور بالا میں عرض کی گئی ہے کہ مولانا محمد ہاشم صاحب ۱۹۵۳ء میں اس محسن ادارہ میں مدرس ہو کے آئے، اور مرتے دم تک کبھی بھی اس سے الگ نہیں رہے، میری طالب علمی کے زمانے میں آپ متوسطہ کی دو کتابیں سمیت دورۂ حدیث سے صحیح بخاری جلد دوم اور صحیح مسلم جلد اول پڑھایا کرتے تھے، مولانا کی زبان نہایت صاف وشفاف اور اندازِ بیان بھی بڑا شان دار تھا، اور سادگی اور سادہ

لوحی میں اپنی مثال آپ تھے، شاگردوں کو اپنی اولاد سے بڑھ کر محبت اور شفقت کرتے تھے، آپ ایک جلیل القدر عالم دین، محدث، مفسر اور فقیہ وکلامی ہونے کے ساتھ ساتھ شبِ زندہ دار، عابد وزاہد بزرگ تھے، کسی بھی امور میں باتوں کے بتنگڑ بنانے والوں سے آپ کو چھیڑ تھی، آپ جو بھی فرماتے، صاف الفاظ اور واضح طریقے سے فرمایا کرتے، اور غیر ضروری باتوں سے نہایت پرہیز کیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب اور حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب دونوں جامعہ اسلامیہ عالیہ کے شیخین تھے، ہمارے زمانے میں بقیہ جتنے اساتذہ تھے، تقریبا تمام کے تمام ان دونوں کے تلامذہ میں سے تھے، اساتذۂ کرام اور طلباء اول الذکر کو مفتی صاحب، جب کہ ثانی الذکر کو شیخ صاحب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ طرہ یہ کہ ان دونوں کے درمیانی بعض امور بڑے دلچسپ ہوا کرتے تھے، اکثر دونوں مدرسے میں براجمان اور باہم شیر وشکر بنے رہتے تھے، تاہم کبھی کبھار دونوں کے مابین تھوڑی بہت ناچاقیاں بھی ہوجاتی تھیں، ایسے حالات میں دونوں دیکھے جانے کے قابل ہوجاتے تھے، لطف کی بات ہے کہ ان دونوں کے ایسے حالات میں طلباء تو کجا بلکہ اساتذۂ کرام میں سے بھی کوئی ان دونوں کے درمیان دخل دینے کی کوشش تک نہیں کرتے تھے، وہ اس لئے کہ مدرسے کے ہر ایک اس بات سے واقف تھے کہ ابھی ان دونوں کے درمیان کچھ ناچاقی ہے تو ابھی دونوں باہم شیر وشکر بن جاتے ہیں۔ تو اس حوالے سے ایک واقعہ شاید دلچسپی سے خالی ہو کہ:

''ایک روز دوپھر کا وقت تھا کہ دونوں شیخین کے درمیان نہ جانے کس بات پر ناچاقی ہوگئی تھی، آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں اپنی اپنی لاٹھیاں اٹھائے ہر ایک دوسرے کو اپنی طرف بلا رہے تھے، ان کی حالتِ غضب سے لگتا تھا کہ دونوں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہوچکے ہیں، اب شام ڈھلے ہم کیا دیکھتے ہیں کہ شیخ صاحب مفتی صاحب کے قریب بیٹھے ہیں اور دونوں سرگوشی اور کاناپوسی کے ساتھ پان چبا رہے ہیں، ان کی یہی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب کی انتہا ہوگئی تھی، غرض ان دونوں کے مابین کے ناطے دیکھے جانے کے قابل تھے''۔

ظاہر ہے کہ حضرت مفتی ابوالفضل صاحب جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے بانیوں میں سے ایک

ہیں، لیکن آپ ہمیشہ حضرت شیخ صاحب کو اس ادارہ کے گویا وارث اور ایک عظیم محسن ہونے کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، اس بات کے حوالے سے بطور استشہاد حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا ایک بیان حاضر ہے کہ:

''حضرت مفتی صاحب کی موجودگی میں ایک روز جامعہ اسلامیہ عالیہ کے کسی ایک منتظم سے حضرت شیخ صاحب ناراض ہوکر جامعہ چھوڑنے جا رہے تھے، اور ساتھ ساتھ فرما رہے تھے کہ اب تک بہت ہوگیا، مجھے مزید یہاں رہنا گوارہ نہیں۔ تو حضرت شیخ کی یہی حالت دیکھ کر حضرت مفتی صاحب آگے بڑھتے بڑھتے فرما رہے تھے کہ: شیخو! تم اپنی جگہ پر بیٹھے رہو، یوں اپنے مدرسے کو کن اوباشوں کے سپرد کئے جا رہے ہو؟ اب حضرت مفتی صاحب کی اتنی سی بات پر شیخ صاحب خاموش ہوکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے''۔

یوں تو شیخ صاحب حضرت مفتی صاحب کی طرح ہمیشہ مدرسے میں رہتے تھے، کبھی کبھار ہی گھر جایا کرتے تھے، لیکن کبھی آپ کے مدرسے آنے میں دیر ہوجاتی تو مفتی صاحب تڑپ کر رہ جاتے تھے، اور طلباء واساتذہ سے پوچھنے لگتے کہ کہیں شیخ صاحب بیماری میں مبتلا تو نہیں ہوگئے؟ اسی طرح مفتی صاحب کے متعلق شیخ صاحب کی بھی یہی حالت ہوتی تھی۔

غرض حضرت شیخ صاحب نے اپنی مستعار زندگی کے آخری دم تک جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درس دیتے ہوئے ۱۹۸۵ء میں انتقال فرمایا، اور اپنی آبائی بستی باغکونہ کی قبرستان میں مدفون ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت کی نمازِ جنازہ میں ہزاروں لوگوں نے سوگوار شرکت کی، خود راقم سطور اور مولانا حسین احمد صاحب جو آپ کے ارشد تلمیذ ہیں کو بھی اس میں شرکت کرنے اور آپ کے کفن دفن میں ہاتھ بٹانے کی توفیق ہوئی تھی، علاوہ ازیں اس میں علماء اور طلبائے دینی مدارس کی بھاری اکثریت دیکھی گئی تھی، دعا ہے کہ اللہ تعالی اپنے خاص فضل وکرم سے حضرت شیخ کی مغفرت کے ساتھ آپ کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری تمنگ چنگیؒ

سرزمین ارکان کے مفکر عالم دین، مبصر، سیاسی اور منتظم حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری بن وصی الرحمن ۱۹۳۱ء میں بوسیدنگ شہر کی شمالی مغربی جانب واقع قدیم مسلم رہائشی بستی تمنگ چنگ میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ میں پائی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے چند سال پڑھ کر ۱۹۵۴ء میں سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد وطن واپس آئے۔لیکن وطن پہنچتے ہی آپ کی شادی خانہ آبادی کے متعلق کچھ نا قابلِ بیان امور سامنے آگئے تو آپ دوبار ہندوستان گئے، اور دار العلوم دیوبند میں دو سال دورۂ تفسیر کی تکمیل کر کے پھر وطن آ گئے تھے۔

اب کی بار وطن آتے ہی آپ نے شادی خانہ آبادی کی سنت ادا کی، اور حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب ندوی سانگری بیلی کی بیٹی سے آپ کا نکاح ہوگیا۔اس کے بعد علاقے کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے، بالآخر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے مدرس بنے، پھر وقت گزرنے پر آپ کی انتظامی صلاحیات سامنے آئیں تو جامعہ کی مجلس شوری نے آپ کو اس کا مہتمم بنایا، یوں آپ نے اس دینی درس گاہ کی تعمیر و ترقی کے حوالے سے دور دراز کے کئے سفر کئے، اس سلسلے میں بارہا برما کے دار الحکومت رنگون کے علاوہ سعودی عرب کے مختلف دورے کئے، آپ کی مسلسل جدو جہد سے الحمدللہ اس محسن ادارہ کی خاصی ترقی ہوئی تھی۔

اگر چہ مولانا بعد میں مع اہل خانہ رنگون چلے گئے تھے، لیکن عرصۂ دراز تک جامعہ اسلامیہ بوسیدنگ کے منصبِ اہتمام پر برقرار رہے تھے، بعد میں جہاں تک مجھے یاد ہے کہ آپ نے اپنی ذمے داری حضرت مولانا ابو الحسین صاحب کوائندنگی کی سپرد کی، تاہم ہر حالت میں اس محسن ادارہ کی ترقی اور کامیابی کے لئے کوشاں رہے۔

۱۹۹۲ء کا واقعہ تھا کہ مولانا حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے علاوہ جامعہ اسلامیہ عالیہ کی فلاحی پروگرام لئے حجازِ مقدس گئے، واپسی پر بنگلادش اترے اور چاٹگام آئے تھے، اسی دوران آپ سے مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کی رہائش گاہ میں ملاقات ہوگئی تھی، اس ملاقات کے دوران آپ نے مجھے مستقل طور پر رنگون جانے کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ:

’’مولوی طاہر! تم جیسوں کے لئے رنگون کی سرزمین بڑے کام کی ہے، اور تمہاری وہاں خاصی ضرورت بھی، میں جانتا ہوں کہ وہاں تم سے جو کام ہو سکے گا اس کا امکان بنگلادیش میں بہت ہی کم ہے، اور جہاں تک میں دیکھ رہا ہوں کہ وہاں تمہارا مستقبل بہت روشن ہے، منظور ہو تو اس حوالے سے میری خدمات حاضر ہیں، میں اصرار سے کہہ رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو، ورنہ یاد رکھو کہ ایک دن تجھے میری بات ستائے گی‘‘۔

مولانا بڑی نستعلیقی کیفیت کے بزرگ تھے، افتادِ طبع اور مزاج کے اعتبار سے آپ کو ایک خوش طبع انسان کہنا آپ کا حسبِ حال تھا، ہماری طالب علمی کے زمانے میں آپ جامعہ اسلامیہ عالیہ کے مہتمم تھے، آپ جبھی جامعہ میں تشریف لاتے تو فوراً چند بزرگ ترین شخصیات آپ کے گرد جمع ہو جاتی تھیں، جن میں سے درج ذیل شخصیات ناقابلِ فراموش ہیں:

۱۔حضرت مولانا ابوسعید صاحب ہولی مرنگی، ناظم برائے امور تعلیمات، جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ۔

۲۔جناب ماسٹر عزیز احمد صاحب بن حضرت مولانا اصحاب الدین صاحب زادی فرانگی، بوسیدنگی۔

۳۔جناب الحاج عبدالمطلب صاحب رواسوگری، بوسیدنگی۔

مذکورہ تینوں حضرات بشمول مولانا مظاہری صاحب جبھی ایک جگہ جمع ہوتے تو محفل میں چار چاند لگ جاتے تھے۔نہ جانے یہ حضرت آپس میں کیا کچھ کہتے تھے، ہنستے، مسکراتے اور کبھی کبھار آپس میں سر گوشیاں بھی کرتے تھے، دیکھ کر ہمیں بھی اچھا لگتا تھا۔

حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری اور حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب کے مابین ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا، دونوں بزرگوں کے آپس کی محبت دیکھی جانے والی تھی، یہاں تک دیکھا گیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان اتنی بھائی چارگی اور دوستی تھی کہ جسے دیکھ کر اکثر لوگ کہا کرتے تھے کہ کہیں یہ دونوں آپس میں بھائی تو نہیں ہیں؟ ہماری طالب علمی کے زمانے میں حضرت مفتی صاحب کافی عمر رسیدہ تھے، پھر بھی ہم نے جہاں تک دیکھا کہ جبھی حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب جامعہ تشریف لاتے تو حضرت مفتی صاحب کے چہرے میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔

اللہ تعالی نے حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب کو چند بیٹیوں سے نوازا، جب کہ حضرت مفتی صاحب کو زیادہ اولادِ نرینہ عطا کی، سن رکھا تھا کہ جبھی مفتی صاحب کے گھر مولانا حسین احمد صاحب پیدا ہوئے تو حضرت مظاہری صاحب نے مفتی صاحب سے گزارش کی کہ مفتی صاحب ! آپ ازراہ کرم حسین احمد کے بدلے مجھ سے اپنی ایک بیٹی لئے لیں، تو اس بات سے ظاہر ہے کہ ان دونوں کے مابین کتنی بھائی چارگی، محبت اور کیسا لگاؤ تھا۔

جہاں تک اندازہ ہوا تھا کہ مولانا مظاہری صاحب کو اپنے لائق شاگرد مولانا حسین احمد کی لیاقت وصلاحیت، قابلیت واستعداد پر نہایت اعتماد اور بھروسہ تھا، چاٹگام کی مذکورہ ملاقات میں دورانِ گفتگو ایک موقع پر فرمانے لگے تھے کہ "حسین احمد! خدا کرے تو تم ہمارے اکابر کی لاج رکھوگے"۔

حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب ایک بڑے عالم اور قوم کے بڑے خادم بزرگ تھے، آپ نے اپنی مستعار زندگی میں دین وملت اور قوم ووطن کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں، آپ رنگون میں عرصۂ دراز تک علالت میں مبتلا رہے، اور آخر کار ۲۰۲۱ء میں داعئ اجل کو لبیک کہتے ہوئے اس جہانِ فانی سے رخصت لے چلے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا مظاہری صاحب کی اولاد میں محمود الحسن صاحب ایک زیرک اور قومی امور کے حوالے سے فکرمند دانشور ہیں، عرصۂ دراز تک رنگون سمیت ملک کے دیگر علاقہ جات میں اقوام متحدہ کے تحت مختلف رفاہی کام کرتے رہے تھے، لیکن افسوس ہے کہ ان کو ملک کے سیاسی حالات کے شکار ہوکر وطن چھوڑنا پڑا، آج کل تھائی لینڈ کے دارالحکومت بنکاک میں عارضی طور پر مقیم ہیں۔ علاوہ ان کے مولانا کی اولاد میں برادر عزیز مولوی اکرام الحسن صاحب مقیم حال مکہ مکرمہ بھی ماشاء اللہ تعالی ایک عالم اور مجاہد فی سبیل اللہ ہیں، عرصۂ دراز تک ہماری زیرزمین کام کرنے والی تنظیم "روہنگیا اسلامی محاذ" کے سرگرم رکن رہے، جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلے میں افغانستان بھی گئے، اور دشمنانِ اسلام کے خلاف ہونے والے جہاد میں بھی شرکت کی، مولوی اکرام صاحب حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے حالیہ خیر اندیش ساتھیوں میں سے ایک ہیں، ماشاء اللہ بڑے بااخلاق اور نہایت خوش مزاج ہیں۔ اللہ تعالی سلامت سے رکھے۔

حضرت مولانا ولی احمد صاحب خیرمورہ فارویؒ

مولانا ولی احمد بن علیم اللہ بن عبد الحمید بن علیم الدین شاہ صاحب کی ولادت ۱۹۴۵ء میں جنوبی بوسیدنگ کی معروف ومردم خیز مسلم بستی خیرمورہ فارا میں ہوئی، یہ بستی شہر بوسیدنگ سے کوئی بارہ میل کے فاصلے پر کوہِ مایو کے مشرقی ڈھلوان پر صدیوں سے آباد ہے، دورِ آخر میں اس بستی سے بڑے بڑے علماء اور خادمانِ قوم پیدا ہوئے، جن میں مولانا ولی احمد صاحب کے علاوہ مولانا رشید احمد صاحب، مولانا محبت علی صاحب، مولانا نور محمد بن علیم اللہ صاحب اور صدیق مکرم مولانا جمال احمد صاحب مقیم حال ولایاتِ متحدہ امریکہ نمایاں شخصیات ہیں۔

مولانا ولی احمد صاحب کے والد گرامی علیم اللہ صاحب ایک کاشتکار آدمی تھے، علماء، صلحاء اور طالبانِ علوم نبوت سے نہایت محبت کرنے والے بزرگ تھے، اور آپ کے والدۂ مرحومہ رقیہ بنت نور الزمان نہایت سنجیدہ اور عابدہ خاتون تھیں۔

مولانا ولی احمد صاحب کی مکتب نشینی اپنی آبائی بستی کے مکتب میں ہوئی، اس کے بعد مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے جماعتِ سیوم تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مشرقی پاکستان گئے اور مدرسہ اسلامیہ چاریہ۔ شمالی چاٹگام۔ میں جماعت دوم اور اولی کی تعلیم پائی، اس کے بعد دورۂ حدیث کے لئے چاٹگام کی معروف درس گاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری میں داخلہ لیا، یوں یہاں ایک سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغتِ تعلیم کے بعد آپ وطن لوٹے، ابتدا میں علاقے کے دو ایک مدارس میں تعلیم دی، پھر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں مدرس بنے، یہاں ابتدائی مگر ضروری کتابوں سے لے کر منتہی تک کی کتابوں کا درس دیتے رہے تھے۔

نہ جانے کیوں کہ آپ نے مع اپنی اولاد واہل مغربی پاکستان ہجرت کی، اور مدت دراز تک کراچی میں مقیم رہے، یہاں آپ نے امامت وخطابت کے تہ بتہ مختلف دینی مدارس میں تعلیم دی، اس کے بعد مع اہل خانہ سعودی عرب جانا مناسب سمجھا تو بڑی کوشش سے سرزمین مقدس مکہ مکرمہ پہنچ گئے، یہاں بھی آپ نے اپنے انتقال تک مختلف مساجد کی امامت کے ساتھ ساتھ چند دینی مدارس میں مسلم بچوں

کی تعلیم دی، بالآخر سرزمین ارکان کے اس بزرگ ترین عالم دین نے ۲۰۱۵ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اور خاک مقدس مکہ مکرمہ میں مدفون ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی اہلیہ محترمہ حافظ نور احمد یونگ چنگی کی صاحب زادی ہیں، تادم تحریر زندہ اور سلامت سے ہیں، مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں، جن کے بطن سے مولانا کے چھ اولاد نرینہ اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔

مولانا نور محمد (برادر عزیز حضرت مولانا ولی احمد صاحب) کے بیان کے مطابق مولانا ولی احمد صاحب نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں، لیکن تادم تحریر ان میں سے کوئی بھی تصنیف آج تک منظر عام پر نہیں آسکی، خدا معلوم ہے کہ آپ کی ان تصانیف کا کیا حال ہے؟

ادھر راقم سطور نے بھی اپنے عنفوان شباب میں (وہ جماعت پنجم یا چہارم کا طالب علم اور جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں پڑھتا تھا) آپ کی ایک تصنیف حضرت مولانا شاہ ابوسعید صاحب ہولی مرنگی (خلیفہ ومجازِ بیعت حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی) کے پاس دیکھی تھی، جہاں تک یاد ہے کہ یہ تصنیف فن نحو کی معروف اور ہمارے مدارس میں متداول نصابِ تعلیم کی کتاب ''کافیہ'' کی شرح ہے، چوں کہ مولانا ہولی مرنگی صاحب اس زمانے میں شاید بعد میں بھی ہوں کہ کافیہ اور شرح ملا جامی کے استاد تھے، اس لئے یہ شرح ہمیشہ ان کے پاس رہتی تھی، یہ مخطوطہ شرح مجھے پڑھنے کی نوبت تو نہیں ہوئی، لیکن بس دیکھنے کی حد تک جہاں تک یاد ہے کہ مولانا ولی احمد صاحب کی تحریر میں نہایت جدت وندرت تھی، خط بڑا خوش نما تھا، شاید آپ خطاط نہ بھی تھے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ خوش نویس ضرور تھے، آہ! آج آپ کے ساتھ ہی ساتھ استاد محترم مولانا شاہ ابوسعید صاحب بھی اس دنیا میں نہیں ہیں، نہ جانے آپ کی تصنیف کردہ اس مخطوط شرح کا کیا حال ہے؟

مولانا ولی احمد صاحب کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا ابوسعید صاحب کے علاوہ بہتوں سے بہت کچھ سن رکھا، ان تمام سنی سنائی باتوں کو سردست یک جا کرنا آسان کام تو نہیں ہے، تاہم ان سب کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ حضرت مولانا ایک جلیل القدر عالم دین، ماہر علوم وفنون، ایک مستعد وقابل مدرس ومعلم، نہایت بلند اخلاق اور عالی صفات وکمالات کے بزرگ تھے، ساتھ ساتھ زاہد وعابد اور دل دردمند اور فکر ارجمند کے حامل شب زندہ دار ولی اللہ بھی۔

حضرت مولانا تمیز الرحمن صاحب گوفیوی

سرزمین ارکان کے بزرگ ترین عالم دین حضرت مولانا تمیز الرحمن صاحب کی پیدائش شمالی بوسیدنگ کی مسلم بستی گوفی میں ہوئی، علاقے کے دینی مدارس سے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم پا کر بنگلا دیش کی معروف دینی درس گاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں داخلہ لیا، اور وہیں سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد آپ وطن لوٹے، اور جامعہ اسلامیہ عالیہ میں درس دیتے رہے، ہمارے زمانے میں آپ ابتدائی، متوسطہ اور درجۂ علیاء کی مختلف کتابیں پڑھاتے تھے، مولانا حسین احمد کے علاوہ راقم سطور بھی آپ کے شاگردوں میں سے ہے۔ جہاں تک میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ نہایت ذکی الحس، باشعور عالم دین اور نہایت قابل مدرس ومنتظم تھے، آپ اپنے حصے کی کتابیں بڑی خوش اسلوبی سے پڑھایا کرتے تھے، اور جتنے بھی پڑھاتے، طلباء کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

مولانا جامعہ اسلامیہ عالیہ کے عرصۂ دراز تک ناظم برائے امور تعلیمات رہ چکے تھے، حتی کہ ''ناظم صاحب'' آپ کا نام بن چکا تھا، آپ وقت کے نہایت پابند تھے، طلباء کی غیر حاضری کبھی اور کسی بھی حالت میں آپ کو برداشت نہیں تھی، دل کے سچے، کم گو مگر زبان کے پکے عالم دین ہیں۔

مولانا نے ۱۹۸۳ء میں وطن عزیز سے ہجرت کی، سبب یہی تھا کہ ایک روز آپ اپنی عارضی رہائش گاہ ''بوسیدنگ ریلوے والے محلے'' سے معمول کے مطابق جامعہ کی طرف آرہے تھے، راستے میں ایک بدمعاش قسم کے بدمزاج بودھ بھکشو جو دوسری جانب سے آرہا تھا کے سائے پر آپ کا قدم پڑا تو بھکشو نے آگ بگولہ ہوکر زبان درازی کے ساتھ آپ پر ہاتھ رنگانے کی کوشش کی، تو آپ بھی چھوڑنے والے کب تھے؟ حتی کہ آپ نے اس بھگوڑے کی ایسی پٹائی کی کہ وہ لہولہان ہوگیا، اب معاملہ ایسا بگڑا کہ دیکھتے ہی دیکھتے مذہبی رنگ اختیار کرگیا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس معاملہ کی وجہ سے آپ کا یہاں جینا دوبھر ہوگیا تھا، ویسے آپ نے غیرت میں آکر وطن سے مع اہل وعیال ہجرت کی۔

بہر حال مولانا وطن سے ہجرت کر کے مع اہل وعیال سرزمین مقدس مکہ مکرمہ پہنچے، راقم سطور نے وہاں آپ سے چند مرتبہ ملاقاتیں کیں، جبھی ملنے جاتا نہایت مسرت کا اظہار کرتے تھے۔

حضرت مولانا نور احمد صاحب زادی فرانگیؒ

ہمارے اساتذہ میں سے ایک بڑے عالم دین، قابل قدر مدرس ومعلم حضرت مولانا نور احمد صاحب کی پیدائش شمالی بوسیدنگ کی معروف ومردم خیز مسلم بستی زادی فرانگ میں ہوئی، روایت کے مطابق آپ کی ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی میں ہوئی، اس کے بعد علاقے کے مختلف دینی مدارس میں متوسطہ کی تعلیم پائی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان کا سفر کیا، اور معروف روایت ہے کہ آپ نے دارالعلوم دیوبند میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد مولانا سیدھے اپنے وطن آئے، اور علاقے کے مختلف دینی مدارس میں تعلیم دیتے رہے، آپ مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے علاوہ میرے بھی شفیق استاد ہیں، پڑھاتے وقت دیگر اکثر مدرسین ومعلمین کرام کے برعکس ہمیشہ کتاب کے موضوع میں رہتے، اور درس میں طول طویل تقریر سے نہایت پرہیز کیا کرتے تھے، کان کے تھوڑے بہرے تھے، لیکن بڑے باشعور اور حساس، آپ نے عرصۂ دراز تک جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں علم دین اور طلبائے علوم دینیہ کی خدمت کی، اور وہ بھی بڑی شان اور آن بان سے۔

مولانا ایک جلیل القدر عالم دین ہونے کے علاوہ درویش صفت انسان تھے، جہاں تک میں نے دیکھا کہ آپ نماز بڑے اطمینان سے ادا کرتے، اور رات کے آخری حصے میں تہجد کے لئے بڑی پابندی سے جاگ جایا کرتے تھے، یوں ایسے بزرگوں کو ایک عالم دین کے ساتھ ساتھ عابد وزاہد بھی کہا جا سکتا ہے، ماشاء اللہ بڑے شب زندہ دار انسان تھے۔

مولانا ہماری طالب علمی کے زمانے میں درجۂ متوسطہ اور درجۂ علیاء کے استاد تھے، اور سطور بالا میں جس طرح عرض کی جا چکی ہے کہ آپ کتابیں پڑھانے کے دوران عام مدرسین کرام کے برخلاف طول طویل بحث نہیں کرتے، اور مسئلہ کو ذہن نشین کرا کے آگے بڑھ جاتے تھے، دوران درس باتوں کے بتنگڑ بنانے کی عام روایات جو ہمارے مدارس میں پائی جاتی ہیں، آپ کو ان سے گویا نفرت تھی۔

۱۹۸۴ء کے بعد ہم تو دوسرے ملکوں کے ہو چکے ہیں، خبر اگرچہ لی گئی، لیکن افسوس ہے آپ کے متعلق بعد کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

حضرت مولانا ابوالحسین صاحب کوائندگیؒ

اپنے زمانے میں بوسیدنگ کے معروف عالم دین استاد محترم حضرت مولانا ابوالحسین صاحب کی پیدائش بوسیدنگ کی مردم خیز مسلم بستی کوائندنگ میں ہوئی، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم علاقے میں پا کر ایک مشہور روایت کے مطابق چاٹگام کی معروف دینی، علمی اور روحانی درس گاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

دستور کے مطابق آپ فراغتِ تعلیم کے بعد وطن واپس آئے، اور علاقے کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے، بالآخر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کا مدرس ہوئے، یہاں آپ نے درجۂ ابتدائیہ اور متوسطہ کی مختلف کتابیں پڑھائیں، میں نے بھی آپ سے نور الایضاح کا کچھ حصہ اور نفحۃ الیمن وغیرہ کتابیں پڑھیں، بڑے نیک اور مخلص استاد تھے، طلباء کو سبق یاد کرانے کی بڑی کوشش کیا کرتے تھے۔

ہمارے زمانے میں مولانا نگران برائے امور طلباء (ہاسٹل) تھے، جسمانی اعتبار سے کافی موٹے فربے تھے، لیکن رات کے آخری پہر جاگتے اور طلباء کو بڑے اہتمام سے جگایا کرتے تھے، طلباء کو جگانے کے متعلق آپ کا انداز تھوڑا غصیلا تھا، ایک مرتبہ جگانے کے بعد اگر کوئی طالب علم تھوڑی بھی غفلت کا مظاہرہ کرتا تو پٹ جاتا تھا، بعض طلباء کو آپ کا یہی غصیلا انداز بہت پسند تھا، کبھی کبھار دانستہ طور پر میں بھی آپ کے اس انداز سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔

مدرسی کے زمانے میں مولانا جامعہ اسلامیہ عالیہ کے بغل میں پائی جانے والی شہر کی سب سے بڑی قدیمی جامع مسجد کے امام اور خطیب تھے، آپ کی آواز کافی بلند اور وزنی تھی، جمعہ اور عیدین کے خطبے بڑے میٹھے لہجے اور نرالے انداز میں دیا کرتے تھے، عوام تو عوام بلکہ علماء اور طلباء بھی آپ کی قرأت اور خطبے بہت پسند کرتے تھے، ویسے آپ کو ہر کجا امام صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری مستقل طور پر رنگون منتقل ہو جانے کے بعد جامعہ اسلامیہ عالیہ کے اہتمام کی ذمے داری آپ پر ڈالی گئی تھی، جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی ذمے داری کو بڑی خوبی سے نبھایا تھا، یوں آپ نے ملک وملت اور علماء وطلباء کی مقدور بھر خدمات کر کے ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا شاہ ابوسعید صاحب ہولی مرنگؒ

ہمارے زمانے میں سرزمین ارکان کے ایک بلند پایہ کے مشہور عالم دین، صاحب دل وصاحب نظر بزرگ، عارف کامل حضرت مولانا شاہ ابوسعید صاحب کی پیدائش ۱۹۴۸ء میں بستی ہولی مرنگ میں ہوئی، یہ مسلم بستی شہر بوسیدنگ کی مغربی جانب تقریبا ایک میل کے فاصلے پر زمانۂ قدیم سے آباد ہے، ہمارے لڑکپن کی بات ہے کہ عموما اس بستی کے باشندے سنجیدے تھے، لیکن اخلاقی لحاظ سے ان کے مابین کچھ چور، ڈاکو اور اچکے قسم کے لوگ بھی پائے جاتے تھے، جن کی نازیبا اور غیر عادلانہ حرکات وسکنات کی وجہ سے پورے علاقے کے باشندوں کو کبھی کبھار پریشانی میں مبتلا ہونا پڑتا تھا، خدا معلوم آج کل اس بستی کی کیا حالت ہے؟

مولانا کے والد گرامی مرحوم جلال احمد صاحب نہایت سادہ لوح، علماء دوست اور طلباء پسند بزرگ تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ میں جب کسی عالم یا طالب علم کو دیکھتا ہوں کہ اسے میرا بیٹا ابوسعید جیسا لگتا ہے۔ اور مولانا کی والدہ بھی بہت ہی سیدھی سادی اور پاکیزہ صفات خاتون تھی (۱)۔

مولانا کے خاندان اور خاندان کے دیگر بزرگوں کے متعلق آج لکھنا بڑا مشکل ہے، نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس دودمان عالی مقام ہستی کے خاندان اور اس خاندان کے بزرگوں کے متعلق معلومات میرے پاس نہیں ہیں، تاہم جہاں تک مولانا کے والدین کو دیکھا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاید آپ کے خاندان میں شرفاء اور نجباء کی کمی نہیں تھی۔

---

(۱) حضرت مولانا شاہ ابوسعید صاحب کے والدین کریمین سے مجھے بڑی شفقت اور پیار ملا تھا، نہایت خوش اخلاق اور سیدھے سادے بزرگ تھے، ان دونوں کی یادیں ہمیشہ یاد رکھنے کی قابل ہیں، شام کو مدرسے کی چھٹی کے بعد میں جبھی مولانا کے گھر پہنچتا تو ان دونوں بزرگوں کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے تھے، مغرب کے بعد کھانے کے دسترخوان پر دونوں میرا انتظار کرتے تھے، کبھی میرا وہاں جانا نہیں ہوتا تو سنا تھا کہ مولانا سے پوچھتے تھے کہ آج طاہر آیا کیوں نہیں ہے؟ پھر اگلے دن شام ڈھلے میں پہنچتا تو کہتے تھے کہ طاہر! کل تو کہاں تھا؟ آیا کیوں نہیں تھا؟؟ آہ! آج یہ دونوں بزرگ تو کیا خود مولانا ابوسعید صاحب بھی اس دنیا میں نہیں رہے، ان کی یادیں ستاتی تو ضرور ہیں، لیکن آخر کرنا ہی کیا، سوائے دعاؤں کے۔

مولانا کے ناظرۂ قرآن کریم، مبادیات دینیہ، فارسی اور اردو کے علاوہ بنگلہ کی ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی میں ہوئی، جہاں تک اندازہ کیا کہ آپ کے والدین کو اپنے اکلوتے بیٹے سے حد درجہ محبت تھی، یوں انہوں نے آپ کو بڑے شوق سے تعلیم دلوائی، کچھ بڑے ہوئے تو جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخل کروایا، تعلیمی اعتبار سے اس زمانے میں اس درس گاہ کی نہایت شہرت تھی، جس میں حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب، حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب، حضرت مولانا مشتاق احمد ندوی صاحب، حضرت مولانا ولی احمد صاحب جیسے بلند پائے کے علمائے دین درس دیا کرتے تھے، آپ نے یہ اور ان جیسے دیگر علمائے عظام سے خوب خوب استفادہ کیا، آپ کے بیانات سے معلوم ہوا تھا کہ آپ نے تعلیم کے دوران بڑی محنت اور کافی عرق ریزی سے کام لیا، اپنے سنہرے اوقات کی بڑی قدردانی کی، گویا آپ مدسے کے اور مدرسہ آپ کا بن چکا تھا، بالآخر اسی مدرسے سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ آپ نے مکتب نشینی کے بعد سوائے جامعہ اسلامیہ عالیہ کے کسی دوسری دانش گاہ سے تعلیم حاصل نہیں کی، یوں کبھی کبھار آپ اپنے نام کے آخر میں جامعی بھی لکھا کرتے تھے۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ نے جنوبی بوسیدنگ کی بستی منی بیل کے ایک معزز گھرانے کی ایک خوش خصال خاتون سے شادی کی، جس گھرانے سے آپ کی شادی خانہ آبادی ہوئی، اس گھرانے کے متعلق بہت ساری معلومات میرے ذہن میں محفوظ ہیں، تاہم سردست اتنی سی بات بتا تا چلوں کہ اس گھرانے کے ساتھ ہم اور ہمارے رشتے داروں کے قریبی تعلقات تھے، اور اب بھی ہیں، علاوہ ازیں مولانا کے رشتے کا بھائی مولوی محمد الیاس منی بیلی جو ہے وہ میرا ہم سبق تھا، اس کی وجہ سے میرا اس خاندان کے یہاں کبھی کبھار آنا جانا ہوا کرتا تھا۔

یہاں مولوی محمد الیاس صاحب کا تذکرہ آیا تو ان کے متعلق بہت ساری بھولی بسری باتیں یاد آگئیں، ان تمام باتوں سے قطع نظر بس اتنی سی بات بتا دیتا ہوں کہ مولوی صاحب ماشاءاللہ بڑے محنتی طالب علم تھے، اور نہایت خوش خصال بھی، ہم دونوں مولانا ابوسعید صاحب سے مدرسے میں ایک ساتھ پڑھتے تو تھے ہی، البتہ وہ کبھی کبھار میرے ساتھ شام ڈھلے مولانا کے گھر آتے، اور رات گئی تک میرے ساتھ شریک درس رہتے تھے، نہ جانے آج ان کی کیا حالت ہے۔

میری معلومات کی حد تک مولانا ابوسعید صاحب نے پہلی والی اہلیہ کے انتقال کے بعد (جب کہ ایک روایت کے مطابق خود پہلی والی اہلیہ کی زندگی میں) مرحوم مولوی ابوالکلام لوادنگی کی بیوہ سے نکاح کیا، لیکن قدرت کو اور ہی منظور تھا کہ اس شادی کے چند سال بعد دوسری اہلیہ نے بھی داغ فراغ دیتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، ان دونوں بیویوں کے داغہائے فراغت کے حوالے سے آپ نے راقم سطور سے ایک ٹیلفونک رابطے کے دوران نہایت حسرت و یاس کا اظہار فرمایا، اور ان دونوں کے متعلق ماضی کی بھولی بسری یادوں کا تذکرہ فرمایا تھا، جس سے اندارہ ہوا کہ آپ ان دونوں کی جدائی کے بعد ذہنی طور پر شاید جسمانی طور پر بھی ہو کہ قدرے ٹوٹ گئے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ جامعہ اسلامیہ عالیہ کے مدرس ہوئے، اور حضرت مولا تمیز الرحمن صاحب کی ہجرت کے بعد نظامتِ تعلیم کی ذمے داری آپ پر ڈالی گئی، ہمارے زمانے میں آپ اس ادارے کے گویا سب کچھ تھے، مہتمم حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری صاحب نے گویا آپ کو اس ادارے کا رکھوالا بنادیا تھا، جہاں تک دیکھا اور اندازہ کیا کہ آپ نے اپنی ذمے داری اور فرائضِ منصبی کو بڑی خوبی سے نبھایا، نماز فجر کے معا بعد اور کبھی کبھار پو پھٹے آپ مدرسہ پہنچ جاتے تھے۔

مولانا کے پڑھانے کا ڈھنگ بڑا نرالا تھا، پڑھانے کے حوالے سے آپ بڑے لگن اور محنت سے کام لیتے تھے، طلباء سے آپ کی بڑی محبت تھی، ہر ایک کو اپنی اولاد جیسے سمجھتے تھے، اور طلباء بھی آپ پر جان چھڑکتے تھے، ڈرانے دھمکانے اور ڈانٹ ڈپٹ سے ہمیشہ گریز کرتے تھے، ڈرانے دھمکانے کے انداز کو نہ آپ طلباء کے لئے اور نہ اساتذہ کے لئے مفید سمجھتے تھے، اللہ تعالی نے آپ کی ذات و شخصیت میں خاصی کشش رکھی تھی، طلباء تو خیر طلباء بلکہ بعض وہ اساتذہ جو ہمارے زمانے میں آپ کے اساتذہ نہ تھے، وہ بھی آپ کی شخصیت کے زیر اثر رہتے تھے، لیکن آپ حسبِ مراتب ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے، آپ کے خلاف کسی استاد، طلباء، حتی کہ شہر کے شرفاء و نجباء تک کی کوئی شکایت نہیں سنی گئی تھی، اس طرح آپ کی زبان مبارک سے بھی کسی کے خلاف کوئی حرف غلط صادر ہوتا ہوا نہیں دیکھا گیا تھا۔

میں نے جماعتِ نہم سے لے کر جماعتِ سیوم تک کی تقریبا ساری اہم کتابیں مولانا سے پڑھیں،

نحو، صرف، بلاغت، منطق اور ادب عربی کی اہم متداول کتابوں کے پڑھنے کے علاوہ فقہ و اصول فقہ کے بعض ضروری مضامین کے حوالے سے آپ سے استفادہ کیا، یوں آپ کی لیاقت و استعداد سے اندازہ ہوا کہ آپ کی تعلیمی زندگی کے مراحل جس درس گاہ میں طے ہوئے، اور آپ کو جن جن جید اساتذہ اور صاحبان علم و فضل کی صحبتیں میسر ہوئیں، وہ حقیقت میں بڑے پائے کے اساتذہ اور معلم تھے، جنہوں نے آپ کی فطری صلاحیت کو نکھارا اور سنوارا تھا۔

چلتے چلتے ایک بات یاد آ گئی ہے کہ راقم سطور کی پڑھائی کے حوالے سے آپ کا انداز ہی الگ تھا، آپ یوں تو ہمارے زمانے میں اور بعد میں بھی درجات علیاء کے استاد تھے، لیکن راقم جس جماعت میں ہوتا تھا اس جماعت کی اہم کتابیں آپ اپنے حصے میں لیتے تھے، ان کتابوں کو یوں تو عام طلباء کے ساتھ درس میں پڑھا دیتے تھے، لیکن راقم کے لئے بطور خاص ایک طرح کا معمول بنا رکھا تھا کہ شام کو مدرسے کی چھٹی کے بعد مجھے اپنے ساتھ گھر لے جاتے، اور بعد مغرب دوبارہ مدرسے میں پڑھائے گئے مضامین پڑھاتے اور ذہن نشین کرا دیتے تھے۔

تعجب کی بات تھی کہ مولانا بنگلا زبان بھی بڑی روانی کے ساتھ پڑھتے اور قدر قلیل لکھ بھی لیا کرتے تھے، اس حوالے سے ایک واقعہ یاد آیا کہ جمعرات کی رات تھی کہ بعد العشاء دو معمر شخص (جن کو میں اس سے پہلے نہیں جانتا تھا) آپ کے گھر آئے، جن کے ہاتھ میں ہمارے عبقری قومی شاعر حضرت علاول کی معروف شاعری کی کتاب ''پداوتی'' تھی (یاد رہے کہ ہمارے علاقے میں اس نوعیت کی شاعری کی کتابوں کو ''فوتی'' کہا جاتا ہے، ہمارے زمانے میں گاؤں کے معمر لوگ چراغ جلائے کبھی کبھار اور بطور خاص شادی بیاہ کے موقع پر ذوق وشوق سے پڑھتے اور شائقین سامعین کان لگا کر سنتے تھے، ایک آدمی ترنم کے ساتھ پڑھتے، جب کہ دوسرا اس کا ترجمہ کرتے تھے، اکثر ترجمہ کرنے والا آدمی بڑا عجیب و دلچسپ ہوا کرتا تھا، پڑھنے والے کی پڑھائی سے بڑھ کر مترجم کی زبان میں لذت و حلاوت ہوا کرتی تھی، نہ جانے آج کل کیا حال ہے؟) انہوں نے آپ کے سامنے کتاب کھولی، اور جن جن مقامات کو سمجھنے سے وہ دونوں قاصر تھے، ان مقامات کو آپ سے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے، جہاں تک مجھے یاد ہے کہ آپ نے ان کو ایسا سمجھایا جیسے کہ

وہ عرصۂ دراز سے آپ کے شاگرد ہیں۔

مولانا ایک بلند پایے کے خطیب (واعظ) تھے، جس رات پند ونصیحت کا پروگرام نہیں ہوتا، اس رات بڑی محنت اور لگن سے راقم کو پڑھاتے تھے (اس مخصوص پڑھائی میں کبھی کبھار مولوی محمد الیاس صاحب منی بیلی بھی شریک ہوتے تھے) اور جس رات پند ونصیحت کا پروگرام ہوتا تھا، آپ مجھے اپنے ساتھ لے جاتے اور محفل وعظ کے درمیانی راستے پر چلتے چلتے درس کے کسی اہم موضوع پر بحث چھیڑ دیتے، اور بات کے اواخر میں مجھے ٹٹولا کرتے تھے کہ آپ کی بات کہاں تک ذہن نشین ہو چکی ہے۔

پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ جس طرح مولانا کی ساری تعلیم جامعہ اسلامیہ عالیہ میں ہوئی تھی، اسی طرح آپ کی تدریسی خدمات بھی ساری کی ساری اسی ادارے میں ہوئی تھیں، ماشاء اللہ آپ کے ہزاروں تلامذہ ہیں، جو وطن کے طول وعرض اور خارج وطن میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یوں بھی مولانا جو کچھ پڑھاتے تھے، بڑی محنت اور لگن کے ساتھ پڑھاتے تھے، اور کوشش کرتے تھے کہ طلباء کو آپ کی پڑھائی سے فائدہ پہنچے۔ تو آج خیال آرہا ہے کہ آپ نے جس تندہی اور شفقت و لگن سے اس حقیر کفش بردار کو پڑھایا تھا، شاید دیگر کسی کو پڑھایا ہوگا، اس حوالے سے بھی ایک بات یاد آگئی ہے کہ غالبا ۲۰۰۸ء کا واقعہ تھا کہ ہزار کوشش کے نتیجے میں آپ سے ٹیلیفونک رابطہ ممکن ہوا، تو آپ نے دورانِ گفتگو ایک موقع پر فرمایا کہ:

> ''میری اس پچاس سالہ تدریسی زندگی میں دو غیر معمولی طالب علم میرے ہاتھ لگے، ان میں سے ایک مولوی حسین احمد ابو الفضل جب کہ دوسرا تم ہو، خصوصا تمہارے ساتھ میری بہت ساری تمنائیں، آرزوئیں اور امیدیں وابستہ ہیں، خدا کرے کہ تمہاری ذات سے جو امیدیں اور تمنائیں وابستہ ہیں وہ پوری ہو جائیں، تاہم تم دونوں کے علاوہ ایک اور طالب علم تھا، سلامت اللہ (مرنگناوی، علی چنگی) اس کا نام تھا، لیکن اس سے جو امید تھی وہ بھر نہیں آئی، اللہ تعالی تمہیں مزید فضل وعنایات سے نوازے، آمین''۔

راقم سطور نے مولانا کے دامن تعلیم وتربیت سے وابستہ ہو کر جو کچھ پایا، اور آپ کی کفش برداری کی برکت سے جو کچھ حاصل کیا، وہ کبھی بھی بھولے سے بھلائے جانے کے قابل نہیں، اور تو اور آج جو اس کا

قلم بزرگوں کے تذکرے وتراجم کو زیر قرطاس لانے کے لئے راہوں پر چل پڑا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی نیک تمنائیں اور خصوصی دعائیں اندر ہی اندر کام کر رہی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اگلی زندگی کے ہر قدم پر آپ کی محبت وشفقت کی یادیں مزید پھیلتی پھلتی ہوئی رنگ لائیں گی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس محبت وشفقت صادقہ کی برکت وفیضان ہو کہ آج اس ناکارہ کفش بردار کو آپ کی حیات وکوائف پر قلم اٹھانے کی توفیق اور سعادت نصیب ہوئی ہے، تاہم یہ ایک سچی بات ہے کہ قحط الرجال کے اس دور میں سرزمین ارکان کی اس ممتاز شخصیت اور اس خادم دین وملت کا تذکرہ بڑی درک بینی اور سلیقے سے لکھنا اور مرتب کرنا ضروری تھا، جو ہماری اگلی نسل کے لئے مشعل راہ اور سوغات ہو سکے، لیکن حقیقت حال یہی ہے کہ ایک تو میری یادداشتیں بڑی کم زور ہو چکی ہیں، اس پر مستزاد یہی ہے کہ آپ جیسی ہستیوں پر قلم اٹھانے کے لئے جس استعداد ولیاقت کے ساتھ جن محنتوں کی ضرورت ہے، وہ مجھ ناچیز کی بس کی بات نہیں ہیں، علاوہ ازیں برسوں کی طویل فرقت وجدائی اپنے کام کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ملنے ملانے کی عدم سہولیات دیوار بن کر کھڑی ہیں، آج کل اگرچہ کچھ کچھ سہولت ہو گئی ہے لیکن افسوس ہے کہ آج مولانا اس دنیا میں نہیں رہے، پھر بھی میری امید ہے کہ سردست جتنی بھی خامہ فرسائی کی توفیق ہو رہی ہے، اس کے مطالعے سے ہمارے وطن کی ایک ناقابل فراموش شخصیت کے حالات و نقوش سے قارئین کرام انشاء اللہ محظوظ ہو سکیں گے، دراصل آپ کا تذکرہ لکھنا مجھ ناچیز پر ایک قرض تھا، جسے ادا کرنے کی کوشش اپنی بساط بھر کی گئی ہے، ممکن ہے کہ قارئین کرام کو جذبات کی شکل میں اس میں عقیدت ومحبت کی کچھ غیر ضروری جھلکیاں بھی نظر آئیں گی۔

اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تعالی کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور تذکرے کے مطالعے سے انسان کے علم وعمل میں اضافے کے ساتھ ساتھ ذات وصفات میں حسن نیت، اخلاص و للّٰہیت اور اخلاق وسلوک کی کھونپلیں کھل جاتیں اور آہستہ آہستہ نمو پانے لگتی ہیں، اسی اعتبار سے راقم نے مولانا کو جہاں تک دیکھا، آپ کی صحبت سے جتنا کچھ پایا، آج وہ بلاتردد یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کا مطالعہ اوروں کے لئے کتنا بھی مفید کیوں نہ ہو، مگر ہم جیسوں کے لئے شبِ تاریک میں ایک قندیل نورانی سے کسی بھی معنی میں کم نہیں ہوگا، وہ اس لئے کہ آپ کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی

جاذبیت اور دلاویزی کے ساتھ ساتھ ادب واطوار، زہد وورع، علمی وعملی انہماک، کتاب وسنت کا روحانی ذوق وشوق، بصیرت وفراستِ ایمانی، امانت ودیانت داری، تعلیمی وتدریسی استعداد اور عملی سیرت وکردار کے نقوش دکھائے دیتے تھے، یہ اوران جیسی اعلی صفات کو دیکھ کر بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ اپنے وقت کے ایک قابل قدر مدرس ومعلم، مستعد عالم دین، شریعت وطریقت کے رموز و اسرار سے واقف ودانا اور ایک صاحب دل مرشد تھے، آپ جیسوں پر قلم اٹھاتے وقت دل میں یہی احساس غالب ہوجاتا ہے کہ ایسی ہستیوں کو موضوع سخن بنانا ایک جسارت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، مگر کیا کروں؟ کہ قحط الرجال کے اس عالم میں فرار کی بھی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

۲۰۰۳ء کے کسی مہینے میں مولانا اپنے علاج کے سلسلے میں چاٹگام تشریف لائے تھے، اور آپ کے لائق شاگرد مولانا حسین احمد کی رہائش گاہ میں آپ کا قیام تھا، افسوس ہے کہ آپ کی تشریف آوری کے متعلق مجھے اس وقت خبر ملی جب آپ تشخیص وعلاج کے بعد واپس وطن جاچکے تھے، بعد میں سنا کہ آپ نے میرے متعلق کسی سے پوچھا بھی تھا، تو جس سے پوچھا تھا اس نے شاید دانستہ طور پر ہو کہ لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ کاش اس وقت آپ سے ملاقات ہوئی ہوتی، تو یہ ملاقات آپ سے میری اس مستعار زندگی کی آخری ملاقات ہوتی، اس حوالے سے میں نے آپ کے نام ایک غم نامہ ارسال کیا تھا، جو شاید دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا:

’’گرامی قدر محترم استادِ مکرم حضرت مولانا ابوسعید صاحب مدظلہ العالی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، وبعد:

امید ہے کہ مزاج گرامی عافیت سے ہوں گے۔

آج شہر چاٹگام کی اس نرالی اور البیلی شام میں دعاؤں اور مناجاتوں کے دوران آپ کی بے حد یاد آئی تو صبح زندگی کے تمام دریچے کھل گئے ہیں، یوں تو مجھے جدائی کے پل سے آج تک آپ کی یادیں ستاتی رہتی ہیں، اور ہمیشہ دل چاہتا ہے کہ کسی بھی طریقے سے آپ کے دیدار سے مشرف ہوکے آؤں، لیکن وطن عزیز کی تند وتیز ہواؤں کی کرم فرمائیاں تھیں کہ پیہم کوششوں کے باوجود دیدار کرنے میں آج تک بری طرح ناکام ہوں، دراصل بادِ سموم کی کرشمہ سازیاں تھیں کہ جن کی وجہ سے باپ بیٹے کے

درمیان پائی جانے والی الفت ومحبت شدید سے شدید ترین متاثر ہوچکی ہے، اب میں کیا کروں اور کیا کرسکتا ہوں، سوائے دعاؤں اور مناجاتوں کے، خدا کرے کہ وطن عزیز کے اس خزاں دیدہ چمن پھر بادِ بہار سے آشنا ہوجائے۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ آپ نے ایک سہمے ہوئے اور کم زور طالب علم کو اس کے بچپن میں جس درس خود آگہی سے آشنا کرایا، وہ کبھی بھی بھولے سے بھلائے جانے کے قابل نہیں ہے، جس کا نتیجہ تھا کہ جس نے اس کے قریب قریب مرجھی ہوئی زندگی کے تیور کو ایک البیلے اور نرالے حال میں بدل دیا، اس حوالے سے آج جبھی میں اپنے دل کی گہرائیوں میں اتر کر سوچتا ہوں تو آپ کی ذاتِ عالی مرتبت کے ساتھ ساتھ آپ کی تعلیم وتربیت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، ویسے اس حوالے سے آپ پر جتنی بھی دادِ تحسین اور خراج عقیدت کے گلدستے نچھاور کئے جائیں تو بھی کم ہوں گے، اللہ تعالی آپ کو دونوں جہاں میں سرخرو فرمائے، اور ملت وقوم کے متعلق آپ کی طرف سے کی جانے والی تمام خدمات کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین۔

حضرت! گئے گزرے چند مہینے کی بات ہے کہ سنا تھا کہ آپ وطن مقدس کے اس پار تشخیص وعلاج کے سلسلے میں تشریف لائے تھے، اور مولانا حسین احمد صاحب کی رہائش گاہ میں آپ کا قیام تھا، بات تحقیق کی حد تک پہنچی تو مجھے شدید دکھ ہوا کہ آپ کے دیدار سے مشرف نہیں ہوسکا، دل کو سمجھانے نہیں پایا کہ کہیں آپ مجھ پر ناراض تو نہیں ہیں، ورنہ وجہ کیا تھی کہ یہ غریب الدیار کفش بردار شرفِ باریابی سے محروم رہا؟ دنیا میں کوئی برا مانے یا بھلا، مجھے اس کا کوئی غم نہیں، لیکن میں آپ کی نظر کرم کا شدید محتاج تھا اور اب بھی ہوں، بھلا آپ کی نظر میں میں اتنا سیہ کار کب ہوچکا ہوں کہ کفش برداری کی سعادت تک مجھ سے چھین لی گئی؟ کاش اس وقت لمحہ بھر کے لئے سہی آپ کی زیارت نصیب ہوئی ہوتی، تو میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میرے خزاں دیدہ گلشن میں بہار آئی ہوتی، اب میرا خیال یقین کی حدیں چھوڑ رہا ہے کہ میں ایک گنہگار ہوں، اور اللہ تعالی کے نیک بندوں کی نظروں سے گر چکا ہوں، تو خداوند قدوس کے حضور میری بس یہی التجا ہے کہ وہ اپنے خاص فضل وکرم سے اپنے نیک اور مخلص بندوں کی خدمت اور کفش برداری کی توفیق سے نوازے۔

حضرت! آپ سے امید ہے کہ آپ میرے تمام اساتذۂ کرام، اور بطور خاص حضرت مولانا کوثرؔ صدیقی صاحب (۱) اور حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب (۲) کو سلام مسنون پہنچا دیں گے، باقی آپ سے دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں، والسلام علیکم۔

کفش بردار:

محمد طاہر جمال ندوی

چاٹگام، بنگلا دیش۔

---

(۱) محترم مولانا حمید اللہ کوثرؔ صدیقی صاحب کوائندنگ، بوسیدنگ میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم علاقے میں پاکر رنگون کا سفر کیا، اور وہاں کے کسی مدرسے غالبا جامعہ اسلامیہ صوفیہ سے سندِ فراغت حاصل کی، اس کے بعد وہاں کے ایک اردو اخبار (شاید ''پرواز'' جو اسی زمانے میں رنگون سے نکلتا تھا) سے وابستہ ہو گئے، ماشاء اللہ اچھے کالم نگار تھے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں آپ وطن واپس آئے اور جامعہ اسلامیہ عالیہ میں مدرس مقرر ہوئے، آپ مولانا آزاد سے متأثر اردو کے شاعر، ادیب، صحافی اور انشاء پرداز تھے، عرصۂ دراز تک جمعیتِ علمائے اسلام بوسیدنگ کے مرکزی سکریٹری اور بعد میں صدر بھی رہ چکے تھے، اس کے ساتھ ساتھ ہماری زیر زمین کام کرنے والی ایک معروف تنظیم سے آپ کی وابستگی تھی، اس حوالے سے بنگلا دیش آنا جانا رہتا تھا، بعد میں مع اہل خانہ ہجرت کر کے بنگلا دیش پہنچے، غالبا ۲۰۰۸ء میں چاٹگام میں آپ سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی، آپ نے راقم کی تصانیف پر بڑی خوشی کا اظہار فرمایا تھا، مولانا حسین احمد صاحب سے آپ کی دوستی تھی، ان دونوں کے مابین ملاقاتوں کے علاوہ خط و کتابت بھی جاری رہتی تھی، صدیقی صاحب کے نام سے مولانا حسین احمد کے چند رسالے اگلی سطور میں مراسلات کے باب میں نظر آئیں گے۔ جن سے ان دونوں کی راہ و رسم کا پتہ چلتا ہے، آپ نے غالبا ۲۰۱۲ء میں چاٹگام میں انتقال کیا۔

(۲) استاد محترم مولانا مستفیض الرحمن بن مولانا فیض الرحمن صاحب کی پیدائش باغگونہ، بوسیدنگ میں ہوئی، متوسطہ تک کی دینی تعلیم علاقے کے مختلف مدارس (جن میں مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ بھی ہے) میں پائی، پھر مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام سے سند فراغت حاصل کر کے وطن واپس آئے، علاقے کے مختلف مدارس میں تعلیم دینے کے بعد جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے مدرس ہوئے، ماشاء اللہ بڑے جید عالم دین ہیں، یہاں ابتدائی، متوسطہ اور درجۂ علیاء کی مختلف کتابیں آپ کے حصے میں ہوتی تھیں۔ میرے علاوہ بھی مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے ساتھ آپ کے قریبی تعلقات تھے، اور ہیں، ماشاء اللہ بڑے دل درد منداور فکر ارجمند کے مالک عالم دین ہیں، الحمد للہ تادم تحریر وطن کے اندر حیات سے ہیں۔ اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دے۔ آمین۔

۲۰۰۸ء کے اواخر میں میں سعودی عرب سے چاٹگام پہنچا تو ایک کوشش کے نتیجے میں میرا حضرت مولانا ابوسعید صاحب سے ٹیلفونک رابطہ ممکن ہوا، دراں حالیکہ آپ منگڈو آئے اور اپنے کسی مرید خاص کے گھر قیام فرما ہوئے تھے، اس رابطے کے دوران آپ سے بہت ساری باتیں ہوئیں، جن میں کچھ ذاتی تھیں اور کچھ قومی امور کی، دورانِ گفتگو آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:

''میں نے تزکیہ واحسان کے موضوع پر ایک چھوٹی سی کتاب ''**انوار الفجر فی اوراد المظفر**'' لکھی ہے، جو رنگون سے چھپ کر منظرِ عام پر آچکی ہے، انشاء اللہ مولوی حافظ ابوشمع کے ذریعے تم تک ضرور پہنچاؤں گا، امید ہے کہ یہ کتاب تم ضرور پڑھو گے، اس پر ضروری ملاحظات اور اضافہ وترمیم کے بعد اسے طبع ثانی کی لائق بنادو گے''۔

اگلے ایک مہینے کے اندر مولانا کی کتاب حافظ ابوشمع کے ہاتھوں مل گئی تھی، اور آپ کی تعمیل حکم کے بطور شروع سے آخر تک بغور مطالعہ کیا، اس کے بعد مذکورہ ٹیلفون کے متعلق بعض مندرجات کے علاوہ کتاب کی وصول یابی کے حوالے سے آپ کے نام ایک عریضہ لکھا گیا، یہ عریضہ اگرچہ تھوڑا طویل ہے، لیکن امید ہے کہ قارئین کرام کا ضرور فائدہ ہوگا، بعد میں پتہ چلا کہ یہ عریضہ آپ کے پاس پہنچ گیا، اگرچہ باضابطہ اس کا جواب آپ نے نہیں لکھا، لیکن خبر بھیجی کہ عریضہ دستیاب ہو چکا ہے:

''بخدمت عالی مرتبت حضرت استاد محترم مولانا ابوسعید صاحب (مجاز بیعت حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزویؒ) دامت برکاتکم وفیوضکم العالیہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، وبعد،،،

اللہ تعالی آپ کی ذات اقدس کو ہمارے لئے سدا بابرکت بنائے رکھے، آپ اور آپ کی اولاد، تلامذہ و متعلقین سلامت و عافیت سے رہیں، آمین یارب العالمین۔

میں اللہ تعالی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے اساتذۂ کرام کی فہرست میں آپ کی ذاتِ عالی مرتبت کو شامل فرمایا ہے، آپ نے میری زندگی کی صبح امید میں جو بہاریں بھر دیں، اس کے لئے اگر میں سرتاپا شکر گزار بن جاؤں تو بھی کم ہوں گا، آپ نے اپنی شمع محبت سے میری اندھیری زندگی میں جو روشنی اور توانائی بھر دی وہ آج تک رہی اور خدا کرے تو مرتے دم تک رہے گی، یہ وہی شمع محبت

تھی، جو مشکوۃ ولایت کی توانائی سے جلتی اور سارے جہاں کو روشن اور تاباں کر دیتی ہے، اللہ تعالی آپ کی شفقت کو اپنے اس حقیر بندے کے حق میں سدا جواں رکھے۔

آپ نے اپنے گراں مایہ رسالہ ''انوار الفجر فی اوراد المظفر'' میرے پاس ارسال فرما کر ایک اور بھاری احسان فرمایا ہے، جس نے میرے دل کو ایک خاص قسم کا جلا بخشا اور روح کو منور اور تاباں کر دیا ہے، اس کے مطالعہ سے ایک درماندہ اور خستہ جاں کی اداس اور خزاں دیدہ زندگی میں بہار نو کی امیدیں آئی ہیں:

نو بہارست جنوں چاکِ گریباں مددے
آتش افتاد بجاں جنبشِ داماں مددے

آپ کا میں احسان مند ہوں کہ آپ نے ایک طویل عرصے کے بعد ٹیلیفون کے ذریعے ہی سہی مجھے یاد فرمانے کی تکلیف گوارہ فرمائی، ساتھ ہی ساتھ اپنے گراں قدر رسالہ کو زیور علم وفن سے آراستہ کرنے کا اہل سمجھا۔ تو آپ کا یہی حسنِ ظن اور اعتماد اس تہی دامن علم وفن اور اس راندۂ بارگاہ کے لئے سعادت کے علی الرغم ایک تائیدِ غیبی اور نویدِ خداوندی سے کم درجہ نہیں رکھتا۔

حضرت! آپ کی تالیف پر سرِ دست اتنی سی بات عرض کرنے کی جرأت رندانہ ہے کہ شک نہیں ہے کہ اس کتاب میں آپ کا مدعا اور تعلیمات کی روح سمیٹ کر آ گئی ہے، جس سے سلوک وطریقت کے نہ صرف مبتدی بلکہ اذکار واوراد، شغل ومراقبات کے حوالے سے سالکین منتہی بھی مستفید اور محظوظ ہو سکیں گے، علاوہ ازیں سلوک وطریقت کی بعض ضروری مصطلحات بھی بڑی خوبی کے ساتھ برمحل طور پر آ گئی ہیں، سچ تو یہ ہے کہ آپ نے دریا کو کوزے میں بھر دیا ہے، پھر اس کی دیگر خوبیوں میں سے ایک خوبی یہی بھی ہے کہ یہ رسالہ سلوک وطریقت کے چاروں معروف مسلک ومشرب یعنی چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ (مجددیہ) والوں کے عام افادہ واستفادہ کے حوالے سے ایک چشمۂ حیوان کا درجہ رکھتا ہے، سالکین میں سے ہر مقام کے لوگ انشاء اللہ اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

باقی آپ کے حکم کے مطابق اس کے بعض مضامین کی توضیح وتشریح اور بعض ضروری اضافے کے علاوہ اس میں پائی جانے والی بعض علمی اور فنی فروگذاشتوں کو دور کرنے کی مقدور بھر کوشش کی جا چکی

ہے، الحمد للہ یہ رسالہ دوسرے ایڈیشن کا قابل بن چکا ہے۔

پھر گزارش ہے کہ دراصل اس راہ کے سالکین اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اسلامی تصوف روحانی اور وجدانی احوال کے ساتھ ہی ساتھ ایک عملی اقدام سے عبارت ہے، یونانی دیو مالائی فلسفوں کی طرح صرف لفظی معرکہ آرائی، عقلی موشگافی، لاطائل اور لاحاصل مباحث پر سر دھننے اور جان کھپانے کا نام نہیں ہے، یعنی عملی اقدامات کے ذریعے سالک کو روحانی مقامات طے کرنا ہے، جو ایک مرشد کامل کی رہنمائی اور اس کی روحانی توجہ سے حاصل ہوتا اور ہو سکتا ہے، تاہم اگر کسی نے تکوینی طور پر کچھ حاصل کر لیا ہو تو وہ الگ بات ہے، ورنہ عام سالکین طریقت کے لئے ایک شیخ برحق کی اتباع ایک امر لازمی ہے، اس کلیہ سے میرے خیال میں نہ صرف نادان وناواقف بلکہ علمائے دین بھی خارج نہیں ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ رومیؒ کے سامنے تبریزیؒ کیا معنی رکھتے تھے؟

درحقیقت بات یہ ہے کہ اسلامی تصوف (جسے قرآن کریم کے الفاظ میں تزکیہ اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں احسان کہا گیا ہے) روز اول سے سینہ بسینہ چلے آنے والے سلسلے اور ایک طرح کے مظہر کا نام ہے، جو عملی اقدامات سے حاصل ہوتا ہے، بات یہ ہے کہ سالک وجودی مشرب کا ہو یا شہودی مشرب کا، اسے بقا سے فنا کی طرف، وجود سے عدم کی طرف، اور مکان سے لامکان کی طرف سفر کرتے ہوئے پھر دوبارہ بقائی اور مکانی ہونا پڑتا ہے، اسے اپنے آپ کو خنجر تسلیم ورضا کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را + ہر زماں از غیبِ جانِ دیگر یست

حضرت! چلتے چلتے راقم نالائق اپنے بھولے بسرے ماضی کے کچھ احوال سنا دے تو شاید آپ کے لئے باعثِ مسرت ہوگا، اور مزید دعائیں دینے کا سروسامان بھی، وہ یہ ہیں کہ میں جماعتِ ششم میں آپ کے حلقۂ درس میں شامل تھا، اس زمانے میں میں نے موضع نائن چنگ (منگڈو) والے ایک مرشد کامل حضرت شیخ جمال احمد صاحب (مرید حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی گودام فارویؒ، ومجاز بیعت حضرت مولانا نور محمد خنڈ لی، کیوکتویؒ) کے مبارک ہاتھ پر طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی، جنہوں نے مجھے سلسلہ کے اذکار واوراد اور شغل ومراقبے کی تلقین کی، ویسے اللہ

تعالیٰ کی خاص عنایات اور مرشد کی توجہ سے اگلے پانچ سالوں میں لطائف عشرہ سے آگے بڑھا، اس کے بعد ایک طرف حضرت شیخ اس دنیا سے رحلت فرما گئے اور دوسری طرف میں بھی اعلی دینی تعلیم کے سلسلے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، انڈیا جا پہنچا۔ مرشد برحق کے انتقال کی خبر ملی تو میں نے مرشدنا، و شیخنا و مربینا مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مبارک ہاتھ پر ٹھیک اسی سلسلے پر بیعت کی، حضرت مولانا سے تعلق کی وجہ سے اتنا فائدہ ملا کہ جس کے بیان سے میری زبان وقلم قاصر ہیں، یہاں آپ کے سامنے اس گئی گزری کہانی کے تذکار سے میرا مدعا یہی ہے کہ اب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس جہانِ فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، اس حالت میں میں ایک کس مپرس، مسکین اور بے سہارا ہو گیا ہوں، چوں کہ تصوف اسلامی درحقیقت بارگاہِ ایزدی سے انبیاء علیہم السلام کے مقدس سینوں کے راستے خواص بندوں پر آنے والے فیوض و برکات اور فضل وعنایات کا نام ہے، جو ہمیں ایک شیخ کامل کی توجہ اور رہنمائی سے حاصل کرنا ہے، تو ظاہر ہے کہ میں سرتاپا ایک گنہگار وخطا کار آدمی ہوں، اب آپ سے امید ہے کہ اس حوالے سے میری رہنمائی فرمانے کی تکلیف گوارہ فرمائیں گے، تاکہ میں اس حوالے سے مزید درمزید بے دست وپا نہ رہ جاؤں۔

حضرت! اگر میرے ناقص حافظے نے کوئی کوتاہی نہیں کی تو یہ تھا آپ کے پہلے والے ٹیلیفونک بیان کا خلاصہ کہ:

> ''ہم نے مدرسہ کے نصابِ تعلیم میں علوم اسلامیہ کے ساتھ علوم عصریہ (سائنس اور ٹکنالوجی) کی طرف بھی توجہ دی ہے، جو وقت کا تقاضا بھی ہے اور یہاں کے حالیہ حکام کا مطالبہ بھی، اور میں نے بھی بذاتِ خود عصری علوم کا مطالعہ کیا ہے، اگر مؤخر الذکر علوم کے حامل کسی عامی سے میرا پالا پڑا تو انشاء اللہ جیت میری ہوگی، اور تم ہمارے ممکنہ جدید نصابِ تعلیم کی تشکیل اور اسے عملی جامہ پہنانے کے حوالے سے ممکن تعاون کرنا، اور میں قریبی مدت میں ایک آدمی تمہارے پاس بھیجوں گا، جس کے ہاتھ میں میرا ایک شائع شدہ رسالہ بھی ہوگا، اس کی زبانی تفصیلات سن لینا'' (مفہوم ہے)

حضرت! آپ نے مجھ جیسا درماندہ، اداس وبدحواس اور تہی دامن علم وفن پر اتنا بھروسہ کیا تو پہلی بات یہی ہے کہ میں آپ کے اس جیسے حسن ظن اور اعتماد کا سرے سے مستحق نہیں ہوں، لیکن یہ میرے لئے باعثِ سعادت ضرور ہے، اس حوالے سے میری پہلی گزارش یہ ہے کہ آپ جیسے برگزیدہ انسان کے مبارک کلمات پر کسی قسم کے تبصرہ کی گنجائش ہے اور نہ میرے لئے جائز۔ تاہم پھر بھی بات چوں کہ ملت اور فرزندانِ ملت کی بقاء واز دھار کے متعلق ہے، اس لئے متعلقہ تمام جزئیات سے قطع نظر صرف کلیات کے بطور چند سطور لکھ کر آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں، امید ہے کہ خطاؤں کی اصلاح فرمائیں گے:

۱۔ اس بات میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ارکان میں پائے جانے والے مدارس اسلامیہ کے حالیہ متداول نصاب تعلیم کی فوری تطویر کی شدید ضرورت ہے، پوری تبدیلی کی نہیں، میری رائے میں دراصل یہی نصاب جو درس نظامیہ کے نام سے معروف ہے، اس میں درس کی بعض کتابیں بغیر کسی غور وفکر کے اضافہ شدہ ہیں، جسے درس نظامیہ کی بگڑی ہوئی شکل بھی کہا جا سکتا ہے۔

۲۔ مجموعی طور پر اس نصاب میں قوت مطالعہ کا خیال زیادہ ہے لیکن تحصیل فن کی طرف توجہ بہت کم، چوں کہ دور عباسی کے بعد علوم اسلامیہ میں نادانستہ بلکہ بعض ماہرین کی رائے میں پوری دانستہ طور پر یونان کے ارسطالیسی فلسفہ ومنطق کو داخل کر دیا تو پوری دنیائے اسلام میں علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ یونان کا چرچا ہو گیا، جس کی وجہ سے اس زمانے میں اور اب بھی اسلافِ امت کے اس عظیم کتب خانہ کے مطالعہ اور اس سے افادہ واستفادہ کے لئے منطق وفلسفۂ ارسطو کی مصطلحات کا جاننا ضروری ہو گیا ہے، اس اعتبار سے عرض ہے کہ آپ کے الفاظ میں اگلے ممکنہ نصاب تعلیم میں ایک دو بنیادی کتابوں کو رکھ کر باقی تمام منطق وفلسفہ کی کتابوں کو خارج از نصاب کر دیا جائے۔ چوں کہ فکری طور پر منطق وفلسفۂ یونانیہ روح اسلامی اور اس کے مزاج کا ضد ہے، بلکہ دشمن، اب چوں کہ دشمن گھر گھس چکا ہے اور اس نے اپنے لئے ایک خاص جگہ بھی بنا لی ہے، تو سر دست اس سے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا، اب آپ سے گزارش ہے کہ میری ان معروضات پر خاص توجہ فرمائیں۔

۳۔ حضرت علامہ شبلی نعمانی جیسے ماہرین سے مستفید ہو کر عرض ہے کہ المنطق، تیسیر المنطق، صغری

کبری، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملاحسن، حمد اللہ، شمس بازغہ، رسالہ میر زاہد، صدرا، غلام یحیی، ملا جلال، سلم العلوم، اور قاضی مبارک ہیں تو منطق !نصاب تعلیم کے دسترخوان میں یہ اوران جیسے بن بلائے مہمانوں اور ماہرین تعلیم کے الفاظ میں ان سبزۂ خودرو کو ذہن طالب و مطلوب سے یک سر دھوڈالا جائے۔ تاہم پچھلی سطور میں جیسی عرض کی جا چکی ہے کہ ان میں سے ایک دو بنیادی کتابوں کا انتخاب کیا جائے، جن کے ذریعے ہمارے دماغوں یا گردنوں پر سوار مصیبت کو اتارا جا سکے، اور گلوخلاصی ممکن ہو۔

۴۔ حضرت! خود آپ بھی ملاحظہ فرمائیں! ہمارے اس نصاب میں اتنی منطق و فلسفہ کی کتابیں تو داخل ہیں، لیکن تفسیر القرآن الکریم جو اصل الاصول ہے، اس کی صرف دو کتابیں ہیں بس، اور وہ بھی بیضاوی شریف اور جلالین شریف، ماہرین تفسیر کے مطابق تفسیر بیضاوی کا یہ حال ہے کہ وہ اکثر ہمارے مدارس میں سرے سے پڑھائی نہیں جاتی، اگر کہیں پڑھائی جاتی ہے تو سورۂ بقرہ تک، جب کہ جلالین کو مجموعی طور پر تفسیر کی کتاب کہنے کے بجائے حل لغات القرآن کہنا بجا ہے، ماہرین کے مطابق اس کے اختصار کا یہ حال ہے کہ جلالین کے الفاظ قرآن سے کم یا برابر، اس لئے نصاب میں تفسیر کی کتابیں بڑھا دینے کی اشد ضرورت ہے، اور انتخاب بھی خوب سے خوب تر ہونا لازمی امر ہے۔

۵۔ ماہرین کے مطابق درس نظامیہ کے نصاب میں منطق کی جو کتابیں داخل نصاب ہیں، ان میں منطق کے مسائل سے زیادہ فلسفہ اور امور عامہ کی شکل میں خلط مباحث ہے، جب کہ اس نصاب میں ادب عربی اور انشاء کا درجہ نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے سفارش یہی ہے کہ منطق کی بے کار کتابوں کو نصاب سے ہٹا کر ان کی جگہ ادبِ عربی، انشاء، بلاغت، علم اعجاز القرآن اور تاریخ کے ساتھ حساب اور جغرافیہ وغیرہ جیسے ضروری فنون کا اضافہ کر دیا جائے، اور جہاں تک لسانیات کا سوال ہے، اگر انگریزی اور برمیز کو مساوی نہ ہو تو بھی ایک درجہ ضرور دیا جائے، تاہم اس ضمن میں اس ممکنہ نصاب کی تشکیل دینے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ادب عربی سے بے اعتنائی علوم اسلامیہ سے بے اعتنائی کا عین مترادف ہے، اس لئے ادب عربی کو ممکنہ نصاب میں امتیازی درجہ دیا جائے۔

۶۔ آپ نے اپنے مذکورہ ٹیلیفونک رابطے میں سائنس اور ٹکنالوجی کا تذکرہ فرمایا ہے، اس حوالے

سے میری گزارش یہ کہ ماہرین علوم وفنون جن میں مولانا آزاد بھی ہیں کے مطابق فلسفہ و منطق، سائنس وٹکنالوجی سارے کے سارے فنون ایک ہی تنور کے سوختہ ہیں، منطق و فلسفہ کا منبع یونان ہے تو سائنس و ٹکنالوجی کا مرکز یوروپ، فرق صرف اتنا ہے کہ یونان کا وہ مایۂ ناز فلسفہ و منطق فرسودہ و بے کار رہے، جب کہ ان کے مقابلے میں سائنس وٹکنالوجی بڑی حد تک کارآمد، ماہرین کے مطابق دنیا کو بہر کیف یوروپ کے ان محسنین کا احسان اٹھانا چاہئے، جنہوں نے منطق و فلسفۂ یونانیہ کو چھوڑ کر علوم کشفیاتی، تجربی اور استقرائی کا دروازہ کھولا، ان معروضات سے میرا مدعا یہی ہے کہ بنیادی طور پر ان مذکورہ یونانی و یوروپی تمام فنون کی روح ایک ہے، تاہم مادی اور طبیعی اعتبار سے بہر حال یونانیوں کے بجائے یوروپ والوں کی استقرائی علوم کارآمد۔ اس لئے ہمارے ممکنہ نصاب میں طبیعیات کی ریڈرز داخل کی جائیں، اس حوالے سے مولانا آزاد نے فرمایا کہ یونان کے بے کار اور فرسودہ نظریات کے پرستار ہونے کے مقابلے میں یوروپ کی تجربی اور استقرائی عالموں کا حلقہ بگوش ہونا مفید اور افضل ہے۔ اور عصر حاضر کے اعتبار سے بلاشبہ ضروری بھی۔

۷۔ حضرت! آپ کے بیان کے مطابق نصاب کے حوالے سے حالیہ حکام کی چاہت و مطالبہ کا جہاں تک سوال ہے، عرض ہے کہ میں ان لوگوں کے مزاج سے بخوبی واقف ہوں، مجھے ان پرستاران خدایانِ مادیت سے کچھ امید ہے اور نہ ان پر کوئی بھروسہ، ان حکام سے آپ کا مطلب غیر مسلم ہے تو ظاہر ہے کہ ان پر بھروسہ کرنا ہی عبث ہے، اگر مسلمان ہے تو گزارش ہے کہ میرے ناقص خیال میں ان نام نہاد مسلم حکام جو علم وفن سے نا آشنا ہوں تو ظاہر ہے کہ علم وفن کے حوالے سے ان سے کسی قسم کی بھلائی اور قوم وملت کے حوالے سے دردمندی کی توقع بے کار ہے، آپ بخوبی واقف ہیں کہ علم وفن کے اس معرکے میں ان لوگوں کا کیا عمل دخل ہے؟ وہ لوگ علوم اسلامیہ سے واقف ہیں نہ علوم عصریہ سے باخبر، سراسر نادان اور حشب مسندہ ہیں، ان کی رائے اور مطالبہ سے علمائے اسلام کو کیا لینا دینا؟ علماء اپنی توقع ان سے وابستہ رکھیں تو یہ ان کی بے مائیگی اور کم ظرفی ہوگی۔

میری سمجھ کی حد تک وہاں پائے جانے والے نام نہاد دانشوروں کا جہاں تک تعلق ہے، یہ لوگ مغربی ہیں نہ مشرقی، نہ مغرب کے صحیح معنی میں پرستار بن سکے اور نہ مشرقی علوم کے حقیقی معنی میں

عقیدت مند، میری نظر میں یہ لوگ نہ رند ہیں نہ پارسا، آپ نے شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا تذکرہ فرمایا تھا، شاعرِ مشرق اور ان جیسے دانشوران تو مشرقی تھے، مگر تیور مغرب سے بخوبی واقف، بلکہ ناقد، ہمارے یہاں والے تو نہ رندانِ مغرب کے تیور سے واقف ہیں اور نہ زاہدانِ مشرق کے شیوہائے پارسائی سے باخبر، میری نظر میں یہ لوگ سراسر ناسمت شناس مسافر اور ناعاقبت اندیش ہیں، ویسے ان لوگوں پر اعتماد علمائے اسلام کے لئے علمی وفکری خودکشی کا مترادف ہوگا، تاہم میرے اس کلیہ سے دو ایک حضرات خارج ہوں تو میں سردست ان سے واقف نہیں ہوں۔

لیکن میری ذاتی رائے میں اس وقت ان دونوں طبقوں سے کلی طور پر فرار اور علیحدگی کی گنجائش ہے نہ ضرورت، اب علمائے کرام میں سے وہ حضرات جو علوم عصریہ و مادیہ کے مادی مزاج اور علوم اسلامیہ کے روحانی مزاج کے عناصر ترکیبی اور ان دونوں قسم کے علوم وفنون کی حدود اربعہ سے پورے واقف ہوں، ان کے لئے امر لازمی ہے کہ ان دونوں مذکورہ طبقوں سے کلی طور پر علیحدگی کے بجائے ان کے ممکنہ مادی تعاون سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمات انجام دیں۔

حضرت! مجھے معلوم ہے کہ وہاں کی زمین ان گزارشات کے حوالے سے بڑی پرخار اور سنگلاخ ہو چکی ہے، پھر بھی ایک راہ نکالنی ضرور ہے، راستہ بنا کر چلنا ہے مگر قدم سنبھال کے، ورنہ چل تو کسی طرح سکیں گے، لیکن پاؤں میں چھالے پڑ جائیں گے، دراصل میری معروضات کا حاصل یہی ہے کہ جس حوالے سے ہم بات کر رہے ہیں، یہاں نہ ان نادان حکمرانوں کا کوئی کام ہے اور نہ ان نام نہاد دانشوروں کا، علمی اور فکری اعتبار سے جامد علماء بھی اس کلیہ سے خارج نہیں ہیں۔ یہاں کام ہے صرف اور صرف عالم جسم توانا، چشم بینا، صاحبانِ علم ویقین اور ایمان وفراست کا، ان سے کام لینا ہوگا مگر جوش و جذبات سے دور، اور ہوش سنبھا کے۔

۸۔ حضرت! آپ کا بھیجا ہوا آدمی سے ملا، حکم کے مطابق اس کی زبانی آپ کے حالات تفصیل سے سنا، جہاں تک اندازہ کر سکا کہ آپ آج کل بڑے اداس، سہمے ہوئے اور بے حد صدمہ رسیدہ ہیں، کیوں نہ ہوں؟ کہ یکے بعد دیگرے دو دو اہلیہ کے انتقال کے حادثے، جن کا تذکرہ آپ نے مذکورہ ٹیلیفونک رابطہ میں بھی کیا تھا، مجھے ذاتی طور پر ان حوادث کا شدید رنج اور بے حد افسوس ہے،

جہاں تک آپ کی پہلی والی اہلیہ مرحومہ کا تعلق ہے، میری زندگی میں ان سے بڑی شفقت اور ماں کا ممتا ملا تھا، مجھ پر ان مرحومہ کا جو احسانات ہیں وہ کبھی بھی بھولے سے بھلائے نہیں جا سکتے، آج مجھ گنہگار سے کیا بن سکتا، سوائے دعائے مغفرت کے، اللہ تعالی دونوں کی مغفرت فرمائے، اور اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا کرے، اور آپ سمیت آپ کی تمام اولاد و متعلقین کو صبر وثبات کی دولت سے نوازے، آمین۔

۹۔ حضرت! آپ کے بیان سے جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنے مدرسہ والوں کی حرکات و سکنات پر مطمئن نہیں ہیں، اس بارے میں آپ کے حالات حد سے زیادہ پریشان کن نہ ہو تو قابل اطمینان بھی نہیں ہیں، منگڈو کے متعلقین کی طرف سے وہاں ایک خانقاہ کی تعمیر کی جو پیش کش ہوئی ہے، میرے نزدیک قدرے اطمینان بخش ہے، یوں بھی اللہ والوں کے لئے خانقاہی زندگی بڑی پرسکون ہوا کرتی ہے، ادھر آپ کی زندگی کی شام ہونے آرہی ہے، مدرسے کی ذمے داریوں کے ساتھ درس و تدریس نہ سوجھی تو آپ کے لئے کیا ہی اچھا ہوگا کہ خانقاہ میں بیٹھ کر رشد و ہدایت کی خدمات انجام دیں، ویسے آپ خود بھی عبادت الٰہی میں یکسو ہو سکیں گے اور عوام کے لئے بھی آپ کی یہی یکسوئی تلقین وارشاد کے حوالے سے مفید اور سزاوار ہوگی۔

۱۰۔ حضرت! میں اپنے بعض ناقابل بیان مشکل حالات کی وجہ سے آپ کے حکم کے مطابق جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے خیرخواہوں سے گفتگو نہیں کر سکا، اگر حالات قابل اطمینان ہو جائیں گے تو انشاءاللہ تعمیل حکم میں دیر نہیں ہوگی۔

آخر میں آپ کی دلی توجہ کی درخواست ہے، امید نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ ماضی کی طرح اس کفش بردار کو اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد فرمائیں گے، میرے والدین اور میرے بچوں کے حق میں خاص دعا کا متمنی ہوں، معروضات میں کہیں گستاخی ہوگئی تو عفو و درگزر کی درخوست ہے۔ والسلام علیکم۔

کفش بردار:

محمد طاہر جمال ندوی

جدہ، سعودی عرب

۱۱رجنوری/۲۰۰۹ء

اس کے بعد میرا اور ایک مراسلہ جسے میں موخر الذکر مراسلہ کے تقریبا دو سالوں کے بعد ارسال کیا تھا، اس پر بھی نظر ڈالنے کی زحمت گوارہ کریں:

گرامی قدر محترم استاد مکرم حضرت مولانا ابوسعید صاحب دامت برکاتہم (مجاز بیعت حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی قدس سرہ)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امابعد،،،،

امید ہے کہ مزاج گرامی عافیت سے ہوں گے۔

عرض ہے کہ آج تک دو سالوں سے زیادہ مدت گزر چکی ہے کہ آپ کے نام خاکسار نے اس کی زندگی کا دوسرا عریضہ ارسال کیا تھا، نہ جانے دستیاب ہوا ہے کہ نہیں؟ تاہم پہلے والے عریضہ کے متعلق اتنا سا اشارہ ضرور ملا کہ دستیاب ہوا ہے، لیکن دوسرے والے کی دستیابی اور عدم دستیابی کے متعلق کسی بھی قسم کے عندیہ نہ ملنے پر محسوس ہو رہا ہے کہ شاید دستیاب نہیں ہوسکا، چوں کہ دوسرا عریضہ خاکسار کے ناقص خیال میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، اسی لئے زیر تحریر عریضہ کے ساتھ دوبارہ بھیج رہا ہوں۔

حضرت! میں اگرچہ سرتاپا خطاکار ہوں، اور بعض کرم فرماؤں کے نزدیک ناآشنائے ادب بھی، پھر بھی اتنا ضرور ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں آپ اور آپ جیسی دیگر برگزیدہ ہستیوں کی کفش برداری ضرور کی ہے، تو بزرگوں کی کفش برداری کرنے والا ایک آدمی راہ ورسم ادب سے ناآشنا ہوسکتا بھی تو کتنا؟ اور تو اور آپ کی مبارک ذات وشخصیت خود بھی گواہ ہے کہ میں نے اپنے عنفوانِ شباب میں آپ کی کفش بردای کی ہے۔ لیکن ادھر حال یہ ہے کہ بعض حضرات خاکسار پر آئے دن یہ الزام لگاتے نہیں تھکتے ہیں کہ میں کوچۂ ادب تک سے ناآشنا ہوں۔ اب یہ سارا ماجرا سنانے سے میرا مدعا یہی ہے کہ ایک طرف اگر کبھی کسی لاشعوری میں مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تو آپ مجھے معاف فرمائیں گے، اور میرے حق میں دعا دیں گے کہ میں راہ ورسم ادب سے مزید آشنا ہوجاؤں۔ والسلام علیکم۔

کفش بردار:

محمد طاہر جمال ندوی

۱۰/ستمبر/۲۰۱۱ء۔ جدہ سعودی عرب۔

بہر حال حضرت مولانا ابوسعید صاحب پر لوگ جو بھی رائے رکھیں، بجا طور پر رائے رکھنے کے حق دار ہیں، لیکن میری رائے میں آپ ایک وسیع النظر اور عمیق الفکر عالم دین تھے، علمی اور فکری نقطۂ نظر سے ارکان جیسی حالیہ اندھیر نگری میں میرے اندازے کے مطابق آپ کے ذہن رسا کو ایک قسم کی علمی وفکری بصارت اور ایک حد تک معلمانہ وحکیمانہ بصیرت عطا ہوئی تھی، جو بلا شبہ فیاض ازل کی ایک کرشمہ سازی تھی، ظاہر ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے، عطا کرتا ہے، **ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**۔

اس بات میں کیا شک ہے کہ اللہ تعالی اپنے مخلص، عبادت گزار اور پارسا بندوں کے مقامات و مراتب بلند کرتا ہے۔ وہ بندے جن کے لیل ونہار کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور دینِ حق کی تبلیغ واشاعت میں گزرتے ہوں، اللہ تعالی کی رحمت وسکینت ہمیشہ ان کے شامل حال رہتی ہے، ان کے دل نیتِ خلوص کی آماج گاہ اور ان کے قلوب حسنات کے مراکز قرار پاتے ہیں، ان کے اذہان صالحیت کے منبع کی شکل اختیار کر لیتے اور ان کی سوچ وبچار کے پیمانے بدل جاتے ہیں، اللہ تعالی کی یاد ان کی زندگی کے معمولات بن جاتی ہے اور ذکر الہی ان کے دلوں کی خوراک اور وظیفۂ حیات ہوجاتا ہے۔ ایسے بندے اللہ تعالی سے جو بھی مانگتے ہیں انہیں وہ اپنے فضل وکرم کے بھرپور خزانوں سے عطا کر دیتا ہے۔ ویسے حضرت مولانا ابوسعید صاحب کے حالات وکوائف سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ کے رجحانات وافکار خالصتا اطاعتِ خداوندی کے تابع تھے، آپ پر اللہ تعالی کے خاص احسانات اور عنایات کی بارشیں ہوئی تھیں، اس لئے آپ کا شمار میرے خیال میں ان لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جن کا تذکرہ قرآن کریم نے {**مخلصین له الدین**} اور {**الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون**} فرماکر بلند و برتر کر دیا ہے۔

پھر دور آخر میں ہماری بعض تاریخی شخصیات پر قلم اٹھاتے وقت محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کے حالات وجذبات دراصل شکست وریخت، مایوسی وپسپائی، ناکامی ونامرادی سے عبارت ہے، مزید برآں پس ماندگی اور غربت وافلاس نے ان کی زندگی اور حوصلے کو توڑ کر رکھ دیا ہے، لیکن ایسے حالات میں بھی بعض مخلصین ایسے بھی نظر آتے ہیں کہ جن کی زندگیاں شکست وریخت، مایوسی اور نامرادی سے تقریبا ناآشنا ہوتی ہیں، جنہیں دیکھ کر ہم سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ آخر وہ کون سی طاقت وتوانائی

ہوتی ہے جوان کے دل ودماغ کو ہمیشہ تازگی، بالیدگی، قرار وطمانیت بخشتی ہو؟ جواب کی تلاش سے ہم اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ دراصل وہ تھی ان کا ایمان واتقان اور علم وعرفان کی قوت وشوکت، جو ہمیشہ ان کے دل ودماغ کو اگرچہ جانکنی اور دل شکنی کے عالم میں کیوں نہ ہو، حوصلہ دیتی اور ناامیدی کے عالم میں امید وامنگ کا قرار بخشتی ہے۔ ویسے جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا ابوسعید صاحب بھی ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک تھے، جنہوں نے بڑے سے بڑے کرب ناک حالات میں بھی اپنے عزم وحوصلہ کو نہ صرف بلند رکھا بلکہ شکست وریخت سے دوچار عوام کو بھی اپنے انداز میں روشنی کا مینارا دکھایا ہے، سرزمین ارکان اور وہاں کے مسلمانوں پر آپ کی زندگی میں بڑی بڑی پریشانیاں آئیں، مصیبتیں نازل ہوئیں، لیکن آپ نے اپنی بلند حوصلگی سے کام لیتے ہوئے وطن عزیز اور اپنی قوم کو سینے سے لگا رکھا تھا، آپ کے بہت سارے اہم دوستوں اور احباب نے ترک وطن کر کے ڈھیر سارے ملکوں میں پناہ لی، مگر آپ نے اپنے وطن اور اپنی قوم کو کبھی بھی چھوڑنا پسند نہیں کیا، ویسے حالات کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، ہر حالت میں آپ نے اپنی قوم کی رہنمائی کی، اور آپ کی رہنمائی اور رہبری کو خاصے لوگوں نے غنیمت بھی جانا تھا۔

شک نہیں ہے کہ مولانا ہماری دینی اور روحانی محفلوں کے لئے اپنے زمانے میں گوہر شبِ چراغ تھے، آپ کی دینی اور روحانی سرگرمیوں سے ہمارے مسلم ماحول میں نکھار ووقار میسر ہوا تھا، آپ نہایت خوش اخلاق اور خوش مزاج، رعونت سے محفوظ، خشونت ویبوست سے کوسوں دور، عقیدۂ اسلامیہ پر مضبوط، اپنے نظریات میں پختہ اور غایتِ درجہ کے متواضع بزرگ تھے، آپ اپنے بزرگوں کے لئے مجسم ادب اور اپنے عزیزوں کے لئے سراپا شفقت تھے، آپ کو اپنے علاقے میں جو مقبولیت حاصل ہوئی تھی، اس کی اصل وجہ آپ ایک بلند پایہ کے عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے خلوص وللّٰہیت، حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جذبۂ صادقہ، اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں غایت درجہ کا انہاک واستغراق، بندگان خدا کے ساتھ تواضع وانکسار، اور جذبۂ دعوت وہدایت تھی۔

تبلیغ دین کے فرائض کی ادائیگی کے بطور آپ دینی جلسوں اور مذہبی اجتماعات میں ذوق وشوق سے شرکت کرتے تھے، پند ونصیحت کے ذریعے تبلیغ دین کے فرائض کی انجام دہی میں آپ کو خاصے

باریک بین دیکھا گیا تھا، یوں بھی دیہاتی لوگ ایسی مجلسوں میں بڑے خلوص کے ساتھ شریک ہوتے، اور ان میں ہونے والے خطابات سے اپنی اپنی زندگیاں سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں، ویسے آپ نے جہاں کہیں بھی خطاب کیا، آپ کے خطابات سے لوگوں کو متأثر ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

مولانا اخلاص میں ڈوبے تقریر کرتے تھے، وہی بات آپ کی زبان مبارک پر آتی جو حقیقت و صداقت کی میزان میں پوری طرح اترتی ہو، بعض مقررین کی طرح بے ضرورت باتوں اور من گھڑت قصے کہانیوں سے آپ کی زبان تقریباً ناآشنا تھی، آپ کا طریقۂ پند ونصیحت نہایت مؤثر تھا، میٹھی اور پیاری زبان، لہجے نرم اور دل پذیر ہوتے تھے، غرض جو بھی آپ کی تقریر سنتا وہ آپ پر گرویدہ ہو جاتا تھا، تقریر بڑی رواں اور شگفتہ ہوتی تھی، سامعین کبھی کبھار آپ کے بیان کی رو میں بہہ جاتے تھے، دورانِ تقریر آپ کے منفرد دعوتی اسلوب، سوز دروں کی کرشمہ سازیاں، جگہ جگہ مناسب مواقع پر عربی، فارسی اور اردو کے روحانی ابیات نے سننے والوں کو اسیر بنالیتا تھا، میرے خیال میں آپ کا انداز خطاب آپ کے مرشدِ اول حضرت مولانا محمد ادریس صاحب نور اللہ مرقدہ (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب مہتمم مدرسہ ہاٹہزاریؒ) سے ملتا جلتا تھا، جس میں ناصحانہ چھاپ نمایاں ہوتا تھا، اور جس میں زبان کی شیرینی، آواز کی خوش نمائی اور طلاقتِ لسانی کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔

مولانا ابوسعید صاحب حضرت مولانا الحاج شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی نور اللہ مرقدہ (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) کے مجاز بیعت تھے، سننے میں آیا کہ آپ کے حلقۂ ارادت میں خاصی وسعت آچکی تھی، اپنے علاقے کے علاوہ منگڈو شہر اور اس کی اطراف میں آپ کے بڑی تعداد میں متعلقین ومریدان پائے جاتے ہیں، محکوم ارکان میں آپ نے اپنی، دعوتی، تبلیغی، تعلیمی اور روحانی سرگرمیوں کے ذریعے جو چراغ روشن کیا تھا، شاید اس کی تابانی اور ضیاپاشی آج بھی ہمارے دینی اور روحانی ایوان میں محسوس کی جاتی ہوگی۔

جہاں تک میں نے دیکھا اور بعد میں لوگوں کی زبانیں سنیں، ان سے اندازہ ہوا کہ آپ کے دن کی جلوتیں درس وتدریس میں بسر ہوئیں، اور شبانہ خلوتیں اپنے خالق ومعبود، مالک ومسجود کے ساتھ راز و نیاز کی عبادت گزاریوں، اوراد واذکار میں صرف ہوئی تھیں، آپ ذوق عبادت سے بہرہ ور بزرگ

تھے، جہاں تک آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا کہ قیام اللیل کے حوالے سے آپ کو بہت بلند مرتبہ کا انسان پایا، یہاں تک دیکھا گیا کہ رات گئ آپ پند و نصیحت کی محفل سے گھر آئے، اگر چہ بہت تھکے ہوئے تھے، لیکن آپ اپنے معمول کی نیم شبی اور نالۂ سحر گاہی میں بقیہ رات گزار دیتے تھے۔

جہاں تک میں نے دیکھا کہ آپ نہایت صاف وستھرے لباس زیب تن کرتے تھے، غذا ہلکی کھایا کرتے تھے، کسی خاص غذا سے شاید رغبت تھی، مگر اکثر دیکھا گیا کہ جو میسر آیا آپ اسے بصد شکریہ تناول فرمالیا۔

مولانا لوگوں کی دل جوئی میں یکتائے روزگار تھے، ایسی بات زبان پر کبھی نہیں لاتے جس سے کسی کا دل دکھنے کا اندیشہ ہو، کوئی بھی آپ سے مشورہ لینے آتا تو آپ اپنی دانست کا صائب مشورہ دیتے تھے، دنیاوی لحاظ سے اگر کسی کم زور کا مقابلہ کسی طاقت ور سے ہوجاتا تو آپ حق بجانب ہو کے کم زور کی مدد کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے تھے، اور کوشاں رہتے کہ کم زور کو اس کا حق مل جائے، غرض حتی الامکان کسی انسان کی حق تلفی ہونے نہیں دیتے تھے۔

بہر حال اللہ تعالی نے اپنے اس مخلص بندے سے دین کی بڑی خدمت لی، آخری مرض کے علاج وتشخیص کے لئے بنگلا دیش آئے، اور بالآخر ۲۰۱۸ء میں ٹیکناف میں آپ کا انتقال ہوگیا، اور یہیں دفن ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تیسرا باب

ابتدائی تدریسی خدمات

۱۹۷۹ء میں جامعہ اسلامیہ پٹیہ سے فراغت کے بعد مولانا حسین احمد صاحب نے اور ایک سال کے لئے اسی جامعہ میں درجۂ تخصص فی الحدیث میں داخلہ لیا تھا، میری معلومات کی حد تک داخلہ تو لیا لیکن پڑھا کچھ نہیں، بعد ازاں آپ نے اپنے والد مولانا مفتی ابو الفضل صاحب کی طرح درس و تدریس کی راہ چن لی، اسی زمانے میں جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں آپ کے اساتذہ میں سے حضرت مولانا مظفر احمد صاحب مہیش خالوی اور حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی ذمے داران برائے تقسیم مدرسین تھے، انھوں نے آپ کو بگورا والے ایک مشہور مدرسہ میں ابتدائیہ کی تدریس کے لئے تقریبا بات طے کرلی تھی، لیکن آپ کا ارادہ جامعہ اسلامیہ میں رہتے ہوئے مزید مطالعہ کا تھا، آخر جو نہ ہوسکا تھا۔

جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں: ۱۹۷۹ء کی ابتدا یا ۱۹۸۰ء کے اوائل کی بات تھی کہ جامعہ اسلامیہ ٹیکناف (کاکس بازار) کو مولانا حسین احمد کے مطابق مولانا عبد الحق صاحب اکیابی (جو عرصے تک جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں درسیات کی کتابوں کی تعلیم دے کر اپنے وطن جا چکے تھے) کی جگہ ایک با صلاحیت مدرس کی ضرورت پڑی تو اس مدرسہ کے ارباب بست وکشاد نے پٹیہ والوں سے رابطہ کیا، اور ایک مدرس کی فرمائش کی تو آپ نے اپنے اساتذہ کی چاہت اور جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کے ذمے داروں کے اصرار پر درسی خدمت کے لئے رضامندی کا اظہار کیا، آپ کے مطابق وہ اس لئے بھی کہ:

۱۔ ظاہر ہے کہ مولانا طبیعی طور پر ذہنی اور فکری اعتبار سے ایک سیاسی اور انقلابی مزاج کا انسان ہیں، تو آپ کا ارادہ تھا کہ آپ جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کے دوران تدریس ارکان کے کچھ ایسے ہونہار طلباء کو یہاں لاکر تعلیم وتربیت دیں گے، جو مستقبل قریب میں آپ کے ساتھ ملت وقوم کی بجا طور پر

خدمات انجام دینے کے لائق و مستعد ہوں۔

۲۔ چوں کہ ٹیکناف کا یہ علاقہ مولانا کے اپنے وطن کے بالکل پڑوس میں واقع ہے، آپ کے مطابق ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ یہ اور اس کے ملحق تمام علاقہ جات کے علماء، دانشوران کے علاوہ زندہ دل اور فکر مند عوام کے اذہان کو ارکان کے حوالے سے ہموار کیا جائے۔

بہر حال آپ اس مدرسہ کے مدرس ہو کے آئے، جہاں آپ نے تقریبا ایک سال کسی طرح درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، یہاں ایک بات یاد رہے کہ جس زمانے میں آپ اس مدرسہ کے مدرس تھے، اسی زمانے میں یہاں آپ کے وطن کے چند علمائے کرام بھی مدرس و منتظم تھے، جن میں مولانا محمد ہاشم صاحب بوسیدنگی، مولانا سیف اللہ بن مولانا عبد الجبار صاحب گدوسراوی، منگڈوی کے علاوہ مولانا محمد رضوان صاحب اکیابی اور مولانا عبد القدوس اکیابی نا قابل فراموش ہیں۔

تاہم یہ ایک اہم سوال ہے کہ مولانا اس ادارے میں جو امید وامنگ لے کے آئے، اس میں کہاں تک کامیاب ہو سکے تھے؟ تو میں ذاتی طور پر اس سوال کے جواب دینے کا اہل نہیں ہوں، تاہم اس سوال کے حوالے سے ایک بڑی تکلیف دہ بات سامنے آئی کہ یہاں آپ کے چند دن گزرتے نہ گزرتے خود اپنوں کی شکل کے چند حاسدین کی بری نظریں لگ گئیں، انہوں نے آپ کے آگے مختلف قسم کے روڑے اٹکائے، اور آپ کے پروگراموں کو ناکام بنانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔

<u>**رنگیا خالی مدرسہ میں:**</u> مولانا اگلے سال رنگیہ خالی (ٹیکناف) کے مدرسہ کے بانی ڈاکٹر قمر الزمان بریسالی (PHD) لنکن یونیورسیٹی (ا) کے اصرار کے علاوہ بڑی امید لے کر یہاں آئے، ڈاکٹر صاحب نے آپ کی بڑی قدر کی، اور ہر سہولیات بہم پہنچائیں، جہاں آپ نے ایک سال تعلیم دی، اس مدرسہ

(ا) معروف دانشور ڈاکٹر (PHD) قمر الزمان بریسالی معروف بہ فقیر صاحب علاقۂ بریسال کے رہنے والے تھے، شنید ہے کہ بعض نا قابل بیان وجوہات کی بنیاد پر آپ علاقۂ رنگیا خالی آئے، اور عرصۂ دراز تک علاقۂ ٹیکناف کے جنگلوں میں پھرتے رہے تھے، ایک فقیر انسان کی حیثیت سے یہاں مشہور ہوئے، بعد میں دار العلوم رنگیا خالی (اسلامی سنٹر) کی بنیاد رکھی، کہتے ہیں کہ آپ سے جماعت اسلامی بنگلا دیش کے چند بڑے بڑوں کے علاوہ سعودی سفارت خانے کے اعلی عہدے داروں سے قریبی تعلقات تھے۔ اللہ اعلم۔

میں آپ کے آنے کی چند وجوہات تھیں، آپ کے بعض بیانات کے مطابق جن میں سے کچھ یہ ہیں کہ:

ا۔ مولانا کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں سعودی سفارت خانے سے آپ کو یہ عندیہ ملا تھا کہ سفارت خانہ آپ کو تعاون کرنے پر رضامند ہے کہ آپ ارکان سے ہونہار طلباء کو یہاں لا کر ان کی تعلیم و تربیت کے پروگرام شروع کریں، اس حوالے سے تحقیق تو کی گئی لیکن تحقق نہیں ہو سکا۔

۲۔ ساتھ ہی ساتھ اسلامی سنٹر کے مؤسس مہتمم قمر الزمان صاحب نے بھی نیک خواہش کے ساتھ یہ مشورہ دیا تھا کہ ''مولانا! (تب تک آپ ایک نونہال بچہ نما مولوی تھے) آپ اپنے اندر جو عظیم خواب رکھتے ہیں، اور جس نیک تمنا اور پاکیزہ ارادے کے ساتھ آپ جی رہے ہیں، اس کے لئے جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کی جگہ مناسب نہیں، اسی لئے آپ اسلامی سنٹر رنگیا خالی آئیں، اور یہاں مدرسی کی آڑ میں اپنے پروگرام کا آغاز کر دیں، خدا کرے تو میں آپ کا ہر ممکنہ تعاون کرتا رہوں گا''۔

۳۔ علاوہ ازیں آپ کے مطابق جماعتِ اسلامی کے بعض مقامی مگر بڑے لیڈروں (جن میں شاہ جہان چوہدری ساتکانوی نا قابل فراموش ہیں) نے بھی آپ سے با ضابطہ طور پر ملاقاتیں کر کے یہ بات طے کر لی کہ اگر مولانا اپنے مذکورہ پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے حوالے سے اٹل ہیں تو جماعت اسلامی بنگلا دیش آپ کو تعاون کرنے میں کوئی بھی کسر نہیں چھوڑے گی۔

مولانا اسلامی سنٹر رنگیا خالی میں ایک جواں سال ابتدائیہ کے معلم تھے، اسی دوران آپ کے مطابق آپ سے ملاقات کے لئے ارکان کے عظیم قائد محمد جعفر حبیب مع ان کے دیرینہ ساتھی جناب سجاد حسین رواسوگری (مرحوم) مقیم ٹیکناف کبھی کبھار تشریف لایا کرتے تھے، کہتے ہیں کہ حضرت قائد آپ سے مل کر بڑے خوش ہوتے اور آپ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے دعائیں دیتے تھے۔

اسی طرح مولانا کے مطابق ہمارے معروف لیڈر محترم ڈاکٹر محمد یونس صاحب بھی مولانا کی نیک نامی اور شہرت سن کر یہاں تشریف لائے، جن کے ساتھ پروفیسر محمد زکریا صاحب اور سعید الرحمن صاحب بھی تھے، انہوں نے بھی مولانا کی حوصلہ افزائی کی، اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا تھا۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا کو اسلامی سنٹر رنگیا خالی کا ماحول راس نہ آیا، ان کے مطابق وہ اس لئے بھی کہ یہاں کے علماء وطلباء حضرات علمائے دیو بند اور بطور خاص جماعت تبلیغ والوں

کے خلاف برملا بکواس اور ہرزہ سرائی کرتے پھرتے تھے، جس کا علم آپ کو پہلے نہیں تھا، ورنہ آپ کی غیرت وحمیت وہاں جانے کی اجازت ہی کب دیتی؟

بہر حال یہاں کے دوران تدریس ایک دل چسپ واقعہ پیش آیا، وہ یہ تھا کہ اس زمانے شاید اب بھی ہو کہ بریلوی حلقے کے معرف ومشہور دو چاٹگامی عالم مولانا نورالاسلام ہاشمی اور مولانا عبیدالحق نعیمی صاحبان نہلا (ٹیکناف) کے مدرسہ مجیدیہ میں کسی پروگرام کے سلسلے میں تشریف لائے، دوران خطابات انہوں نے ببانگ دہل یہ چیلنج کردیا کہ ''سامنے آئے وہ جو کہتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غیب نہیں جانتے تھے'' چوں کہ اس علاقے کے علماء اورعوام کی بھاری اکثریت دیوبندی مکتب فکر سے تعلق رکھتی ہے اور دارالسنہ نہلا جیسا ایک دینی مدرسہ یہاں قائم ہے، تو دیوبندی مکتب فکر کے علمائے کرام کے ساتھ عوام بھی مشتعل ہو گئے، آخر کار ان دونوں سے مناظرہ کرنے کے حوالے سے جامعہ اسلامیہ نہلا کے اساتذہ وطلباء کی نظریں مولانا حسین احمد صاحب پر پڑیں تو بلانے پر آپ نہلا تشریف لائے، اور دھلیا نامی ایک صاحب کے گھر میں آپ کا ان دونوں سے مناظرہ ہوا، مناظرہ کیا بلکہ معرکہ ہوا، جس میں آپ کی واضح طور پر کامیابی کی صورت میں ان دونوں کو بری طرح ناکامی کا چہرا دیکھنا پڑا، اور مولانا کے مطابق وہ دنگل سے ایسے بھاگے کہ ان کو پیچھے مڑنے تک کا موقع نہیں ملا تھا۔

جامعہ اسلامیہ دارالسنہ نہلا میں: مولانا محترم کے اس مناظرہ کی کامیابی نے جامعہ اسلامیہ دارالسنہ والوں (جن میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب نمایاں تھے) کی نظریں مزید آپ کی طرف کھینچیں، دعوت ملی تو آپ اگلے سال ۱۹۸۲ء میں دارالسنہ تشریف لائے، جہاں آپ نے تقریباً دوسالوں تک متداول نصاب کی ابتدائی کتابوں کے درس وتدریس کی خدمات نبھائیں۔

ابتدائیہ کے حوالے سے دارالسنہ نہلا میں مولانا کی کافی تدریسی فتوحات ہوئیں، آپ نے یہاں درس وتدریس کے ساتھ النادی الثقافی کا افتتاح کیا، جس کا جلسہ ہفتے میں ایک مرتبہ منعقد ہوتا تھا، جس میں طلباء بڑے جوش وخروش سے شریک ہوتے تھے، علاوہ اس کے یہاں کے مخلص منتظمین، مدرسین اور طلباء میں آپ کی خاصی پذیرائی ہوئی، رہائش کے لئے جو کمرہ ملا تھا وہ بھی دیگر اساتذۂ کرام کے رہائشی کمروں کی بہ نسبت کافی نفیس اور خوش نما تھا، یہ دیکھ کر بعض حاسدین آپ کے پیچھے لگے، لیکن ان

کا کام نہیں ہوا، بعد میں وہ لوگ بھی سرنگوں ہو گئے۔

جہاں تک معلوم ہوا کہ دارالسنہ نہلا کے بزرگ ترین عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسحاق صاحبؒ آپ کو بہت پسند کرتے تھے، اور تو اور مولانا حسین احمد صاحب مدرسہ کی جامع مسجد میں کبھی کبھار طلباء سے ٹوٹی پھوٹی عربی میں خطاب کرتے تو حضرت مولانا اسحاق صاحب طلباء کے درمیان کہیں بیٹھ جاتے تھے، اس سلسلے میں ایک دن مولانا حسین احمد صاحب نے عربی کے بجائے اپنی مادری زبان میں تقریر شروع کی تو حضرت شیخ فرمانے لگے کہ حسین احمد صاحب! آپ عربی میں تقریر کریں تو بیٹھتا ہوں ورنہ چلا جاتا ہوں۔

اس وقت کے مہتمم جناب فقیر منظور احمد صاحب جو کہنے میں اگرچہ ایک دانش ور تھے، لیکن وضع قطع، امانت ودیانت اور طرز زندگی کے اعتبار سے ایک بزرگ عالم دین سے کسی معنی میں کم نہیں تھے، جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ بھی مولانا کو بعض لوگوں کے مطابق چندہ فراہمی کے حوالے سے دل سے چاہتے تھے، بعد میں تحقق ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی رفاقت میں مولانا کو چندہ فراہمی کے لئے حجاز مقدس کا سفر (مولانا کے لئے پہلا) کرایا تھا۔

بایں ہمہ مولانا حسین احمد صاحب کی قسمت ہی ایسی نکلی کہ آپ جہاں بھی جاتے اور جہاں کہیں بھی ہوتے، بعض حاسدین آپ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، آپ کے انداز واطوار، رہن سہن، طرز زندگی اور میل جول پر نازاں ہونے کے بجائے بعض لوگ آپ کو حقد وحسد کی نظروں سے دیکھنا شروع کردیتے ہیں، ابھی آپ دارالسنہ نہلا کے مدرس تھے، شاید حاسدین میں سے کسی نے حضرت ذوقؔ ندوی صاحب کے کان بھر دئے ہوں کہ اچانک مولانا کے نام حضرت ذوق ندوی صاحب کا ایک خط آیا، جس کے دیگر مندرجات میں سے مولانا حسین احمد صاحب کے مطابق ایک جملہ یہ بھی تھا کہ: ''بعض لوگ تم کو مغرور سمجھ رہے ہیں، ذرا ہشیار رہنا'' شاید اس جملہ کا مطلب یہ بھی ہو کہ میں نہیں جانتا ہوں کہ تم پندار وغرور کا شکار بھی ہو؟ لیکن لوگوں کی نظروں سے بچتے رہنا۔

دراصل ٹیکناف کے علاقے میں س زمانے میں شاید اب بھی ہو کہ مذکورہ تینوں دینی درس گاہیں بڑی شہرت کی حامل ہیں، تو ان درس گاہوں میں مولانا کی کچھ خدمات نے بعض حلقوں میں آپ کی شہرت

ہوئی اور کہیں کہیں آپ کی مخصوص استعداد اور اندازِ زندگی کا چرچا ہونے لگا تھا۔

اس علاقے میں اب بھی مولانا کے اگرچہ ابتدائیہ کے تلامذہ ہی سہی ایسے ایسے پائے جاتے ہیں، جن کی علمی استعداد اور فکری پرواز بذات خود اس بات کی دلیل و عکاس ہے کہ ان کے استاد ایک عالی مقام کے مخلص معلم تھے، سچ تو یہ ہے کہ آپ کے یہ تلامذہ آج بھی جہاں کہیں ہوں، اپنے محسن استاد کو نہیں بھولتے اور ہمیشہ اپنے اپنے انداز میں آپ کو یاد کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے ہیں، بایں ہمہ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ انہیں مولانا کی لیاقت پر کسی قسم کا بھروسہ تھا اور نہ ہے۔

مولانا کے مطابق دار السنہ نہلا کے دورانِ معلمی آپ سے ملنے کے لئے ڈاکٹر محمد یونس باغگونوی، پروفیسر محمد زکریا تنگ بازاری اور سعید الرحمن راموی فاروی صاحبان آیا کرتے تھے، یہ اس زمانے کی بات تھی کہ ڈاکٹر محمد یونس وغیرہ روہنگیا فدائین محاذ (RPF) سے بچھڑ کر ارکان مسلم آرگنائزیشن (AMO) کی بنیاڈالنے کے لئے کوشاں تھے، یہ وہ تنظیم تھی جو بعد میں روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے نام سے مشہور ہوئی، شاید کہ ڈاکٹر صاحب آپ کے یہاں دعوتی پروگرام لئے آئے ہوں گے، مولانا کے مطابق جنہوں نے ایک مجلس میں مولانا کی تقریر سے متأثر ہو کے کہا تھا کہ: ”یہ ایک جواں سال فلسفی ہیں“۔

<u>جامعہ اسلامیہ دار المعاف میں</u>: مولانا محترم نے دار السنہ نہلا میں تدریس کے ساتھ ساتھ تربیتی پروگراموں میں خاصی دل چسپی لی تھی، لیکن جہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے بلند مقاصد اور نیک آرزو کے حوالے سے یہاں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی، ویسے آپ نے ۱۹۸۴ء کے اواخر میں اندرون وطن جانے کا فیصلہ کرلیا، یوں وطن میں داخل بھی ہوئے، لیکن ظالموں کے مختلف مظالم کوہ گراں بن کر سامنے کھڑے ہو گئے تھے، ایسے میں حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی کی جانب سے دار المعارف چاٹگام (جس کی بنیاد ابھی ابھی پڑی تھی) کی خدمت کے لئے دعوت آئی تو آپ دوبارہ بنگلا دیش آ کے کچھ دن پڑھاتے رہے، بعد میں چندہ فراہمی کے لئے سعودیہ گئے تھے۔

دار المعارف میں مولانا کی اس بار اس لئے بھی خدمات زیادہ نہیں ہو پائیں کہ اس زمانے میں آپ زیر زمین کام کرنے والی سیاست سے عملا زیادہ دل چسپی لینے لگے تھے، اس وقت میں

دار المعارف کا طالب علم تھا، جہاں تک دیکھا کہ آپ ہماری زیر زمین کام کرنے والے بعض انقلابیوں کے سامنے کچھ نمایاں ہو چکے تھے، روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) نے آپ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ آپ اس تنظیم کے صدر دفتر میں بروز جمعہ درس دینے آئیں، جسے آپ نے قبول کیا تو اگلے چند مہینے تک اس کا سلسلہ جاری رہا تھا، اس حوالے سے اگلی سطور میں تفصیلات آئیں گی۔

مولانا کے درس و تدریس کے متعلق آپ کے تلامذہ میں دو مختلف آراء پائی جاتی ہیں، ان میں وہ تلامذہ جن کے اذہان صرف اور صرف درسیات کی کتابوں تک محدود تھے، اور جو ان کتابوں میں پائے جانے والے مباحث ہی سے دل چسپیاں رکھتے تھے، ان کی رائے یہ ہے کہ بسا اوقات مولانا محترم دورانِ درس کتاب کے اصل مباحث سے ہٹ کر فکری دنیا میں پرواز کرتے ہوئے غیر متعلقہ گفتگو چھڑ دیتے تھے۔ لیکن بخلاف ان کے وہ تلامذہ جو علمی اور فکری اعتبار سے بلند حوصلے رکھتے، ان کی رائے میں آپ کا درس اس لئے بہت ہی مفید تھا کہ آپ کتاب کے لاطائل مباحث میں زیادہ الجھنے کے بجائے دوران درس تلامذہ کو فکری دنیا کے سیر کراتے تھے، جس کی وجہ سے فکریات سے دل چسپی رکھنے والے طلباء کے بہت ہی فائدے ہوتے تھے۔ اس حوالے سے اور تو اور جن مدارس میں آپ نے کچھ تدریسی خدمات سرانجام دی ہیں، ان کے بعض منتظمین کی شکایت بھی سنی گئی، ویسے مجھے معذرت کے ساتھ ایک باوثوق راوی کی زبانی روایت کرنا پڑ رہا ہے کہ خود راقم سطور اور مولانا محترم کے شفیق مربی، استاد الاساتذہ حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب دامت برکاتہم نے بھی اس قسم کی شکایت آپ کے متعلق کی تھی کہ:

> ”مولوی حسین احمد کے حصے میں تفسیر جلالین شریف کا ایک حصہ دیا گیا تھا، شاید پڑھا سکے گا، لیکن پڑھا نہ سکا، ادھر سال گزر جانے کو تھا، وہ پڑھاتا کب تھا؟ دورانِ درس بس ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہتا تھا، بالآخر سال کے اواخر میں یہ کتاب اس سے مجبورا چھین کر مجھے تمام کرنا پڑا، یوں مجھے اور طلباء کی بڑی پریشانی ہوئی تھی“۔

حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب کی مولانا حسین احمد صاحب کے درس کے حوالے سے جو بات ابھی گزر چکی ہے، اس پر شاید تنقیدی نظر ڈالنے کی کافی گنجائش بھی ہو، لیکن راقم ان پر قلم اٹھا

نے کو خلافِ ادب سمجھتا ہے، کیوں کہ حضرت ذوق مولانا حسین احمد صاحب کی طرح راقم کا بھی شفیق استاد ومربی ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت کا مرتبہ بلند فرمائے۔

ایک طرف مولانا حسین احمد صاحب دورانِ درس اپنے شاگردوں کا حوصلہ بڑھانے اور ان کے اندر تحصیل علم کے شوق پیدا کرنے کے لئے مناسب اور برمحل گفتگو چھڑتے ضرور تھے، تو دوسری طرف بعض حضرات کے مطابق اس بات میں شک کی گنجائش بھی نہیں ہے کہ دورانِ درس آپ کی بعض گفتگو اور ارشادات درحقیقت اس بات کے غماز تھے کہ آپ اپنے تلامذہ کو فکری اعتبار سے اونچائی پر لے جانے کے لئے کوشاں تھے، تاہم یہ بھی ایک قابل لحاظ بات ہے کہ درس کی کتاب اپنے حصے میں لے کر اسے نہ پڑھانا یا اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچانا (بشرطیکہ آپ کے متعلق کی جانے والی بات سچائیت پر مبنی ہو) یہ بھی کوئی مناسب کام نہیں ہوتا ہے، اس کا لحاظ بہرحال رکھنا چاہئے۔

افسوس ہے کہ آج کل مولانا جیسے تلامذہ کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے اساتذہ ملتے ہیں تو بہت کم، اور نہ ہی ہمارے مدارس میں حصول علم کا صحیح مذاق اور جذبہ رکھنے والے تلامذہ پائے جاتے ہیں۔ شاید ملتے ہوں گے۔ کیوں کہ آج کل کا دور جو ہے، یہ بس ایک مادی دور ہے، یہاں ہر کام مادی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے، اس کے ترازو میں ہر معاملات کو تولا جاتا اور چیز کو اس کی معیار سے پرکھا جاتا رہا ہے، ہر سو مادی مفادات کا دور دورہ ہے، وقت کے ساتھ خلوص وللّٰہیت کے جذبے ختم ہونے جا رہے ہیں، آج کل بعض مدارسِ قومیہ کی حالت نہایت پریشان کن ہے، غرض اس مشینی عہد میں ہر انسان ایک ایک مشین بن چکا ہے۔

بہرحال مولانا کے ایک سے زیادہ تلامذہ آج کل میدانِ عمل وتطبیق میں سرگرم نظر آتے ہیں، یہ وہ تلامذہ ہیں کہ جنہوں نے ظاہر ہے کہ آپ سے جامعہ اسلامیہ ٹیکناف، اسلامی سنٹر رنگیا خالی، جامعہ اسلامیہ دارالسنہ نہلا اور جامعہ اسلامیہ دارالمعارف میں کچھ ابتدائیہ کا استفادہ کیا تھا، جن پر آپ کو ہمیشہ ناز کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کی حیات دراز کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے لائق وفائق استاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملت عزیز کی مزید خدمات کی توفیق سے نوازے۔ ان میں سے آپ کے بعض نامور تلامذہ کے مختصر تذکرے خدا کرے تو اگلی سطور میں آئیں گے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا ندوی سے ملاقات

مجدد القرن العشرین مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کا فکری تعلق بہت پرانا ہے، شاید یہ تعلق آپ کے جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے دوران تعلیم آپ کے استاد حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے توسط سے پیدا ہوا ہو، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس تعلق میں آئے دن مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے دوران تعلیم اور اس کے بعد کے زمانے میں آپ نے مفکر اسلام حضرت مولانا ندوی بشمول دیگر ندویوں کی تصانیف پڑھ کر یہ دعویٰ کرنے کے حق دار بنے کہ ''میں نے ندوے کی اینٹ اینٹ کو پڑھ لیا ہے''۔

لیکن مولانا حسین احمد صاحب نے مارچ ۱۹۸۴ء تک حضرت مولانا ندوی کو براہِ راست نہیں دیکھا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا حضرت ندوی ۱۹۸۴ء میں بنگلا دیس تشریف لائے، دورانِ سفر جامعہ دارالسنہ نہلا کی بھی زیارت کی، ویسے یہاں مولانا حسین احمد صاحب کو حضرت ندوی سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوگئی تھی۔ بہرحال اس سفر کے حوالے سے خود حضرت مولانا ندوی لکھتے ہیں کہ:

''ادھر کئی سال سے بنگلا دیش کے دوستوں کے طرف سے بنگا دیش آنے کے لئے اصرار تھا، میری اردو عربی کی تصنیفات وہاں شوق سے پڑھی گئی تھیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بھی کچھ فضلاء تھے، اور خاص طور پر بنگلا دیش کے ایک نوجوان عالم مولوی محمد سلطان ذوقؔ جو چاٹگام کے جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں استاد تھے، اور جن کو ادب عربی کا اچھا ذوق ہے، اور خاص طور پر ادب اسلامی سے اور اس میں علامہ اقبال کے کلام اور اس میں میری عربی پیش کش ''روائع اقبال'' سے ان کو بڑی دلچسپی تھا، اور عرصہ سے وہ مجھ سے علمی وقلمی رابطہ رکھتے تھے، لکھنؤ بھی آچکے تھے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طویل قیام بھی تھا اس سفر کے بڑے داعی تھے۔

آخر اس سفر کی تقریب نکل آئی، بنگلا دیش کے بعض اہم مدارس اور تنظیموں کی خواہش اور طلب اور اسلامک فاؤنڈیشن کی دعوت پر وہاں کا سفر طے کر لیا گیا، اور ۹ر مارچ ر ۱۹۸۴ء کو رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ جن میں مولانا عبدالکریم پارک، مولانا ابوالعرفان خان ندوی، عزیزی مولوی سید سلمان حسنی ندوی، اور میرے سفر کے عام رفیق ومعاون حاجی عبدالرزاق رائے بریلوی تھے، ۹ر

مارچ/ ۱۹۸۴ء کو جمعہ کے دن بذریعۂ ہوائی جہاز لکھنؤ سے کلکتہ ہوتے ہوئے ٹھیک مغرب کے وقت ڈھاکہ پہنچا، جناب بشیر الدین صاحب (مالک جمیل الدین لمیٹڈ ۳۶/ نیو اسکائن ڈھاکہ) کے یہاں قیام ہوا، جو ایک دین دار صاحبِ خیر تاجر اور اکثر علماء کے میزبان رہتے تھے۔

بنگلا دیش میں ۹/ مارچ/ ۱۹۸۴ء سے ۱۹/ مارچ/ ۱۹۸۴ء تک دس روز قیام رہا، اس سفر میں ڈھاکہ، چاٹگام، کوکس بازار، مومن شاہی (میمن سنگھ) اور سلہٹ کے مرکزی مقامات پر جانا ہوا، بڑے بڑے جلسوں میں خطاب ہوا، اور مدارس کا معاینہ کیا گیا، چاٹگام اور کوکس بازار کے دورہ میں نہلا تک جانا ہوا، جو برما کی سرحد پر واقع ہے، وہاں ہماری آمد کوسن کر برما کے بہت سے اہل ذوق اور اہل علم تشریف لائے، ڈھاکہ کے قیام میں سنارگاؤں بھی گئے، جو قدیم مسلم سلطنت کی آخری مشرقی سر حد تھی، یہیں سے شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی سڑک شروع ہوتی تھی، (جو نیلاب، سندھ) تک جاتی ہے، اب یہ مقام پینام (PAINAM) کے نام سے ضلع ڈھاکہ میں شامل ہے''۔(۱)

اس سفر مبارک سے واپسی کے حوالے سے حضرت مولانا دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

''۲۰/ مارچ کو ہوائی جہاز سے وفد کی کلکتہ واپسی ہوگئی، اس سفر میں مولوی سلطان ذوقؔ صاحب، موی عبید الحق صاحب، صدر مدرس مدرسہ عالیہ ڈھاکہ اور ان کے صاحب زادہ عزیزی مولوی سعود الحق ندوی اور مولوی محی الدین صاحب ایڈیٹر'' مدینہ'' ڈھاکہ کی خاص معاونت و رفاقت رہی، جزاھم اللہ خیر الجزاء''۔(۲)

حضرت مولانا ندوی اس سفر کے دوران جامعہ اسلامیہ دار السنہ تشریف لائے تھے، جہاں اس زمانے میں مولانا حسین احمد وہیں مدرس تھے، مولانا ندوی کی تشریف آوری ہوئی تو آپ کا شاندار استقبال ہوا، یہاں کے سالانہ جلسہ کے دوران آپ کو استقبالیہ دیا گیا، جس میں عربی میں ایک سپاس نامہ دیا گیا، مولانا حسین احمد صاحب کے مطابق جسے لکھنے اور مجلس میں پڑھنے والا وہی تھے۔

(۱) ملاحظہ ہو: کاروان زندگی حصہ سوم، ص: ۵۵۔۵۶
(۲) ملاحظہ ہو: کاروان زندگی حصہ سوم، ص: ۶۴

مولانا حسین احمد صاحب کا بیان ہے کہ: ''یہاں حضرت مولانا ندوی کی تشریف آوری پر مجھے بڑی خوشی ہوئی، کیوں کہ مجھے آپ کے دیدار کی آرزو مدت سے ستاتی رہی تھی، آج حضرت مولانا کی تشریف آوری پر میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی'' مولانا حسین احمد صاحب کے دیگر بیانات سے پتہ چلا کہ جبھی حضرت مولانا ندوی نہلا تشریف لائے آپ فرطِ مسرت سے باغ باغ ہوگئے تھے، مولانا کی واپسی پر جب آپ گاڑی پر سوار ہو رہے تھے، مولانا حضرت مولانا ندوی سے ایسے لپٹ گئے کہ آخر مولانا ندوی کو آپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہنا پڑا کہ ''تم ندوے ضرور آؤ!''۔(۱)

مولانا حسین احمد صاحب نے حضرت مولانا ندوی کی زندگی میں ندوے کی زیارت کی اور ضرور کی، لیکن ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد، جس کی قدرے تفصیلات خدا کرے تو اگلی سطور میں آئیں گی۔

غرض بات یہ ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب حضرت مولانا ندوی کے بڑے شیدائی ہیں، مولانا ندوی کی لٹریچرز، آپ کے علمی وفکری خیالات ونظریات، آپ کی بے لوث خدمات، حقیقت پسندی و متانت، اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ آپ کے انفاس عالیہ سے شدید متأثر ہیں، علاوہ ازیں آپ حضرت مولانا ندوی کو صدی کے سب سے بڑے مثالی انسان سمجھتے ہیں، جو میرے نزدیک بھی سراسر حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہے، کسی بھی مجلس میں حضرت مولانا ندوی کا تذکرہ آتا ہے تو آپ کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، حتی کہ حضرت مولانا ندوی کے ساتھ آپ کی محبت اور محبت بھرے تأثر نے مجلس کو بھی اشکبار کر دیتا ہے، ہمیشہ حضرت مولانا کے نام اس عقیدت ومحبت سے لیتے ہیں کہ حاضرین مجلس میں جو مولانا ندوی کو جانتے اور آپ کی طرف منسوب ہوتے ہیں، ان کے دل فرط محبت سے تڑپ کر رہ جاتے ہیں، اور جو مولانا ندوی کو اتنے نہیں جانتے اور آپ سے لگاؤ نہیں رکھتے وہ بھی محو حیرت ہو جاتے ہیں، مولانا حسین احمد صاحب نے میرے علم کی حد تک علماء تو علماء بہتوں دانش وروں کو بھی حضرت مولانا ندوی کی شخصیت، آپ کے انفاس عالیہ اور آپ کی دینی روحانی، علمی وثقافتی اور دعوتی وانسا

(۱) مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اس سفر کے متعلق مزید تفصیلات حضرت مولانا کی قابل قدر خودنوشتہ کتاب'' کاروانِ زندگی'' کے حصۂ سوم کے ساتھ مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی حفظہ اللہ کی ''نقوش زندگی'' ملاحظہ ہو۔

نی خدمات سے متعارف کرایا، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ہماری برادری کے بہتوں دانش وروں کو آپ نے حضرت مولانا کی کتابیں خرید کر ہدیہ دیں، جن میں سے بعض حضرات نے اعتراف بھی کیا ہے کہ حضرت مولانا کی کتابیں پڑھ کر ان کو بہت ہی فائدے ہوئے ہیں، اسی طرح مولانا حسین احمد کی گفتگو سے متأثر ہو کر ہماری برادری کے بہتوں دانش وران حضرت مولانا ندوی کی ذات و شخصیت اور آپ کی کتابوں کے شیدائی بنے ہیں۔

بہر حال حضرت مولانا ندوی جامعہ اسلامیہ دارالسنہ تشریف لائے تو آپ کے قیام کے لئے مولانا حسین احمد صاحب کا کمرہ منتخب کیا گیا، آپ کو اسی کمرے میں ظہرانہ دیا گیا، اور مولانا نے آپ کے تکیہ پر سر رکھ کر تھوڑا قیلولہ فرمایا، تو مولانا حسین احمد صاحب کے دل فگار بیان کے مطابق یہ ان کی زندگی کا قابل فخر سرمایہ بن گیا ہے، اور کیوں نہ ہو کہ مولانا ندوی جیسے ایک انسان کا آپ کے کمرہ میں تشریف لانا اور آپ کے تکیہ پر سر رکھنا افتخار کا سامان نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا؟۔

پچھلی سطور میں جس طرح عرض کی گئی ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب نے حضرت مولانا ندوی کی آمد پر جو سپاس نامہ لکھا اور اسے بھرے جلسے میں پڑھ سنایا تھا، اس کا نسخہ تلاش بسیار کے باوجود آج تک نہیں ملا، اس حوالے سے میں نے خود مولانا سے پوچھا تو فرمایا کہ:

> ''افسوس ہے اس سپاس نامے کا کوئی نسخہ میرے پاس نہیں ہے، اس زمانے میں اس کی خاصی تقسیم ہوئی تھی، مولوی رفیق، مولانا قاری بدر الاسلام اور مولانا عقیل احمد قاسمی وغیرہ کے پاس نسخے تھے، شاید اس کا کوئی نسخہ دارالسنہ نہلا کے دفتر میں بھی ہو''۔

ادھر اس بات پر راقم السطور کو بڑا تعجب ہوا ہے کہ استاد محترم حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب نے اپنی آپ بیتی ''نقوش زندگی'' میں حضرت مولانا ندوی کے اس مذکورہ سفر کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے، ہر چیز بڑی تفصیل سے لکھی گئی ہے، جامعہ اسلامیہ دارالسنہ نہلا کے مذکورہ سفر پر خاصی روشنی ڈالی ہے، لیکن اس میں بھی مولانا حسین احمد صاحب کے سپاس نامہ کے حوالے سے حضرت ذوق کا مبارک اور رواں قلم بالکل خاموش ہے، اس خاموشی پر کافی سوچ بچار کے باوجود آج تک کوئی منطقی نتیجہ نہیں نکال سکا، پھر تعجب کی بات ہے کہ حضرت ذوق ندوی کو اس سپاس نامہ سے بالکل انکار تھا۔

یہاں ایک بات کا تذکرہ میرے نزدیک بہت اہم ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی عدیم المثال شخصیت اور ان کی گونا گوں صفات و کمالات، ان کی بے مثال دینی، ملی، ادبی، ثقافتی، فکری اور سیاسی خدمات سے بے حد متأثر ہیں، علاوہ ازیں ان کے دعوی کی حد تک وہ مولانا آزاد اور ان پر لکھی گئی پرانی لٹریچرز کے صفحے صفحے سے نہیں بلکہ سطر سطر سے واقف بھی ہیں، بایں ہمہ ظاہر ہے کہ آپ نے آزاد کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، جب کہ آپ نے مفکر اسلام حضرت مولانا ندوی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے اور اپنی زندگی میں حضرت مولانا سے کم سے کم دو مرتبہ ملاقات کی سعادت بھی حاصل کی ہے، ایک طرف مولانا محترم کی آنکھوں کے سامنے حضرت مولانا کی تقریبا ساری کتابیں ہیں تو دوسری طرف حضرت مولانا کی شخصیت عالی مرتبت اور دینی و روحانی کمالات بھی، تو میرے خیال میں اگر چہ مولانا محترم ان دونوں عظیم شخصیات سے متأثر ہیں، لیکن مولانا آزاد کی بہ نسبت حضرت مولانا ندوی کی طرف آپ کے قلبی رجحان کا پلڑا کچھ بھاری سا نظر آتا ہے، یہ شاید اس لئے بھی ہو کہ:

ا۔ عالی نسبی: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تو ظاہر ہیں کہ حسنی سادات میں سے ہیں، جن پر کسی کی دو رائے نہیں، تو ایک سید سے محبت رکھنا مسلمانوں میں سے کون نہیں جانتا ہے کہ ایک مسلمان کا ایمانی تقاضا اور دینی فرض ہوتا ہے۔

۲۔ انفاس عالیہ: روحانی نقطۂ نظر سے حضرت مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، ویسے حضرت کے وہ انفاس عالیہ جنہوں نے ایک جہاں کے لوگوں کے دلوں کو آباد کیا ہے، اس کی طرف ایک صاحب ذوق اور حساس انسان کے قلبی رجحان کا ہونا ایک فطری امر ہے۔

۳۔ علاوہ ازیں: مولانا حسین احمد اگر چہ دونوں عظماء کے شیدائی ہیں، لیکن آپ حضرت مولانا ندوی کو دینی و ایمانی اور روحانی اعتبار سے ایک مثالی انسان سمجھتے ہیں، جب کہ مولانا آزاد کو بعض امور کے حوالے سے جن کا تذکرہ یہاں مناسب بھی نہیں کہ مولانا ندوی جیسے مثالی نہیں سمجھتے ہیں، بہر حال یہ تو میرے ذاتی خیالات ہیں، جن میں لغزش کی گنجائش ضرور ہے، خاکم بدہن اور گستاخی معاف۔

شادی وخانہ آبادی

جامعہ اسلامیہ نہلا کی تدریسی خدمات کے دوران جنوری/ ۱۹۸۴ء میں مولانا حسین احمد صاحب کی شادی خانہ آبادی محترمہ عارفہ بیگم بنت سلطان احمد باغکونوی، بوسیدنگی سے ہوئی، کہتے ہیں کہ یہ شادی بڑی سادگی سے ہوئی، جو دینی وشرعی نقطۂ نظر سے ایک عالم کے حسب حال تھی، اس شادی کی تقریب میں میاں بیوی کے خاندانوں کے چند لوگوں کے علاوہ مولانا کے بعض اساتذہ اور چند دیرینہ ساتھی بھی حاضر ہوئے تھے، سنا کہ اس مبارک شادی کے حوالے سے مولوی ابوطاہر صاحبؒ (۱) نے بڑی قابل داد خدمات انجام دیں، اور شادی کے کام کو انجام تک پہنچانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

---

(۱) محترم جناب مولوی ابوطاہر بن ابوطیب کی پیدائش بستی باغکونہ بوسیدنگ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب اور سرکاری پرائمری اسکول میں پاکر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، یہیں سے دورۂ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم پاکر سند فراغت حاصل کی۔ مولوی صاحب مولانا حسین احمد صاحب کے عزیز ترین خیر اندیش ساتھیوں میں سے تھے، اس حوالے سے خاصی تفصیلات ہیں، جن سے قطع نظر اس عجالہ میں ہی سہی اتنی سی بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ مولوی صاحب نے وقت وقت پر مولانا حسین احمد کی بڑی قابل قدر خدمت کی، ان کی خدمت میں کبھی بھی کسی قسم کی کوتاہی شاید ہوئی ہوگی۔

مولوی صاحب کے دوستوں میں مولانا حسین احمد کے خیر اندیش علاقے کے اور چند حضرات علمائے کرام بڑے قابل تذکرہ ہیں، جن میں سے مولوی محمد شفیع صاحب ہولی مرنگی، مولوی شفیع الرحمن صاحب پانچکری بیلی، مولوی عبیدالحق صاحب پانچکری بیلی اور مولوی روح الامین صاحب لمبابیلی ناقابل فراموش ہیں، ایک تو یہ سب ہم سبق تھے، پھر اس پر مستزاد ہم آئے دن دیکھتے تھے کہ یہ حضرات جہاں کہیں بھی جاتے یک ساتھ جایا کرتے تھے، اور جہاں تک دیکھا کہ یہ حضرات بھی مولانا حسین احمد صاحب کے نہایت قدردان اور خاصے مدح سرا تھے اور ہیں۔

مولوی ابوطاہر صاحب بڑے سلیقے کے نہایت باذوق انسان تھے، کافی خوب صورت بھی تھے اور نہایت خوب سیرت بھی، عنفوان شباب میں راقم سطور نے پہلی مرتبہ مولانا حسین احمد صاحب کا تذکرہ بڑے بلند و بالا الفاظ میں انہی کی زبانی سنا، اور جہاں تک اندازہ ہوا کہ آپ مولانا محترم کے بڑے قدردان اور راقم سطور کے بھی بڑے خیرخواہ تھے، مشورہ بڑا صائب دیا کرتے تھے۔ آپ نے غالباً ۱۹۹۷ء میں بھرپور جوانی کے عالم میں انتقال کیا، اور خاک باغکونہ میں مدفون ہیں، اللہ تعالی مرحوم کو غریق رحمت کرے، آمین یارب العالمین۔

مولانا کی رفیقۂ حیات

کہتے ہیں کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی رفیقۂ حیات محترمہ عارفہ بیگم کی پیدائش بمقام جبارفارا ہوئی ہے، لیکن میری اطلاع اور جانکاری کے مطابق قصبۂ علی چنگ کی بستی باغکونہ،، بوسیدنگ میں ہوئی تھی، اور بہت ہی کم عمری میں وہ اپنے والدین کے ساتھ منتقل ہوکر جبارفارا بوسیدنگ گئیں اور یہاں ان کا نشوونما اور تعلیم ہوئی تھی۔

محترمہ عارفہ بیگم ماشاءاللہ کچھ پڑھی لکھی اور بڑی خوش خصال خاتون ہیں، مولانا کی والدۂ محترمہ کے علی الرغم آپ کے خاندان اور گھرانے کے بعض بزرگوں کے کچھ قابلِ قدر بیانات سے اندازہ ہوا کہ اگرچہ محترمہ کسی عالی خاندان کا حصہ نہیں لیکن ایک عابدہ، پارسا، اور کافی سنجیدہ خاتون ضرور ہیں، جنہوں نے اس مبارک شادی وخانہ آبادی سے لے کر تا دم تحریر نہ صرف اپنے لائق و فائق خاوند کی بلکہ ان کے گھرانہ یعنی سسرال والوں کی قابل داد خدمات انجام دیں، اور اس حوالے سے کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی، علاوہ ازیں خانگی زندگی کے اس طول طویل سفر کے دوران مجھے ذاتی طور پر بھی ان کے صبر وشکر کا خاصا اندازہ ہے، حتی کہ ان کے صبر وشکر کا عالم دیکھ کر خود مجھے رشک آتا تھا کہ ایک عالم کی شریک حیات ہو تو اس شان کی، ورنہ ظاہر ہے کہ مولانا جس آن بان، شان وشوکت، نازک مزاج، رنگا رنگ افتادِ طبع اور اجتماع اضداد کے مالک انسان ہیں، ان کا ساتھ دینا اور بجا طور پر دے سکنا معمولی کام نہیں، بلکہ یہ ایک کرامت سے کم نہیں ہے، لیکن یہ محترمہ کی بلند حوصلگی اور دماغی قابلیت ہے کہ اگرچہ سے وہ زیادہ کچھ پڑھی لکھی نہیں ہیں لیکن زندگی کے اس طویل سفر میں آپ نے اپنے لائق و فائق خاوند کا بڑی حسن اسلوبی سے ساتھ نبھایا، اور بجا طور پر ساتھ نبھانے میں کامیابی حاصل کی، در اصل بات یہ ہے کہ محترمہ کی ان کامیابیوں اور کامرانیوں کے حوالے سے مزید قلم اٹھایا جائے تو الف لیلی کی داستان کی طرح کہانی بڑی طویل ہوگی، جس کے لئے یہ عجالہ کافی نہیں ہے۔

محترمہ عارفہ بیگم کے مجھ ناچیز پر بھاری احسانات ہیں، جن کے بوجھ تلے میں اب تک دبا ہوا ہوں، واقعہ یہ ہے کہ میں ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۸ء تک مولانا کے سایۂ لطف و عاطفت میں رہا، پھر اس کے بعد کبھی کبھار حاضری دینے اور کبھی کچھ مدت تک قریب رہنے کا موقع بھی ملا تھا، طالب علمی کے اس

طویل سفر کے دوران مولانا کے تہ بتہ محترمہ کے جو احسانات مجھ پر ہیں ان کا احصاء کبھی بھی ممکن نہیں، دل چاہتا ہے کہ ان احسانات پر قلم اٹھاتا جاؤں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آیا ابتدا کہاں سے کروں اور انتہاء کس مقام پر ہو؟ تاہم ان تمام احسانات کے سمندر سے اس عجالہ میں سہی ایک موتی ضرور نکال لاتا ہوں، کہ جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ محترمہ کے ان احسانات کی نوعیت کیا تھی، اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ محترمہ اپنے لائق خاوند کی طرح کتنی عالی ظرف اور بلند مرتبہ کی خاتون ہیں، دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی محترمہ کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین--

عارفہ بیگم کا گھرانہ میرے ننہال کے جوار میں عرصۂ دراز سے آباد تھا اور اب بھی ہے، ان کے والد بشمول اکثر چچے میرے ننہال میں بسا اوقات کاشتکار کے بطور کام کیا کرتے تھے، پھر میرے ننہال والوں کے ساتھ اس گھرانے کی کچھ رشتے داریاں بھی ہیں، ان کے تایاؤں اور چچوں کے ساتھ میرے خاصے تعلقات بھی رہے، جہاں تک اس گھرانے کے متعلق معلومات ہیں ان کی بنیاد پر عرض ہے کہ کہنے میں یہ گھرانہ کوئی علمی وصاحب ثروت گھرانہ تو نہیں ہے، تاہم ملت وقوم کے حوالے سے اس کے اکثر افراد خاصے دردمند تھے، یہاں اس گھرانے کے دیگر کو چھوڑ کر صرف اور صرف ان کے والد مرحوم کے ساتھ ان کے تایاؤں اور چچوں کے متعلق اجمالا بالترتیب کچھ تذکرے حاضر مت ہیں:

۱۔ <u>بن یامین مرحوم</u>: مرحوم بن صاحب مرحوم محترمہ عارفہ بیگم کے تایا تھے، کچھ پڑھے لکھے تاجر تھے، بڑے سخی منش اور عابد انسان بھی، ہماری آنکھوں کے سامنے انہوں نے غریبوں، مسکینوں اور پریشان حالوں کی جو مدد کی، اس سے اندازہ ہو چکا تھا کہ آپ ایک فیاض انسان ہیں۔

۲۔ <u>احمد صاحب مرحوم</u>: محترمہ عارفہ بیگم کا یہ تایا عرصۂ دراز تک پولیس میں تھے، بڑے بہادر، نڈر اور قوم پرست انسان تھے، پولیس میں رہ کر انہوں نے قوم کی خاصی خدمت کی، شاید ہی کبھی کسی کا دل دکھایا ہوگا، زبان کے بڑے سچے تھے، زندگی میں ان سے بہت ہی شفقت ملی، صوم وصلاۃ کے نہایت پابند تھے، آپ نماز فجر میں ''سورۃ الفجر'' کی تلاوت بہت پسند کرتے تھے۔

۳۔ <u>جناب سلطان احمد صاحب مرحوم</u>: محترمہ عارفہ بیگم کے والد گرامی جناب سلطان احمد صاحب کی پیدائش اپنی آبائی بستی باغگونہ، بوسیدنگ میں ہوئی، بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول میں کچھ تعلیم

پائی، کچھ بڑے ہوئے تو کاشتکاری/مزدوری سے دل چسپی لی، بعد میں نجی تجارت (بعض لوگوں کے مطابق شرعی نقطۂ نظر سے محل نظر) میں اترے، اور بوسیدنگ شہر میں دکان داری شروع کی، دیکھتے ہی دیکھتے شہر بوسیدنگ کے ان مال دار تاجروں میں شمار ہونے لگے کہ جن کی شہرت اطراف بوسیدنگ کے علاوہ ارکان کے دارالحکومت اکیاب تک پہنچی ہوئی تھی، انہوں نے جبارفارہ بوسیدنگ میں اس زمانے کے لحاظ سے ایک خوب صورت مکان بھی بنایا تھا، جس میں آپ کی اولاد کا نشوونما ہوا۔

لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا کہ اگلے چند سال گزرتے نہ گزرتے ان کی تجارت پر کسی کی نظر لگ گئی، اور خساروں پر خسارے اٹھاتے ہوئے ان کی تجارت زمین بوس ہوگئی تھی، عمر کے آخری چند سال انہوں نے بڑی عسرت و پریشانی کے عالم میں گزارے، بالآخر ان کو فالج کے مرض نے آدبوچا، جہاں تک یاد ہے کہ ۱۹۸۵ء کے دوران تشخیص و معالجہ کے سلسلے میں چاٹگام آئے، مولانا حسین احمد صاحب اس زمانے میں نہایت غربت کی زندگی گزار رہے تھے، لیکن پھر بھی ان کا مقدور بھر معالجہ کرایا، مگر صحت یاب نہیں ہوسکے، علاج و معالجہ کے بعد دوبارہ وطن واپس گئے، اور اسی پریشانی کی حالت میں ۱۹۸۷ء میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جناب سلطان احمد صاحب نہایت علماء دوست اور طلباء پسند آدمی تھے، علاوہ ازیں ان کے خاندانی بزرگوں کی طرح قدرے سخی منش بھی، راقم سطور کے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کیا کرتے تھے، الحمد للہ دورانِ معالجہ مجھے بھی ان کی کچھ خدمت کرنے کی توفیق ہوئی تھی، اللہ تعالی ان کو مغفرت کے ساتھ جنت الخلد میں جگہ عطا فرمائے۔

۴۔ <u>ابو طالب صاحب مرحوم</u>: محترمہ عارفہ بیگم کا یہ چچا بڑے نیک آدمی تھے، ہمارے عنفوان شباب کے زمانے میں بوسیدنگ میں تجارت کرتے تھے، زبان قدرے کڑوی تھی، لیکن لوگ کہتے تھے کہ آپ دل کے بہت اچھے تھے، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ جناب ابو طالب صاحب بطور خاص اپنے علاقے کے لوگوں کو دل کھول کر مدد کیا کرتے تھے۔

۵۔ <u>ابو طیب صاحب مرحوم</u>: محترمہ عارفہ بیگم کا یہ چچا ابو طیب صاحب ایک اچھے اور کامیاب تاجر تھے، لوگوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتے تھے، جسے پسند کرتے اس کے سامنے دل چھیر کر رکھ

دیتے تھے، جبھی میں ان کی نظر میں پڑتا، نہایت شفقت سے پیش آتے تھے۔

۶۔ نورالعالم صاحب مرحوم: محترمہ کا چچا نورالعالم مرحوم بڑے عالم دوست اور طلباء پسند انسان تھے، کاشتکار تھے لیکن نہایت دیانت دار، ان کی زبان اتنی میٹھی تھی کہ دل چاہتا تھا کہ کاش میری زبان اتنی میٹھی ہوتی، صوم وصلاہ کے بڑے پابند تھے، اور خلیق بھی۔

۷۔ محمد ایوب صاحب: محترمہ کا یہ چچا صوم وصلاۃ کے نہایت پابند ایک تاجر تھا، ساتھ ساتھ ان کے خاندان کے دیگر بزرگوں کی طرح نہایت سخی بھی، بڑے خوش اخلاق انسان تھے، لوگوں کے دل دکھانے کی بات تو دور بلکہ دل کا خوش کرنا ان کی زندگی کی عادت ثانیہ تھی، زبان کے پکے اور خاصے سخی بھی، حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی سعادت سے سرفراز ہوئے، اپنی آبائی بستی میں قدرے خوش حال رہائش پذیر تھے، ۲۰۲۶ء اوائل میں مہاجر کیمپ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

بہرکیف محترمہ عارفہ بیگم نہایت پردہ نشین خاتون ہیں، اور تو اور ہماری عام روایت کی طرح سسرال کے مردوں سے کبھی بھی بے تکلف نہیں رہیں، جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ پردہ کے خاص لحاظ رکھنے والی پورے اسلامی ذہن کی خاتون ہیں، اللہ تعالی وہ ان کی اولاد کو مزید توفیق عطا کرے۔

عارفہ بیگم کو جہاں تک میں نے اندازہ کیا کہ اپنی مریضہ ساس سے نہایت ہمدردی رکھتی تھی، ہماری عام روایات کے تناظر میں عرض ہے کہ ہمارے گھریلو معاشرے میں عام طور پر ساس کو بہو سے اور بہو کو ساس سے آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت رہتی ہے، بسا اوقات ساس کوئی نہ کوئی بات طنزیہ انداز میں بہو سے کہتی رہتی ہے، اسی طرح بہو بھی کسی نہ کسی رنگ میں ساس کو نشانۂ طنز بنائے رکھتی ہے۔ لیکن مولانا کے گھر سے ایسی کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔ تھوڑی بہت کوئی بات اس حوالے سے ہوئی بھی ہو تو وہ کسی کے سامنے کبھی نہیں آئی۔ بہرحال عارفہ بیگم نے اپنی بیمار ساس کی بڑی خدمت کی، بالآخر ان کی بیمار ساس انہی کی رہائش گاہ میں انہی کے ہاتھ پر ۱۹۹۲ء میں رحلت کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس عنوان کے آخر میں چلتے چلتے ایک بات بتاتا چلوں مولانا حسین احمد صاحب اپنی اہلیہ کی نہایت قدر کرتے ہیں، اور جہاں تک میں جانتا ہوں کہ محترمہ بھی اپنے لائق خاوند کی عزت ووقار کا خاصا خیال رکھتی ہیں، مولانا اپنے خاص اوقات میں راقم سطور سے دونوں کے درمیان ہونے والی عزت واحترام

اور باہم قدردانی کی باتیں بڑے شگفتہ انداز میں کہہ سناتے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی دونوں کی باہمی محبت میں مزید برگ وبار لائے۔

جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی جا چکی ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب نے ۱۹۸۴ء سے لے کر ۱۹۸۸ء تک مجھ جیسے ناچیز کو کچھ پال پھوس کر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ انڈیا بھیجنے کے لئے تیار کیا، اور تو اور اس تیاری کے دوران ان دونوں نے کتنی تکلیفیں برداشت کیں وہ بھی ایک الگ داستان ہے، جس کی تفصیلات سے قطع نظر ایک واقعہ کا تذکرہ یہاں کئے دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میرے ندوۃ العلماء کے سال اول مصارف کے حوالے سے مجھے بڑی پریشانی لاحق ہوئی تھی، کبھی دل چاہتا تھا پڑھائی چھوڑ چھاڑ کر بنگلا دیش واپس چلا جاؤں، لیکن دل مانتا ہی نہ تھا، ایسے حالات میں صدیق مکرم مولوی نورالہدی قاسمی ندوی صاحب (۱) جو اسی زمانے میں ندوے پڑھتے تھے، کسی ضرورت پر بنگلا دیش گئے، انہوں نے چاٹگام میں مولانا حسین احمد صاحب سے ملاقات کی، یوں مولوی صاحب کی زبانی

---

(۱) صدیق مکرم جناب مولوی نورالہدی بن مولانا فیاض احمد کی پیدائش نلبنیہ منگڈو میں ہوئی، لڑکپن میں والدین کے ساتھ پہلے متحدہ عرب امارات پھر سعودی عرب پہنچے، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم وہیں پا کر بنگلا دیش آئے، اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں جماعتِ اولی تک تعلیم پائی، اس کے بعد ہندوستان کا سفر کیا، اور دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، یہاں مسلسل دو سال پڑھ کر ۱۹۹۱ء میں کلیۃ الادب العربی سے سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد بنگلا دیش ہوتے ہوئے جدہ سعودی عرب پہنچے تھے۔

فراغت کے معا بعد بنگلا دیش آئے، یہاں دو مہینے گزار کر والدین کے یہاں جدہ پہنچے، ابھی آپ وہاں پہنچے دو چار دن بھی گزرنے نہیں پائے کہ آپ کی شادی خانہ آبادی کی تیاری مکمل ہوگئی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا کہ رات سونے کے بستر پر کسی کی بھی بے خبری کے عالم میں آپ کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا ایک باشعور، حساس اور بڑے باخبر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ دل دردمند اور فکر ارجمند کے مالک انسان تھے، رابطۃ الطلاب المسلمین الروہانجیین ارکان برما کے سرکردہ لیڈر رہ چکے تھے، اس پلٹ فارم سے ہندوستان میں بھی آپ نے ارکانی طلباء کی کافی خدمات انجام دی تھیں، آپ راقم کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، قومی امور کے حوالے سے آپ کے ساتھ متعدد مرتبہ سفر کا موقع ملا تھا، بڑے با اخلاق، ہنس مکھ اور سنجیدہ اور فعال انسان تھے، اللہ تعالی آپ اور آپ کے والدین کی مغفرت فرمائیں۔

مولانا میرے حالات سے واقف ہو گئے تو مولوی صاحب کی واپسی پر مولانا نے ایک اطلاع کے مطابق اپنی شریکِ حیات کی ہار رہن میں رکھ کر میرے لئے پچاس ڈالر کا تحفہ بھیجا، اور ساہی تھ ایک رسالہ بھی میرے نام لکھا، یہاں جس سے چند سطریں حاضر خدمت ہیں:

''آج زندگی کی پیاری چیزیں رہن میں چھوڑ کر تمہارے پیغام کا تیار ہوا، مگر چند دنوں کے اندر پورے سال کا توشہ پہنچا دیتا ہوں، خدا کرے کہ یہ خوش گوار سلسلہ دراز سے دراز تر رہے، ادھر تمہارے نونہال زندگی پر لوگوں کی خشک حسرت ہے۔ ع
حسرت ہے ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجا گئے۔

ناظرین کرام کو سطور بالا کے چند سطری بیان سے اندازہ ہو چکا ہوگا کہ مولانا اور آپ کی رفیقۂ حیات کے مجھ ناچیز پر کس آن بان کے احسانات ہیں؟ طالب علموں کے ساتھ معاملات اور ان کے ساتھ سخاوت کا برتاؤ اور دریا دلی کے مظاہرے کے حوالے سے ہماری لوگوں کے جو رجانات تھے اور ہیں، ان سے اہل فکر و دانش بخوبی واقف ہیں، تو ہمارے ایسے حالات کے تناظر میں سوچا جائے تو کسی بھی اہل نظر کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ایک مفلس اور غریب الدیار طالب علم کو اس شان سے مدد کرنا، اور وقت وقت پر یاد رکھنا کس دلی رجحان کا عکاس ہے، جب کہ مولانا محترم اس وقت معاشی لحاظ سے بڑی مشکلات کے شکار تھے، جو سطور بالا کے مندرجات سے ظاہر ہیں، یہاں مجھے تعجب اس بات کا ہے کہ مولانا تو آخر مولانا ہی ہیں، جن کی دریا دلی اور فیاضی کی ایک الگ داستان ہے، رہی آپ کی رفیقۂ حیات کی دریا دلی اور وسعتِ ظرفی جو اس زمانے تک میری نظروں سے اوجھل تھی، مذکورہ فراخ دلی سے آشکار ہو گئی، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنے خاص فضل و عنایات سے ان دونوں کی حیات میں برکت دے اور ان کی یہ اور اس قسم کی فیاضی اور دریا دلی ان کی اولاد و احفاد کے حق میں کام آئے۔

دوسری طرف ایک اطلاع یہ بھی ملی کہ مولانا حسین احمد صاحب نے ان کے بیان کے مطابق جو ہار رہن میں چھوڑ کر میرے لئے پچاس ڈالر کا توشہ بھیجا تھا وہ میرے اور ان کے ایک قابل قدر سخی انسان نے دیا تھا، لیکن جو کچھ بھی کیوں نہ ہو کہ میرے نام تو مولانا ہی نے بھیجا تھا، اس لئے میرے نزدیک اس احسان پر شکر یہ ملنے کا مستحق مولانا ہی ہیں۔

مولانا کی دوسری اہلیہ

مولانا حسین احمد صاحب ۲۰۰۲ء میں سعودی عرب گئے، ظاہر ہے کہ آپ اتنے سالوں تک بنگلا دیش سے سعودی عرب آتے جاتے رہے تھے، لیکن آپ کا یہ سفر تا دم تحریر وہاں کے لئے آخری سفر ثابت ہوا، آپ نے اس سفر کی ابتدا میں مکہ مکرمہ میں نجی تجارت شروع کی، آپ کے مطابق جس میں اللہ تعالی نے کافی برکت دی، اور بڑی قلیل مدت میں لاکھوں کی کمائی ہاتھ آئی تھی۔

مالی اعتبار سے کچھ فراوانی کے بعد غالباً ۲۰۰۷ء میں آپ نے دوسری شادی کی ٹھان لی، کافی تلاش و جستجو کے بعد وطن کے معروف قصبہ فوئمالی میں رہنے والی ایک خاتون کی خبر ملی تو اس کے گھرانے سے رابطہ کیا گیا، ویسے گھرانہ بھی اپنی بیٹی دینے اور سعودی عرب بھیجنے کے لئے راضی ہو گیا، تو آپ نے اپنے ایک شاگرد کے تعاون سے اس خاتون کو سعودیہ لے جانے میں کامیابی حاصل کی، اور نکاح کی صورت میں آپ کا دوسرا گھر بس گیا تھا۔

مولانا کی یہ دوسری گھر بسائی کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کے لئے پہلی والی اہلیہ بھی آئی تھی، اس حوالے سے مولانا کا بیان تھا کہ: ''دونوں کے درمیان بہت محبت ہو گئی، دونوں ایک دوسری کو سگی بہن جیسی دیکھنے لگیں، ان کی آپس کی محبت دیکھنے کی قابل تھی، جو میری توقع سے باہر تھی''۔

محلہ خالدیہ مکہ مکرمہ میں مولانا کے اس دوسرے گھر میں آپ سے میری متعدد ملاقاتیں رہیں، دراں حالیکہ اس دوسری اہلیہ کے بطن سے پہلی صاحب زادی تسنیم پیدا ہوئی کوئی ڈیڑھ دو سال ہو چکے تھے، آپ کو ان کی اس دوسری اہلیہ کے حوالے سے کافی مطمئن نظر آیا، اور اس کے متعلق پوچھنے کی جرأت رندانہ کی گئی تو فرمانے لگے:

''دراصل یہ میری دوسری شادی ایک ضرورت اور مجبوری کی بنیاد پر ہوئی تھی، مبادہ اگر یہ شادی نہیں ہوئی ہوتی، تو ایک طرح کی میری جسمانی اور روحانی حالت آج تک دگر گوں ہو چکی ہوتی، اللہ تعالی کا کرم ہے کہ اس نے مجھے ایک مشکل سے بچا لیا''۔

بہر حال مولانا کی زندگی خوش و خرم گزر رہی تھی، اس اہلیہ کے بطن سے دو صاحب زادیاں تسنیم اور کوثر بھی پیدا ہو چکی تھیں، ایسے حالات میں قدرت کو کچھ اور منظور ہو گیا کہ آپ کی اس خوش حالی پر

حاسدین کی نظریں لگ گئیں، اور مولانا بالکل غیر متوقع اور ناگہانی طور پر زیر حراست ہو گئے، تو آپ کی یہ اہلیہ وہاں کے حالات (جو اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہیں) اور مشکلات و مصائب کی شکار ہوگئی، اور بڑی مجبوری ومعذوری کی حالت میں اس نے ہماری برادری کے ایک صاحب سے شادی کر لی، ویسے وہ مولانا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئی۔

ظاہر ہے کہ مولانا کوئی آٹھ نو سال بعد جیل سے رہا ہو سکے، صاحب زادیاں جو ماں کے ساتھ رہتی ہیں ماشاء اللہ کچھ بڑی سی ہوگئی ہیں، شنید ہے کہ ہمیشہ باپ سے ملنے آیا کرتی ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کی حیات دراز کرے، اور ان کی جتنی کمیاں ہیں، غیب سے پوری ہو جائیں۔

حجاز مقدس کا پہلا سفر

جامعہ اسلامیہ دار السنہ نہلا کی خدمات کے دوران مولانا حسین احمد صاحب نے اس ادارے کے مہتمم اور دانش ور جناب فقیر منظور احمد/ ابو المنظور صاحب (۱) کی معیت میں حجاز مقدس کا پہلا سفر کیا، جس میں آپ کو حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی سعادت نصیب ہوئی، اس حیثیت سے آپ کا یہ دورہ بڑا بار آور ثابت ہوا، ایک طرف اس سفر کی وجہ سے حجاز مقدس میں پائے جانے والے بعض اہل خیر حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں، تو دوسری طرف مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں رہائش پذیر روہنگیا برادری کے دل جلے افراد و شخصیات کو قریب سے دیکھنے ان سے سننے اور ان کو سنانے کا موقع ملا تھا۔

---

(۱) محترم جناب الحاج فقیر منظور احمد/ ابو المنظور صاحب مرحوم نہلا، ٹیکناف کے رہنے والے تھے، خاندانی طور پر صاحب ثروت ہونے کے علاوہ صاحب اقتدار بھی تھے، کیوں کہ آپ اس علاقے کے معروف چیرمن جناب مرحوم عبد الغفور میاں صاحب کے سگے بھائی تھے، یوں تو کہنے میں آپ ایک دانش ور تھے، لیکن ان کا وضع قطع، چال چلن اور ڈھنگ وادا عالم دین جیسی تھی، انہوں نے اپنے طویل دور اہتمام میں اندرونِ مدرسہ اور باہر بھی بجا طور پر شاید ہی کسی عالم دین کو اس شکایت کا موقع دیا ہو کہ وہ ایک عالم نہیں بلکہ ایک دانشور ہیں، انہوں نے عرصۂ دراز تک اس ادارے کے اہتمام کی ذمے داریاں بڑے حسن وخوبی سے نبھائیں، ان کے زمانے میں اس ادارے کی ترقی کے ساتھ کافی شہرت بھی ہوئی تھی، آپ نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی بڑی قدر کی، اللہ تعالی ان کے مراتب بلند فرمائے۔

یہ تو ظاہر سی بات ہے کہ مولانا ایک عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فکری، سیاسی اور انقلابی سوچ رکھنے والے انسان ہیں، تو جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ نے اس سفر کے دوران وہاں پائی جانے والی روہنگیا برادری کے قوم وملت پر سوچ رکھنے والے اہم لوگوں سے ملاقاتیں کیں، اور ان سے روہنگیا قوم وملت کے مستقبل کے حوالے سے تبادلۂ خیالات کیا، اور قوم کے متعلق اگلے لائحۂ عمل پر غور کیا گیا تھا، اور مشورہ چاہا کیا کہ ملت وقوم کے ایسے حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

اس سفر کے حوالے سے بعد میں آپ کی باتوں سے جہاں تک اندازہ ہوا کہ ہماری برادری کے بعض دل جلے افراد نے جن میں قابل قدر علماء اور دانش وران تھے، آپ کو زیر زمین انقلابی میدان میں اترنے اور اس کے لئے میدان ہموار کرنے کا مشورہ دیا۔

چند مہینوں کے لئے وطن واپسی

غالبا مولانا حسین احمد صاحب کی مذکورہ حجاز مقدس کے پہلے سفر کے دوران یا بعد کے اور ایک سفر میں آپ کے خیر ندیش و استاد حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری مہتمم جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ سے ملاقات ہوگئی۔ یاد رہے کہ مولانا مظاہری صاحب اس زمانے میں مع اہل خانہ رنگون میں رہائش پذیر تھے، لیکن کبھی کبھار حجاز کے دورے پر نکلتے تھے۔ بہر حال مولانا مظاہری نے آپ کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ وطن واپس ہو کر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کی خدمت کریں، تو آپ نے مظاہری صاحب کی اس پیش کش کو اس لئے قبول کیا کہ آپ اندرون وطن جا کر درس و تدریس کی آڑ میں قوم کے اگلے مستقبل کے لئے افراد تیار کریں گے، یوں حجاز مقدس کے سفر سے واپسی کے فورا بعد آپ نے وطن کی راہ لی۔

مولانا نے وطن پہنچتے ہی اپنے آبائی پرانے گھر کو توڑ کر ایک نیا مکان بنا لیا، تاکہ یہ مکان آپ کی رہائش کے لئے شایانِ شان ہو، اس نئے گھر کے بنانے کے دوران مولانا سے میری زندگی کی پہلی ملاقات ہوئی، جو آگے چل کر بڑی باثمر نکلی ہے۔

ایک دن کا واقعہ تھا مولانا اپنی بستی سے ہماری بستی میں اپنے اس بننے والا نیا مکان کے لئے بانس

خرید نے آئے، آپ کے ساتھ آپ کے دیرینہ ساتھی مولوی ابوطاہر صاحب باغکونوی بھی تھے، دونوں ہماری بستی کا رہنے والا سلطان احمد جو مولانا کے رشتے کا بھائی تھے کے گھر کے آنگن میں درخت کے جھنڈ میں قربِ راہ کھڑے تھے، ادھر سے میں مدرسہ کو نکلا تو مدرسہ جانے کے راستے پر ان دونوں کو کھڑے کھڑے محوِ گفتگو پایا، میں قریب گیا تو مولوی ابوطاہر صاحب نے آپ سے میرا تعارف (بحیثیت ایک ہونہار طالبعلم) بڑے بلند الفاظ میں کرایا، تو آپ نے مجھے پاکر خوشی کا اظہار کیا، شاید اس خوشی کا سبب یہ بھی ہو کہ آپ جس نیک مقصد کے تحت وطن آئے ہیں اس کا پہلا ثمرہ میں ہی نکلا۔ اور اپنے مخصوص انداز میں میرے ساتھ کچھ ایسی گفتگو کی جو میرے خواب وخیال سے کہیں بلند تھی، اور لگا کہ آپ کی اس تھوڑی سی گفتگو میں میرے دل کی ساری دھڑکنیں چھپی تھیں، ویسے میں آپ پر فدا ہو کر مدرسہ جانے کا ارادہ تک چھوڑ دیا، اور سارا دن آپ کے ساتھ رہ گیا۔

اب مولانا اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد بشمول مولوی ابوطاہر صاحب گھر جانے لگے تو میں نے مولوی ابوطاہر صاحب کے واسطے سے آپ کے سامنے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں، تو میری یہ خواہش سن کر آپ بڑے خوش ہوئے، یوں میں آپ کے ساتھ ہو گیا تھا۔

رات گئی تک مولانا ہم دونوں سے محوِ گفتگو تھے، رات کھانے کے بعد چائے کا دور چلتا رہا تھا، یہاں میں نے آپ کی زبان سے ایسی ایسی باتیں سنیں جو دراصل میرے بن چھیڑے سازِ دل کی آوازتھیں، گویا یوں لگتا رہا تھا کہ میری بن چھیڑی تاروں پر آپ نے اپنی کارگر مضراب سے ضرب لگا رہے تھے، آپ کی ہر ایک باتیں میرے ذہن ودماغ کے راستے سے گزر کر دل کو چھو رہی تھیں، دراصل بات یہ ہے کہ آپ سے اس پہلی ملاقات میں جو باتیں میں نے سنیں، ان کے تأثر کی تفصیلات بیان کرنے سے میرا گونگا قلم سرے سے قاصر ہے۔

اگلے دن مولانا پھر ہماری بستی کو جانے لگے، وہاں آپ کی کچھ ضروریات تھیں، میں اور مولوی ابوطاہر صاحب آپ کے ہم راہ تھے، بعد عصر راہ چلتے چلتے میں نے آپ سے ڈرتے ڈرتے ایک سوال کیا کہ مولانا! شاعر مشرق علامہ اقبال کے درج ذیل شعر کا مطلب کیا ہے؟

کہیں تہذیب کی پوجا کہیں تعلیم کی ہے

قوم دنیا میں یہی احمد بے میم کی ہے

مولانا نے یوں تو راہ چلتے چلتے اس شعر کا مطلب ومفہوم اپنی دانست کے مطابق بیان کر دیا، لیکن مولانا کے بیانات میرے دل کو چھو نہیں رہے تھے، کیوں کہ میں بزعم خود اس کا مطلب سمجھنے والا تھا، ادھر مولانا بھی تو طلبہ کی نفسیات سمجھنے کے ماہر ہیں، تو میری حرکات وسکنات سے یہ سمجھ گئے کہ میں آپ کے بیان کردہ مطالب ومفاہیم سے خاطر خواہ خوش نہیں ہوں، ویسے آپ بھی کب چھوڑنے والے تھے؟ یوں آپ اگلے تین چار گھنٹے اس شعر کے مطالب ومفاہیم کے بیان کرنے میں صرف کر ڈالے۔

اس بار مولانا نے مذکورہ شعر کے مطالب ومفاہیم کے حوالے سے ایسی ایسی حقیقتیں کھولیں جو میرے خواب وخیال سے بھی کہیں بلند تھیں، اب میں مطمئن ہونے کے ساتھ آپ کی علمی استعداد اور فکری پرواز کا مزید فریفتہ ہو گیا۔

ویسے مولانا کی معیت میں چند دن گزر گئے، میں مدرسہ کی پڑھائی سمیت ہر چیز کو بھول کر آپ کا ہو چکا تھا، ایسے میں میں نے آپ سے گزارش کی کہ آپ مجھے باضابطہ طور پر کچھ پڑھانا شروع کر دیں، تو گزارش کی قبولیت کے ساتھ میری پڑھائی شروع ہوگئی تھی۔

مولانا نے میرے درس کی ابتدا ''مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی معروف کتاب ''روائع محمد اقبال'' سے کی، ساتھ ہی ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''رسول رحمت'' کے بھی کچھ مضامین پڑھانے لگے، ایک روز آپ نے اپنی طرف سے فرمایا کہ انشاء کی پڑھائی بھی بہت اہم اور ضروری ہے، ویسے انشاء کی پڑھائی بھی شروع ہوگئی تھی، اور یہ سلسلہ اگلے چند مہینوں تک مسلسل جاری تھا، جس سے میری علمی وادبی، فکری اور قلمی زندگی میں وہ فائدے ہوئے جن کے بیان سے میرا قلم قاصر ہے۔

میرا جماعت دوم کا سال تھا، سالانہ امتحان قریب آرہا تھا، والدین اور اساتذۂ کرام کی طرف سے مسلسل دباؤ آرہا تھا کہ کیوں میں مدرسہ کی پڑھائی اور امتحان کی تیاریاں چھوڑ کر مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ ہو گیا؟ مگر میں کسی کی سننے کو تیار نہیں تھا، ایسے میں اچانک ہوا یہ کہ مولانا محترم چند دن کے لئے بنگلا دیش گئے، تو میں نے اس درمیانی خلا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امتحان کی تیاریاں کرلیں اور سالانہ امتحان میں شریک ہو گیا۔ ابھی امتحانات ختم ہونے کا قریب تھا، ادھر سے مولانا بھی

آ گئے، پھر میں آپ کی ذات سے ایسا وابستہ و پیوستہ ہو گیا کہ آج تک علیحدگی کے نام تک کہاں؟

حقیقت یہ ہے کہ مولانا محترم سے چند مہینے کی پڑھائی نے میری زندگی کو بدل ڈالا،، میرے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ، میرے انداز و اطوار کے علاوہ طرز گفتگو میں بھی خاصا بدلاؤ آ چکا تھا، لوگ تو کہہ ہی رہے تھے، ساتھ ساتھ جس کا انداہ مجھے خود بھی ہو رہا تھا، ان ساری چیزوں کو دیکھ کر کچھ میرے دیرینہ ساتھیوں میں حقد حسد کا بھبو کا پوٹنا شروع ہو گیا تھا، اور تو اور خود مولانا کی زبانی یہ بات سن کر نہایت ہی افسوس ہوا کہ ''میرے ایک استاد نے آپ سے شکایت کی کہ مولانا حسین احمد صاحب! طاہر بڑا ادب نا شناس ہے، ذرا اس کا خیال رکھنا، اور کبھی اسے اپنے سر پر چڑھانے کی کوشش نہیں کرنا۔ ع

حسرت ہے ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا گئے۔

بہر حال یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال آ سکتا ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب جامعہ دار السنہ نہلا جیسے علم و عمل اور درس و تدریس کے ماحول کو چھوڑ کر اندرون وطن کیوں گئے تھے، سرزمین بنگلا دیش تو درس و تدریس کے حوالے سے بہر صورت ارکان سے زیادہ موزون تھی، جہاں عزت تھی، شہرت تھی، نیک نامی تھی اور امن تھا، اندرون وطن میں تو پریشانیاں ہی پریشانیاں تھیں، یہاں امن و سکون نام کے کسی عنقاء کا تذکرہ بھی کرنا ایک بہت بڑا جرم تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مولانا محترم اگر چہ بظاہر اپنے محسن استاد حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری کی خواہش پر جامعہ اسلامیہ عالیہ میں پڑھانے کے لئے وطن واپس گئے تھے، لیکن حقیقت میں آپ کا وطن لوٹنا ایک عظیم خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے بطور تھا، جس کا تذکرہ اگر چہ کچھ دبے ہوئے الفاظ میں پچھلی سطور میں کیا جا چکا ہے، لیکن قدرے تفصیلات یوں ہیں کہ در اصل آپ اپنے وطن کے لئے ایک قافلۂ سخت جان کی تیاری کے لئے ہمیشہ کوشاں تھے اور ہیں، آپ نے ہماری تاریخ سے سبق لیتے ہوئے فیصلہ کر لیا تھا کہ مختلف خیالات، متنوع نظریات اور بھانت بھانت کے مکاتب فکر کے لوگوں کے اجتماع سے ایک بامعنی قافلہ کبھی بھی تیار نہیں ہو سکتا، اس قافلۂ سخت جان کی تیاری کے لئے مخصوص تعلیم و تربیت کے ساتھ ایک ہی خیال، ایک ہی فکر اور ایک ہی نظریہ کے حامل لوگوں کی تنظیم اور تربیت کی ضرورت ہے، جو آگے چل کر قوم کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے، اس لئے آپ نے

کمر ہمت باندھ کر اندرون وطن جانے کا فیصلہ کیا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وطن کی زمین بڑی کٹھن اور سنگلاخ ہو چکی ہے، مذکورہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی راہ میں ہزار مشکلات کی دیواریں کھڑی ہیں، مصائب اور مشکلات کے سات سمندر پار کرنا بھی ہے۔

شاید مولانا کو پوری امید تھی کہ اس زمانے کے مہتمم حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب کے زیر اثر جامعہ اسلامیہ عالیہ کے ارباب بست کشاد کی جانب سے آپ کا بھرپور استقبال کیا جائے گا، لیکن ایسا نہیں ہو سکا، آپ نے بھی اس استقبال کا انتظار کیا، لیکن بے سود، تاہم اس انتظار کے دوران آپ کو علاقے کے بعض نامور مدارس کی جانب سے دعوت دی گئی تھی کہ آپ آئیں اور اپنی شخصیت سے رونق بخشیں، لیکن آپ نے قبول نہیں کی، اسی طرح علاقے کے بعض علماء، دانشوران اور خیر اندیشوں نے گزارش کی تھی کہ آپ اپنے انداز کے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھیں، مگر آپ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے، آپ نہیں چاہتے تھے کہ ایک علیحدہ مدرسہ یا مکتب فکر کی بنیاد رکھ کر رسہ کشیوں کا دور دورہ شروع کر دیں، جو عام حالات میں یہاں کی روایات ہیں، جو آپ کے افکار اور نظریات کی منافی ہیں۔

آخر کار چند مہینے گزرتے نہ گزرتے مولانا کو اپنے وطن کے ماحول اور فضاء سے ایک حد تک مایوسی اور ناامیدی کا احساس ہو گیا، یہ الگ بات ہے کہ میرے ناقص خیال میں جو بھی ہوا تھا وہ آپ کے لئے بہت ہی اچھا ہوا تھا، کیوں کہ آپ جس بلند خیال اور عالی پروگرام کے حامل ہیں اگر آپ جامعہ اسلامیہ عالیہ میں براجمان ہو بھی جاتے تو شاید آپ کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہو پاتا، کیوں کہ وطن کی فضاء جس قدر مسموم ہو چکی تھی، اور بعد میں اس میں مزید جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کے تناظر میں یہ تحقق ہوا کہ وطن کی فضاء اور ماحول آپ کے لئے کبھی بھی سازگار نہیں ہو سکتا تھا۔

ظاہر ہے کہ مولانا ایک بلند و برتر خیال کے آزاد طبع انسان ہیں، غلامی کی زندگی آپ کو کبھی قبول نہیں، ساتھ ساتھ ایک عظیم مبصر ہونے کے علاوہ ایک حریت پسند عالم دین بھی ہیں، اگر آپ اپنے وطن کو مزید سینے سے لگائے رکھنے کوشش کرتے تو خاکم بدہن وطن کی سرزمین میں ایک دوسرے حضرت مولانا دین محمد شہید فرنگی کی شہادت کا واقعہ پیش آ سکتا تھا۔

ان تمام حقائق اور واقعات کو سامنے رکھ کر مولانا کے ذہن رسا نے اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ وطن

کے لئے جو کرنا ہے وہ ضرور کرنا ہے، جس کے لئے وطن کی زمین بالکل سازگار نہیں ہے، اگر کچھ کرنا ہے تو دوبارہ ترک وطن کر کے بنگلا دیش جانا ضرور ہے، وہاں جا کر پروگرام کے مطابق کام کو آگے بڑھانا ہے، بہر کیف ایک قافلۂ سخت جان کی تیاری کی کوشش کرنی ہے، اس لئے آپ نے دوبارہ ترک وطن کی زحمت گوارہ کی، یوں دوبارہ بنگلا دیش چلے آئے۔

مولانا کے ساتھ ایک مختصر سفر

مولانا حسین احمد کے ساتھ میری مذکورہ اس فکری و ذہنی ہم آہنگی کے دوران آپ کے ساتھ مجھے ایک مختصر سا مگر مفید سفر کا موقع ملا تھا، ایک روز کا واقعہ تھا کہ آپ نے مجھے ساتھ لے کر قصبۂ فوئمالی کا دورہ کیا، جہاں آپ نے وہاں کے معروف عالم دین حضرت مولانا عبدالاول صاحب مدیر جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم فوئمالی (۱) کے علاوہ دیگر چند نامور علمائے دین سے ملاقات کی، مولانا عبدالاول

---

(۱) جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم ڈھودائنگ فوئمالی جو علاقۂ بوسیدنگ کی ایک مشہور و معروف دینی و علمی درس گاہ ہے، جہاں مشہور و معروف عالم دین، مفسر و محدث فقیہ زمان حضرت علامہ سلطان احمد فوئمالوی رحمۃ اللہ علیہ درس دیا کرتے تھے، تقریباً ۱۹۸۰ء سے پہلے بمقام جبار فارہ فوئمالی میں جامعہ اسلامیہ کے نام پر اور ڈھودائنگ فارہ فوئمالی میں مدرسہ مدینۃ العلوم کے نام پر دو الگ الگ درس گاہیں تھیں، دونوں کے درمیان خاصی رسہ کشی اور شدید اختلاف پایا جاتا تھا۔ اللہ تعالی حضرت مولانا محمد ادریس صاحب نور اللہ مرقدہ سعد اللہ سری کی قبر پر بارانِ رحمت برسائے کہ حضرت کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں دونوں درس گاہیں ایک ہوگئیں، اور دونوں کے سنگم کو جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم ڈھودائنگ دیا گیا۔ اس انظمام کے بعد یہ ادارہ علاقے بھر میں تعلیم و تدریس کے اعتبار سے مشہور ہو گیا تھا، ہم اپنے تعلیمی زمانے میں اس کی شہرت سن کر چاہتے تھے کہ وہاں جا کر بطور خاص حضرت مولانا سلطان احمد صاحب سے استفادہ کریں، لیکن بعد میں یاد نہیں ہے کہ کیوں اس استفادے کا موقع نہیں ہوا تھا؟ جس کا افسوس زندگی بھر رہا۔

جس زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب وہاں گئے تھے، اس سے چند سال پہلے حضرت علامہ سلطان احمد صاحب انتقال کر چکے تھے، حضرت مولانا عبدالاول صاحب کے علاوہ دیگر علمائے کرام سے مولانا نے قومی و ملی امور پر کافی تبادلۂ خیالات کیا، اور دورہ بار آور ثابت ہوا، مولانا عبدالاول صاحب نے مولانا حسین احمد صاحب کا پر تپاک استقبال کیا، اور اپنے گھر میں کھانے کی دعوت کی، جس میں بڑے بڑے علماء شریک ہوئے، اللہ تعالی مولانا عبدالاول صاحب کی حیات میں برکت دے، آمین۔

صاحب نے آپ کا شاندار طریقہ سے استقبال کیا، علاقہ کے بڑے بڑے علمائے کرام کی شمولیت میں اپنے گھر میں کھانے کی دعوت کی، اور بڑے سلیقے سے انتظام کیا، علماء سے بھری مجلس میں مولانا حسین احمد صاحب نے بعض ضروری قومی و ملی امور پر مذاکرات کئے، اور آپ نے اپنے خیالات و افکار سے ان کو مطلع کیا، اس سفر میں آپ نے حضرت علامہ سلطان احمد صاحب کی زندگی کے حوالے سے طول طویل گفتگو کی، اور حضرات علمائے کرام سے ان کے حالات اور دل چسپ واقعات سنے، آخر میں مولانا عبدالاول صاحب کے سر یہ ذمے داری سونپی گئی کہ وہ حضرت علامۂ زمان مولانا سلطان احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر قلم اٹھا کر دنیا کے سامنے پیش کریں۔

جلسۂ عام میں مولانا کا ایک کامیاب خطاب

غالباً ۱۹۸۴ء کے آخری مہینوں میں ہماری بستی باغکونہ کے مدرسے کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، جس میں اطراف کے عوام کے علاوہ کثیر تعداد میں علمائے کرام اور بزرگان دین حاضر تھے، جس میں مولانا حافظ محمد طیب صاحب چاؤفرانگی (مجاز بیعت حضرت مولانا شاہ عبد اللطیف صاحب کچھر بیلوی) بحیثیت خطیب تشریف فرما تھے، مولانا حسین احمد صاحب کو بھی اس میں مدعو کیا گیا تو آپ نے بھی تشریف لانے کی زحمت اٹھائی تھی۔

مولانا حسین احمد جس وقت جلسہ گاہ تشریف لائے اس وقت حافظ محمد طیب صاحب خطاب کر رہے تھے، اور{ **و ننزل من القرآن ما هو شفاء ورحمة للمومنين ولايزيد الظالمين الا خسارا**} کی تفسیر و تشریح فرما رہے تھے، تو ابھی مولانا کی تشریف آوری ہوئی تو حافظ صاحب نے اپنی تقریر مختصر کر لی اور اسٹیج سے اتر کر قریب کی جامع مسجد میں پناہ لی تھی۔

اب منتظمین جلسہ نے مولانا سے گزارش کی کہ آپ اسٹیج پر تشریف لا کر اظہار خیال فرمائیں! تو آپ نے گزارش قبول کی اور بڑے دل نشین انداز میں خطاب فرمایا، دوران خطاب آپ نے آیتِ بالا کی تشرح و تفسیر اس انداز میں بیان فرمائی کہ حافظ صاحب کی تردید بھی ہوگئی اور آیت بالا کا مطلب و مفہوم بھی کھل کر سامنے آ گیا۔

جلسۂ عام میں مولانا کا یہی بیان راقم کے لئے پہلا اور آج تک کا آخری بیان ثابت ہوا، آپ تو عام طور پر ایک منجھے ہوئے خطیب مشہور ہیں، سعودی عرب میں آپ نے دینی، دعوتی، علمی، فکری اور سیاسی کے علی الرغم مختلف موضوعات پر خطابات جلسۂ عام میں دے چکے ہیں، ۲۰۰۳ء کے بعد آپ نے بعض ضروری امور کے حوالے سے درجنوں جلسے منعقد کرا چکے ہیں، ان میں سے دو ایک جلسوں میں آپ نے مجھے بلایا بھی تھا، مگر افسوس ہے کہ حاضری ممکن نہیں ہو سکی تھی، تاہم ان جلسوں میں دیئے گئے بیانات کی چند کیسیٹ سننے کی توفیق ہوئی تھی، ان تمام چیزوں سے اندازہ ہوا ہے کہ آپ فی الحقیقت ایک عظیم اور کامیاب خطیب ہیں۔

جہاں تک پتہ چلا کہ مولانا طالب علمی کے زمانے سے عام جلسوں میں خطاب کرتے آرہے ہیں۔ اور یہ ایک سچائیت پر مبنی بات ہے کہ آپ کے خطبے بڑے سلیقے کے ہوتے ہیں، دھواں دار ہونے کے ساتھ ساتھ گفتگو کافی مرتب ہوتی ہے، روانی اور تسلسل کے تہ بتہ وقت وقت پر طغیانی بھی ہوا کرتی ہے، آپ کے خطبے علمی مجالس میں ہوں یا عوامی جلسوں میں، آپ کی زبان شگفتہ اور صاف ستھری شستہ اور کسی قدر عام فہم بھی ہوتی ہے، آپ کے خطبے فکری ہوں یا سیاسی و ثقافتی آپ اپنی خداداد لیاقت و صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ان میں روحانی روشنی اور توانائی بھر دیتے ہیں۔

خطبے تو خطبے ہوتے ہیں، بسا اوقات مولانا کی عام گفتگو کے انداز بھی ایک طرح کا خطیبانہ ہوتا ہے، آپ کے اسی خطابانہ جوش و ولولہ سے آپ کے بعض معاصرین کو یہ تأثر لیتے ہوئے دیکھا سنا کہ آپ ایک طرح کے جذباتی انسان ہیں، لیکن میرا خیال ان حضرات کے خیالات سے تھوڑا مختلف ہے، اگرچہ آپ کا طرز خطابت یا انداز گفتگو میں جذبات کا رنگ بھرا ہوا ہوتا ہے، لیکن عام خطیبوں اور مقرروں کے برعکس آپ کی گفتگو اور خطابات کے ہر سوتے حقیقت و واقعیت پر مبنی ہوتے اور جن میں علمی اور فکری رنگ ہمیشہ چھایا ہوا ہوتا ہے۔

نہ صرف جلسۂ عام کے خطابات و تقاریر بلکہ مولانا کی عام مجالس میں بارہا مشاہدہ کیا گیا کہ آپ اپنے زور خطابت سے کام لیتے ہوئے سامعین کے دلوں کو مسخر کرنے کے ماہر ہیں، آپ کی تقاریر سامعین کے دلوں میں جادو کا کام کر جاتی ہیں۔ تاہم جہاں آپ کی خطابت میں اتنی تأثیر کی بات ہے،

وہاں اس بات کا جائزہ لینا بھی بہت ضروری ہے کہ آیا آپ اپنی خطابت سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟

اس سوال کے جواب کے بطور مجھے صرف اتنی سی بات عرض کرنی ہے کہ عام طور پر خطیبوں کی تاریخ اور سوانح میں دیکھا گیا ہے کہ جو خطیب کسی ناروا اغراض و مقاصد کے تحت اپنی جادو بیانی سے کام لیتا ہے وہ بسا اوقات منہ پھٹ، بے لگام اور غیر ذمہ دار ہوتا ہے، وہ حق و صداقت اور انصاف و عدالت سے آزاد ہو کر گفتگو کرتا ہے، وہ سننے والوں کو تو متأثر ضرور کرتا ہے لیکن اسے بات کا سچا اور کام کا معتدل اور منصف نہیں کہا جاتا ہے، اس قسم کے خطیب کی باتوں میں حکمت کے بجائے عوام فریبی ہوتی ہے، اس کی خطابت میں کسی مظبوط و منظم فکر کے بجائے تناقص اور ناہمواری ہوا کرتی ہے، ہر کہیں اعتدال کے بجائے بے اعتدالیوں کا سماں چھایا ہوا ہوتا ہے، وہ محض دنیا والوں کے سامنے اپنے سکے جمانے کے لئے چرب زبانی سے کام لیتا ہے، اس کی خطابت کی تأثیر سے سننے والوں میں کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہوتی ہے نہ ان کی زندگیوں میں کوئی مفید تغیر رونما ہوتا ہے، اور نہ اس کی خطابت سے کوئی صالح فکر یا صالح عملی حالت پیدا ہوتی ہے۔

جب کہ مذکورہ قسم کے خطیبوں اور مقرروں کے برعکس داعیوں، مبلغوں، صحیح اور معتدل فکر و مزاج کے رہنماؤں کی خطابت میں حکمت و دانائی کے علی الرغم معتدل اور مناسب نظام فکر ہوتا ہے، انصاف و صداقت سمیت کامل درجہ کا التزام ہوتا ہے، اس کی ہر بات نپی تلی ہوتی ہے، ان کی خطابت میں مخلوق خدا کی رہنمائی اور اصلاح و رشد کے سوا کسی دوسرے مقاصد و اغراض کا شائبہ تک نہیں ہوتا ہے، ایسے لوگ جو بھی کہتے ہیں ان کی زندگی اس کے عملی نمونہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی ذاتی، خاندانی اور فاسد عصبیات سے دور ہوتی ہے، تو ظاہر ہے کہ ان خطیبوں اور مقرروں کی خطابات اور تقریروں سے جو اثرات مرتب ہوں گے وہ بڑے عمیق، دوررس اور نتیجہ خیز ہوں گے۔

مذکورہ اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب کو جنہوں نے قریب سے دیکھا، اور ان سے سننے کا موقع ملا، آپ کی خطابت کے متعلق ان کی دو مختلف اور متضاد قسم کی آراء سامنے آئیں، بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ آپ کی خطابت اور خطیبانہ گفتگو اول الذکر خطیبوں کی خطابت اور گفتگو سے ملتی جلتی ہے، جب کہ بعض لوگ جن میں راقم سطور بھی ہے کی رائے یہی ہے کہ آپ کی خطابت اور خطیبانہ

گفتگو ثانی الذکر خطیبوں اور مقرروں جیسی ہے۔

رہی بات کہ دنیا میں اکثر ہوتا بھی کچھ ایسا ہے کہ جس انسان کو میدان عمل وتطبیق سے زخم سے چور ہوکر واپس آنا پڑتا ہے، اس کی باتیں جتنی بھی معتدل، مناسب اور حقیقت پسندانہ کیوں نہ ہوں، دنیا اسے گلدستے نہیں پہنایا کرتی ہے، جب کہ اس کے برعکس وہ آدمی گلدستوں کا لائق ٹھہرتا ہے کہ جس کی باتیں اگر چہ ناہموار، اغراض ومفادات سے پر کیوں نہ ہوں لیکن وہ دنگل سے فاتح ہوکر واپس آتا ہو، تو مولانا کے لئے یہ نوبت کب اور کہاں آئی ہے؟

یہ نوبت کب اور کہاں آئی کی جلو میں ایک لمبی چوڑی داستان ہے، جس کی تفصیلات پر اس عجالے میں جانا نہیں چاہتا ہوں، خدا کرے اور زندگی نے وفا کی تو وہ دن بھی ضرور آئے گا کہ اس داستان کی تفصیلات لکھنے میں مزہ آجائے۔

مذکورہ خطابت کے حوالے سے مزید کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ظاہر ہے کہ یہ مولانا کا دور شباب تھا۔خوب صورت چہرہ اور اس پر سیاہ داڑھی، جاذبِ نظر شخصیت کے مالک، قرآن وسنت کے ماہر ،اور علوم دینیہ پر کافی عبور، خطابت کی ابتداء سے آخر تک ایک طرح کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ جچے تلے الفاظ نے سامعین کو محو حیرت میں ڈال دیا تھا، آپ نے اپنی اس تقریر کو قرآن کریم کی آیاتِ مبارکہ، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آثار صحابہ واقوال ائمہ کرام اور سلف صالحین کے احوال سے استشہاد کرتے ہوئے مدلل کیا تھا، اور جہاں تک دیکھا گیا کہ جو کچھ آپ فرما رہے تھے، سارے سامعین بڑی توجہ اور نہایت انہاک سے سن رہے تھے، غرض آپ کی اس تقریر سے لوگ بے حد متأثر ہوئے تھے، ساتھ ہی ساتھ جس طرح عرض کی گئی ہے کہ اس تقریر میں آپ کی جسمانی خوب صورتی اور بھری جوانی نے بھی اپنا جلوہ دکھایا تھا، اور سچی بات تو یہ ہے کہ خود میرے ذہن پر اس تقریر کا اس قدر اثر پڑا کہ آج تک وہ ختم ہونے کا نام تک نہیں لے رہا ہے۔خدا کرے کہ آخری دم تک رہ جائے۔

چوتھا باب

مولانا کا مع اہل وعیال ترک وطن

۱۹۸۵ء کے ابتدائی مہینوں میں مولانا حسین احمد صاحب اپنی اہلیہ اور اکلوتہ بیٹا (اس زمانے تک) محمد انور کو وطن میں رکھ کر بنگلا دیش آئے، اور چاٹگام میں اپنے خیر خواہ استاد ومربی حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی سے ملاقات کی۔

حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب اسی زمانے میں جامعہ اسلامیہ ضمیریہ پٹیہ کو خیر باد کہہ کر ایک نئی درس گاہ کی سوچ رہے تھے، جو ماشاء اللہ آگے چل کر جامعہ دار المعارف الاسلامیہ چاٹگام کی شکل میں نہ صرف علاقۂ چاٹگام بلکہ پوری سرزمین بنگلا دیش کی دینی درس گاہوں کے مابین اس کی بعض الگ خصوصیات کی وجہ سے زینت بنی ہوئی ہے۔

مولانا حسین احمد صاحب اپنے استاد ومربی حضرت ذوقؔ کی شفقت اور ان کی ذات وصفات اور علم و فضل سے بے حد متأثر تھے اور ہیں، اور میرے اندازے کے مطابق استاد اور شاگرد کے مابین فکر ونظر کے حوالے سے بعض امور میں کافی ہم آہنگی بھی پائی جاتی ہے، ویسے مولانا اپنے استاد کی خواہش پر اس اگلی ہونے والی درس گاہ کی مدرسی قبول کر لی، اور وطن جا کر اپنی اہلیہ اور بچے کو لے آئے۔

اب کی بار بنگلا دیش آتے ہی آپ نے جامعہ اسلامیہ دار السنہ کی اس تنگ کوٹھی میں پناہ لی جس میں آپ وہاں کے دوران تدریس لے چکی تھی، پھر اگلے دو ایک مہینے کے بعد چاٹگام منتقل ہو گئے اور بمقام خطیب ہاٹ (بودار ہاٹ) کے ایک مختصر سے مکان میں رہائش پذیر ہو گئے، ساتھ ہی ساتھ دار المعارف میں ابتدائیہ کی مدرسی بھی شروع کر دی، آپ اس مکان میں ایک سال گزار کر چاندگاؤں

والے رہائشی علاقہ بلاک بی کے ایک خوب صورت مکان (عابدہ منزل) میں منتقل ہو گئے تھے۔

تبدیلئ مکان کے حوالے سے مولانا کی شان دل چسپی سے خالی نہیں ہے، آپ جس طرح وضع قطع اورلباس و پوشاک کے اعتبار سے حقیقی معنی میں ایک نستعلیقی کیفیت کے عالم ہیں، اسی طرح رہائش اور طرز زندگی کے اعتبار سے بھی بڑے اچھے ذوق رکھنے والے انسان ہیں، آپ کے انداز زندگی اور اطوار بودو ماند سے ہر کسی کو یہ شبہ ہوتا اور ہوسکتا ہے کہ آپ ایک صاحب ثروت و دولت مند انسان ہیں، لیکن حقیقت میں بات ایسی نہ تھی اور نہ آج بھی ہے، اس حوالے سے گفتگو کی جائے گی تو بات خاصی طویل ہونے کا اندیشہ ہے، تاہم اس بارے میں طول طویل گفتگو سے صرف نظر سر دست اتنی سی بات عرض ہے کہ ایک طرف مولانا طبعا اور فطرۃ نظافت پسند اور نستعلیقی کیفیت کے نکلے ہیں، تو دوسری طرف آپ کا کہنا ہے کہ ایک عالم دین کو ہر حالت میں علم دین کا رکھوالا ہونا ناگزیر ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک عالم دین کی چال چلن، رہن سہن اور طرز بود ماند کی وجہ سے علم دین کی عزت خاک میں مل کر علم وعلماء کی عزت وسطوت کا جنازہ نکل جائے۔

بہر حال چاٹگام میں آپ کی رہائش کے ساتھ ہی ساتھ دارالمعارف میں مدرسی شروع ہوگئی، پھر اگلے چند مہینے گزرتے نہ گزرتے حضرت ذوقؔ نے آپ کو حجاز مقدس بھیجا، جہاں آپ نے تقریبا ایک مہینے تک دارالمعاف کے چندے کے حوالے سے کام کیا اور کافی سرگرمی کے بعد واپس آ گئے تھے۔

حجاز مقدس کے اس سفر سے واپسی کے بعد کچھ حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ مولانا کو اس مدرسہ کی مدرسی چھوڑنا پڑا، جس کی قدرے تفصیلات انشاءاللہ تعالی اگلی سطور میں آئیں گی۔

ار ایس او کے صدر دفتر میں درس قرآن کریم

۱۹۸۶ء کے آخری مہینوں تک روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) مولانا سیف الاسلام صاحب شرف الدین بیلوی کی زیر صدارت کسی قدر عروج وشہرت کی منازل طے کر رہی تھی، اس سے پہلے یہ تنظیم دو دھڑوں میں منقسم تھی، ایک کی قیادت محترم اڈووکٹ نور الاسلام صاحب شیل خالوی، جب کہ دوسرے کی رہنمائی ڈاکٹر محمد یونس باغکونوی منگڈوی کر رہے تھے۔ ۱۹۸۶ء کے ابتدائی مہینوں

میں نور الاسلام والا دھڑا روہنگیا فدائین محاذ (RPF) سے مل کر ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) ہو چکا تو ڈاکٹر محمد یونس اور مولانا سیف الاسلام صاحب کی قیادت میں روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) نامی ہماری قومی سطح پر ایک ہی تنظیم رہ گئی تھی، جس میں محترم جناب ڈاکٹر محمد یونس باغکونوی صاحب (نائب صدر) اور پروفیسر محمد زکریا صاحب تنگ بازاری (جنرل سکریٹری) کے علاوہ اظہار میاں تنگ بازاری اور سعید الرحمن وغیرہ مجلس عاملہ کے اراکین تھے۔

روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی تاسیس دراصل ۱۹۸۲ء سے بھی پہلے ہوئی تھی، لیکن باضابطہ طور پر اس کا اعلان اسی سال ہوا تھا، پھر اسی سال سے لے کر ۱۹۸۶ء تک اس میں کیا کچھ ہو گزرا ان تمام تفصیلات سے قطع نظر (۱) یہاں صرف اتنی سی بات عرض ہے کہ ۱۹۸۵ء یا اس سے بھی کچھ مدت پہلے یہ تنظیم جماعت اسلامی کے زیر اثر ہو چکی تھی، جس کا خوش گوار سلسلہ اگلے چند سالوں تک جوں کا توں بحال رہا تھا، اور جماعت اسلامی کے ساتھ اس تنظیم کے تعلق سے روہنگیا مظلوم مسلمانوں اور ان کی قومی تحریک کو فکری اور سیاسی نقطۂ نظر سے آیا فائدہ پہنچا یا نقصان یہ ایک الگ موضوع بحث ہے، یہاں اس عجالے میں اس بحث میں الجھنا مناسب نہیں، تاہم اس کی قدرے تفصیلات راقم کی بعض تحروں میں موجود ہیں، مزید باتیں خدا کرے تو کسی فرصت میں ہوں گی۔

بات یہ ہے کہ ۱۹۸۶ء کے دوران روہنگیا سالیڈ یریٹی آرگنائزیشن (RSO) جماعت اسلامی کی زیر سرپرستی نہ ہو تو کم سے کم زیر نگرانی آگے قدم بڑھا رہی تھی، اس تنظیم کے صدر دفتر سے لے کر متعلقہ تمام شاخوں بشمول معسکر میں جماعت اسلامی کے تعلیمی و تربیتی پروگرام چل رہے تھے، یوں اس کے صدر دفتر جو اس زمانے میں بمقام سراج منزل (بودار ہاٹ) میں قائم تھا، کم سے کم اسبوعی بعد الجمعہ ایک درس قرآن کا سلسلہ جاری تھا، جس میں عبد اللطیف نامی ایک مولوی صاحب (جو اسی زمانے میں

---

(۱) اس حوالے سے قدرے تفصیلات بڑے محتاط انداز میں راقم سطور کی ۱۹۹۹ء میں شائع شدہ تصنیف ''سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں'' میں ملیں گی، اور یاد رہے کہ راقم کی یہ تصنیف ہمارے ایک معروف ومؤقر قومی ادارہ ارکان ہسٹریکل سوسائٹی (AHS) نے بڑے اہتمام سے چھپوا کر شائع کی، جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا، ضرورت ہو تو تفصیلات کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

چاٹگام کے کسی علاقے میں رہائش پذیر اور جماعت اسلامی سے کافی متأثر تھے، جن کی گفتگو اور طرز کلام پر بعض سامعین کے تحفظات تھے) کے علاوہ کبھی کبھار پروفیسر محمد زکریا صاحب درس دیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب دارالمعارف الاسلامیہ کے مدرس تھے، اب ڈاکٹر محمد یونس اور تنظیم کے صدر محترم مولانا سیف الاسلام صاحب کے علاوہ دیگر چند کارکنان (ا) تنظیم کی نظریں آپ پر پڑیں تو انہوں نے کوششیں شروع کردیں کہ کسی بھی طریقے سے آپ کو اس اسبوعی درس کے لئے آمادہ کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو اس بہانے سے جماعت اسلامی کے زیر اثر چلنے والی روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) میں شمولیت پر رضامند کیا جائے۔

بہرحال مولانا اس درس قرآن کے لئے آمادہ ہوگئے، اور ہر جمعہ بعد العصر آپ سج دھج کے شیروانی میں ملبوس درس کے لئے جاتے تھے، میں اسی زمانے میں آپ کی زیر سرپرستی وزیر نگرانی دارالمعارف الاسلامیہ کا متعلم تھا، اور روز جمعہ میرے لئے گویا عید کا دن ہوتا تھا، میں بعد جمعہ ہی آپ کی رہائش گاہ پہنچ جاتا اور بعد العصر متصلا آپ ہی کے ساتھ درس گاہ یعنی تنظیم کے صدر دفتر جایا کرتا تھا۔

مولانا اس درس میں حالات کے تقاضے اور وقت کی نزاکت کے پیش نظر ایسی ایسی باتیں زیر بحث لاتے جو علمی، فکری، ثقافتی، تمدنی، دینی اور سیاسی لحاظ سے کافی مفید تھیں، اور انداز بحث وطرز گفتگو بھی بڑا انوکھا، نرالا اور دل و دماغ کو چھونے والا ہوا کرتا تھا، قرآن وسنت، تعامل صحابہ، احوال تابعین واتباع تابعین اور سلف صالحین کے علمی، عملی، اخلاقی اور فکری گنجینوں سے ایسی ایسی مفید چیزیں حاضر کرتے

(ا) جہاں تک میں جانتا ہوں کہ اسی زمانے میں محترم محمد اقبال صاحب باغگونوی مقیم حال ولایات متحدہ امریکہ، محمد طاہر صاحب باغگونوی (برادر خورد محترم ڈاکٹر محمد یونس صاحب) اور جناب محترم احسان اللہ فوئمالوی (مرحوم) اس کار خیر میں پیش پیش تھے، یہ سب حضرات اسی زمانے میں روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے سینئر کارکنان تھے، اور بعد میں اس سے علیحدہ بھی ہوگئے تھے، جو اسی دوران مولانا حسین احمد صاحب کے قریبی دوستوں اور چاہنے والوں میں ہو چکے تھے، شاید مولانا کو ان دوستوں اور چاہنے والوں نے یہاں اس درس قرآن کریم کے لئے آمادہ کیا ہو، ورنہ بعد کے حالات اور واقعات نے یہ ظاہر کردیا کہ اس درس کے حوالے سے آپ بڑے مخمصے کے شکار تھے، پھر مولانا کی اس درس قرآن کریم کے لئے رضامندی اور آمادگی شاید اس جماعت میں ضروری اصلاح کی نیت سے بھی ہوئی ہو۔

تھے جو ہم اور پوری روہنگیا قوم کے لئے وقت اور حالات کے پیش نظر بڑی کارآمد اور نہایت ضروری تھیں، مجھے تو یوں لگتا تھا کہ آپ کی ہر بات دل سے نکل کر دلوں میں پیوست ہوجاتی تھی، ویسے ہی اس درس سے دوسروں کا کتنا فائدہ ہوا وہ یقینی طور پر میں نہیں کہہ سکتا، لیکن میں اپنے بارے میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس سے میرے علم وآگہی اور فکر وبصیرت میں حد درجہ اضافہ ہوا۔

مولانا کا درس اگرچہ عالمانہ، فاضلانہ اور مفکرانہ ہوتا تھا، جس میں سیاست وقیادت اور اس کی ضروریات کے حوالے سے کافی بلند پروازی کے ساتھ گفتگو ہوتی تھی، اور سامعین میں سے ہر سطح کے لوگ میرے ناقص خیال میں اپنے اپنے ظرف کے مطابق مستفید ہوسکتے تھے، وہ اس لئے کہ آپ کا موضوع بحث جتنا بھی کٹھن، پرخار اور سنگلاخ کیوں نہ ہو، آپ اپنے مخصوص انداز میں مخاطب کو اپنی بات سمجھانے میں یکتائے روزگار ہیں، گفتگو کے آخر میں سوالات کا جو موقع دیا جاتا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کی گفتگو سے ہر سطح کے لوگ مستفید ہوسکتے تھے، سامعین میں ڈاکٹر محمد یونس، پروفیسر محمد زکریا جیسے دانشوران اور مولانا سیف الاسلام اور مولوی عبداللطیف جیسے علماء کے علاوہ مدارس اسلامیہ اور اسکولوں کالجوں کے طلباء ہوتے تھے، ہر ایک آپ کو اپنے اپنے انداز میں داد تحسین دیا کرتے تھے۔

روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) مولانا سیف الاسلام اور ڈاکٹر محمد یونس کی زیر قیادت ہونے کے باوجود جماعت اسلامی کی زیر نگرانی اور زیر اثر تھی، تو ظاہر ہے کہ درس وتدریس اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے جماعت کا ایک مخصوص نصاب ہوتا ہے، جو حضرت مولانا سید ابوالاعلی صاحب مودودی رحمۃ اللہ علیہ اور جماعت اسلامی کے چند دیگر بڑے بڑے علمائے کرام کی لٹریچرز پر مشتمل ہے، تو ان لٹریچرز کو سامنے رکھ کر یہاں تعلیم وتربیت ہوا کرتی ہے، ویسے یہاں بھی چاہت اور مطالبہ ہوتا تھا کہ ان لٹریچروں کو سامنے رکھ کر درس دیا جائے، لیکن یہاں والوں کا یہی مطالبہ مولانا محترم کے آزاد خیالات اور آپ کی بلند پروازی کا سراسر برعکس تھا۔

حقیقت یہ کہ مولانا محترم جیسے ایک بلند پایہ کے عالم دین کے لئے مخصوص فکر وخیات میں ڈھلی ہوئی لٹریچرز کی تھوڑی ضرورت بھی نہیں تھی، آپ تو ظاہر ہیں کہ قرآن وسنت سے براہ راست مستفید ہوکر اخذ نتائج پر قادر ایک مستعد انسان ہیں، آپ معری قرآن کریم کو سامنے رکھ کر اپنے مطالعہ اور اخذ نتائج

کے زیر سائے خطاب کیا کرتے تھے، جس پر بعض منجمد قسم کے لوگ اپنی خفگی کا کبھی برملا اور کبھی دبے ہوئے الفاظ میں اظہار کیا کرتے تھے، جس سے اور تو اور مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔

مولانا ہمارے اکابر میں سے بڑے بڑوں کی طرح مجدد ملت حضرت شاہ ولی اللہی مکتب فکر کے ایک خوشہ چین عالم ہیں، امت کے متقدمین ومتاخرین کے علوم ومعارف کے گنجینوں سے مستفید بھی، تو آپ نے ان علوم ومعارف سے یہاں گل کھلائے ضرور تھے، لیکن افسوس ہے کہ یہاں کے بعض کوتاہ نظر اور تنگ ظرف افراد ایک مخصوص حلقہ کے نظریات وافکار میں پوری طرح محبوس ہو کر اپنے آپ کو پابہ زنجیر کرنے پر تلے ہوئے تھے، ویسے دوران درس بسا اوقات مشاہدہ کیا گیا تھا کہ ان حضرات کی اس ذہنی پابہ زنجیری اور فکری غلامی کی وجہ سے خود مولانا محترم کی وسعت خیالی اور بلند پروازی کا خاصا نقصان ہوا تھا، جن کی وجہ سے میں بھی ایک حد تک پریشانی کا شکار ہو گیا تھا۔

مولانا محترم علمائے متقدمین ومتاخرین پر اپنے انداز میں رائے رکھنے والا انسان ہیں، آپ جس پر جو رائے رکھتے ہیں خود ان تمام آراء کی صحت اور عدم صحت پر گفتگو کرنے کی گنجائش ضرور ہے، تاہم ایک منجھے ہوئے عالم اس بات کے حق دار ہیں کہ وہ اپنے مطالعے کی بنیاد پر کسی عالم پر رائے رکھیں اور اس کا اظہار بھی کر دیں، ویسے آپ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودیؒ پر بھی رائے رکھتے ہیں، اور عالمانہ ومبصرانہ انداز میں اظہار بھی کرتے ہیں۔

مولانا محترم کو حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی لٹریچرز پر ماشاء اللہ کچھ عبور حاصل ہے، اسی طرح حضرت سید مودودی کے موافقین ومخالفین کی لٹریچروں پر کچھ نظر بھی، یوں آپ حضرت سید مودودی کے تفردات کے علاوہ ان کی بعض علمی وفکری چیزوں پر بڑے محتاط اور سلجھے ہوئے طریقے سے تنقید، تبصرہ اور گرفت کرتے ہیں (میرے ناقص خیال میں آپ کی گرفت اور تنقیدی نقطۂ نظر بسا اوقات صحت پر بھی مبنی ہوتا ہے) لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی مولانا محترم حضرت مولانا مودودیؒ کو گئی گزری صدی کے ایک عظیم المرتبت انسان مانتے اور ان کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں، اور امت مسلمہ کے بڑے بڑوں کی شخصیت اور کارناموں کی طرح ان کی ذات وشخصیت کے ساتھ ان کے بعض کارناموں، کتابوں اور لٹریچروں کو امت کے لئے مفید سمجھتے ہیں، غرض آپ

حضرت مولانا مودودی کے متعلق جو بھی باتیں کرتے ہیں ان سے ایسا لگتا ہے کہ آپ حضرت سید مودودیؒ کے نقطہائے بحث کی گہرائیوں میں پورے پورے اتر چکے اور ان کی مراد کو پا چکے ہیں۔

اس عنوان کے آخر میں یہ ایک بات بھی عرض کر دوں کہ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودیؒ نے اسلامی ریاست کے حوالے سے جو نقطۂ نظر پیش کیا ہے، اور جو اسلامی ریاست ہی کو اسلام بنا ڈالا ہے، اس کے متعلق شاید مولانا حسین احمد صاحب کا بھی وہی نقطۂ نظر ہو، جسے بعض حضرات کے خیال میں اس سے پہلے ہیگل نے پیش کیا تھا۔ یعنی کلی ریاست کا تصور۔ ان حضرات کی نظر میں حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اسلامی ریاست کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ ہیگل کے نظریۂ کلی ریاست کا چربہ ہے، مزید برآں ان کے خیال میں سید مودودی نے بس اسے اسلام پر فٹ کیا ہے۔ یہاں اس ضمن میں ایک بات یاد رہے کہ حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے اس نقطۂ نظر پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی عالمانہ ومفکرانہ اعتراض تھا۔ شاید مولانا حسین احمد صاحب حضرت ندویؒ کے نقطۂ نظر کے موافقین میں سے ہوں، واللہ اعلم۔

ارایس او والوں سے وابستگی اور علیحدگی کے بعض اسباب

میرے علم کے مطابق مولانا حسین احمد صاحب فراغتِ تعلیم کے معاً بعد اس سوچ وفکر میں تھے کہ سرزمین ارکان اور وہاں کے مظلوم وکس مپرس مسلمانوں کی نجات اور ان کی فلاح وبہبود کے لئے ایک بامعنی جماعت ناگزیر ہے، اور ان کی نظر میں یہ بامعنی کی جماعت اس وقت وجود میں آسکتی ہے جب اس کی افرادی قوت کی ایک منفرد انداز میں تعلیم وتربیت ہو، یوں آپ اس سوچ وفکر کو ذہن میں رکھ کر اندرون وطن بھی گئے تھے، جس کا تذکرہ پچھلی سطور میں گزر چکا ہے، پھر یہاں بنگلا دیش آکر آپ نے حضرت ذوقؔ ندوی سے اپنے آپ کو اس لئے پیوستہ کیا تھا کہ شاید حضرت ذوق کے زیر سائے کسی حد تک ہی سہی آپ اپنی مراد کو پالیں گے، مگر چند مہینے جاتے نہ جاتے آپ کو یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں کے ان حالات میں آپ اپنے مقصد میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔

ایسے حالات میں یہاں مولانا سیف الاسلام صاحب شرف الدین بیلوی کی زیر صدارت رونگیا

سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کسی حدتک ابھر کر سامنے آئی، پھر آپ کو اس تنظیم کی جانب سے دعوت درس قرآن حکیم ملی تو آپ وہاں درس دینے پر آمادہ ہوئے تھے۔

مولانا جیسے ایک خاذق وحاضر دماغ انسان کو یہ ضرور علم تھا کہ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کس فکری سانچے میں ڈھل کرا بھر رہی اور یہ کس فکری وسیاسی نہج سے ارکان کے حوالے سے کام کرنا چاہتی تھی، بایں ہمہ آپ کو اللہ تعالی پر مکمل بھروسہ اور اپنی ذات پر کامل اعتماد تھا کہ اس تنظیم کے صدر دفتر میں درس قرآن کے ذریعے اس تنظیم کے کارکنوں کو عموما اوراس کے ارباب بست و کشاد کو خصوصا اس فکر وعمل کی طرف لے جاسکیں گے جو قرآن وسنت کے ساتھ زمینی حقائق کے پیش نظر وطن عزیز ارکان اور وہاں کے علماء وصلحاء کا مطالبہ ہے۔لیکن افسوس ہے کہ درس قرآن سے وابستگی کے چند مہینے گزرتے نہ گزرتے آپ کو اس سے علیحدہ ہونا پڑا،جس کے چند اسباب یہ ہیں کہ:

ا۔ مولانا کا خیال تھا کہ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) ماضی میں ہزار باہمی اختلافات اورانتشار وافتراق کی پگڈنڈیوں سے گزر کرایک خاص انداز فکر میں ہی سہی ایک تنظیمی ڈھانچہ بننے جا رہی تھی،جس پر توقعات کا وابستہ رکھنا کسی کا کوئی قصور ہی ہو نہیں سکتا تھا،لیکن چند دنوں کے بعد آپ کو یقین ہو گیا تھا کہ مولانا آزاد کے بقول'' جو ملک تقسیم کی بنیاد پر بنا ہو وہ تقسیم در تقسیم ہوتا رہے گا'' تو یہاں بھی معاملہ اس قول کے برعکس نہیں تھا کہ'' جو تنظیم انتشار خیالی وعملی کی بنیاد پر قائم ہوا ہو، اس میں آئے دن افراتفری، انتشار وافتراق کا دور دورہ ہی ہوتا رہے گا''۔جی ہاں !اس تنظیم کا ماضی بھی افرا تفری اور انتشار وافتراق سے عبارت تھا اوراس وقت تک (اور بعد میں بھی) اس کا حال بھی اس سے کوئی مختلف نہیں تھا،تو مولانا محترم کے ذہن رسا نے یہ حقیقت بہت قلیل مدت میں پالی تھی۔

۲۔ نظریاتی اختلافات کے علی الرغم (جس کی طرف جانا سردست مناسب نہیں) مولانا کو احساس ہو چکا تھا کہ اس تنظیم سے وابستہ رہ کر (اگر چہ درس کلام اللہ کی حدتک سہی) آپ اپنے سوچے سمجھے ہدف تک کبھی بھی نہیں پہنچ پائیں گے،اور تجربہ نے آگے چل کر ثابت بھی کر دیا تھا کہ اس تنظیم کے متعلق جو جو خدشات آپ کو پہلے دن سے تھے وہ درحقیقت صحت پر مبنی تھے،یوں آپ نے اس کے ساتھ اور دیر کرنے کے بجائے اس سے کلی طور پر علیحدگی کو مناسب سمجھا،جس کے بعد آپ نے اپنے بعض

دوستوں اور خیر اندیشوں کی شمولیت سے اپنے انداز کی ایک مستقل جماعت کی تشکیل کے لئے کوشش اور تگ ودو شروع کردی تھی،جس کی قدرے تفصیلات انشاء اللہ اگلی سطور میں آئیں گی۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے مناسبت

محترم مولانا حسین احمد صاحب امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے بہت بڑے شیدائی نکلے ہیں،آزاد کے علمی وفکری، سیاسی وثقافتی افکار ونظریات،آپ کی ادبیت اور مخصوص انشاء پردازی، قوت فیصلہ و ذہانت ، راہ جانان میں آپ کی قربانیاں و جانفشانیاں ور آپ کی پہاڑ جیسی بلند و بالا شخصیت اور عزیمت سے نہایت متأثر ہیں،مولانا آزاد کی لٹریچر کا ایک بڑا اور معتد بہ حصہ مولانا محترم کی نظر میں ہے،ساتھ ہی ساتھ آزاد پر لکھنے والے جن میں آپ کے طرف دار اور ناقدین بھی ہیں کی لٹریچرز پر مولانا کی خاصی نظر ہے، جہاں تک میرا اندازہ اور خیال ہے کہ مولانا نہ صرف اپنی سیاسی، ثقافتی اور فکری زندگی کو حتی المقدور آزاد کے رنگ میں رنگانے کی سعی کی بلکہ بعض پہلوؤں سے اپنی شخصیت کو بھی آزاد کے ڈھنگ وادا پر استوار کرنے کی کوشش کی ہے،اس حوالے سے میرے ناقص خیال میں آپ کسی قدر کامیاب بھی ہیں۔

مگر زمانے کی عجیب وغریب ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے آزاد کے اتنے بڑے شیدائی کو اپنے نازک دامن میں جگہ تنگ دینے کی تھوڑی بھی زحمت گوارہ نہیں کی ہے،اور کرے بھی کیسے؟ آزاد جس سرزمین سے منسوب ومتعلق ہیں، وہ ہے ہندوستان کی سرزمین،مشرقی تہذیب وثقافت کا گہوارہ، جو درحقیقت وسیع وعریض ہونے کے علی الرغم ایک سدا بہار لالہ زار ہے، جہاں ان گنت اور متنوع رنگ و بو کے گلہائے سرسبد تھے اور الحمد للہ اب بھی ہیں،جن کی طبیعتیں کچھ ایسی ہیں کہ وہ نہ صرف ہمیشہ باد بہار اور شبنم کے قطروں کے منتظر ہیں بلکہ بارانِ رحمت کی قدردان بھی، جہاں ں مولانا آزاد کا نشوونما ہوا، آپ وہاں پھولے پھلے،آخر کار وہاں کی خاک کو ہمیشہ کے لئے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

جب کہ مولانا حسین احمد کی ذات اور شخصیت کا ایک ایسی سرزمین سے تعلق ہے، جہاں کی زمین اس دور آخر میں نہایت بنجر اور ناہموار، چٹانی اور سنگلاخ ہو چکی ہے،تو آپ جیسی ایک عظیم شخصیت کو یہ بنجر

اور چٹانی زمین اپنے جلو میں کہاں تک سما سکتی ہے،؟ حال یہ کہ یہاں کی زمین ندیوں نالوں سے نالاں اور برگشتہ ہے تو بحر بیکراں کے طلاطم کو کب اور کیسی برداشت کرنے کی قابل ہو سکتی ہے؟

مولانا آزاد سے آپ کا تعارف کیسا ہوا، اس حوالے سے مولانا ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ:

> علی میاں کی برکت سے کہئے یا قدرت کی کیمیا گری سے کہ آزاد ابوالکلام سے شناسائی ہوگئی، اس کے بعد سید سلیمان، ماجد میاں، مہر صاحب، ماہر القادری، شبلی، حالی، محمد حسین آزاد، غلام علی بلگرامی، حبیب الرحمن شیروانی، شمس العلماء ذکاء اللہ جیسے کتنے ادب و انشاء کے امیروں اور بادشاہوں کی باریابی نصیب ہوگئی، جن کی صحبت اور زیارت نے ایک جہانِ نو کو دکھایا، یہ نئی دنیا میری نسبت ایک نئی دنیا تھی، ورنہ یہ نئی دنیا خوش نصیبوں کے لئے بڑی مانوس اور دیکھی بھالی تھی، پھر مرور زمانہ اور رفتار کارواں سے رنگ برنگ کی پھول سونگھنے کو ملی اور نئے نئے باغباں ہاتھ آئے۔
>
> آزاد ابوالکلام کا نام تو بڑا مانوس نام ہے، جو بچے بچے کو یاد ہے، مگر ان کے ادب و انشاء کی شاہکار کتاب ''تذکرہ'' کا تذکرہ پہلی مرتبہ علی میاں سے سنا، یہ ہمارے ملک کے ایک صدیقی صاحب سے ہدیہ میں ملی تھی، کتاب سن رسیدہ اور کرم خوردہ ضرور تھی مگر کام میں لائی گئی تھی، اس کا ایک اور نسخہ فراہم ہوا تو اس سے پورا کام ہوا تھا، ویسے آزاد سے میرا رشتہ ہو گیا۔ (کچھ لسانی اصلاحات کے ساتھ)

بہر حال مولانا محترم غالباً جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے دوران تعلیم آزاد سے آشنا ہو گئے تھے، اور آگے چل کر آپ سے شدید سے شدید ترین متأثر ہو چکے تھے، سن ۱۹۸۵ء کا زمانہ تھا کہ مجھ ناچیز سے آپ کی باضابطہ ملاقات ہوئی، جس نے بہت جلد استاد و شاگرد کا روپ دھارا، جس کی قدرے تفصیلات زیر نظر کاوش کی پچھلی سطور میں گزر چکی ہیں، جس وقت آپ سے میری پہلی پہلی ملاقاتیں ہو رہی تھیں، اس وقت آپ کے مطالعہ میں نہیں بلکہ تلاوت میں جو کتاب تھی، وہ تھی مولانا آزاد کی ''رسولِ رحمت'' جسے آپ پڑھتے اور میں سراپا گوش بن کر سنتا اور اپنی بساط بھر مستفید ہوتا تھا، اس سے پہلے میں آزاد کے متعلق سنا تو تھا، لیکن آپ کی ذات و شخصیت سے کچھ بھی واقف نہیں تھا، آپ اس انداز سے پڑھتے

اور مجھے درس دیتے تھے کہ جس سے لگتا تھا کہ آپ مولانا آزاد کی شخصیت وکمالات اور ان کی منفرد لٹریچرز میں گم ہو چکے تھے، ایک طرف سیرت رسولؐ کے مضامین، تو دوسری طرف آزاد کے ادبیات، پھر ان پر مستزاد مولانا حسین احمد صاحب کی فدائیت کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ آزاد کی شخصیت ایک ایسی شخصیت ہے جسے جاننا اور سمجھنا میرے لئے بلکہ دوسرں کے لئے بھی نہایت اہم اور بہت ضروری ہے، یوں آپ کے زیر سائے آگے چل کر میں نے بھی آزاد کو اپنی بساط بھر مطالعہ کیا، جس سے میرا بہت ہی فائدہ ہوا ہے۔

میں یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ مولانا حسین احمد صاحب کتابوں کا فریفتہ انسان ہیں، ۱۹۸۵ء اور اس کے بعد کے زمانے میں آپ نے کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ بڑے ذوق وشوق سے اپنی رہائش گاہ میں جمع کر لیا، جس سے مجھے بھی بہت فائدہ ہوا تھا، بعد میں آپ کی یہ آرزو ہو گئی تھی کی اس کتب خانہ کو مزید توسیع وترقی دے کر ایک عام کتب خانے میں تبدیل کر دیا جائے، اس سلسلے میں آپ نے ہر چند کوشش کی، لیکن افسوس ہے کہ آج تک آپ کی یہ آرزو پوری نہیں ہو سکی، جس کے مختلف اسباب اور وجوہات ہیں، میرے خیال میں اس کا سب سے بڑا سبب آپ کا وطن کے سائے سے محروم ہونا ہے، جس کا شدید احساس خود آپ کو بھی ہے، لیکن آپ پھر بھی چاہتے تھے کہ وطن کے حوالے سے آپ کی زیر تربیت وتعلیم تلامذہ کے لئے ایک معنی خیز کتب خانہ ہو، جس سے یہ مستفید ہو سکیں، اور وہ آگے چل کر ملت ووطن کے کام آسکیں، تو ایسی تعلیم وتربیت کے لئے ایک بامعنی لائبریری کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے؟

پھر زیر عنوان مضمون کی مناسبت سے یہاں جو بات کہنی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا نے اپنی کوشش سے کتابوں کا جو ذخیرہ جمع کیا ہے، اس میں آزاد کی کتابوں اور آپ پر لکھنے والوں کی لٹریچرز کا وافر حصہ موجود ہے، نہ جانے آج کل آپ کے اس کتب خانے کا کیا حال ہے؟ کیوں کہ ظاہر ہے کہ عرصۂ دراز سے آپ مسافرت کی زندگی گزار رہے ہیں، شاید آپ کی اولاد واہل نے اس کی حفاظت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی ہو، اور ساری کتابیں جوں کا توں آپ کی رہائش گاہ میں موجود ہوں۔

اسی طرح مولانا کی ایک دیرینہ آرزو یہی رہی ہے کہ آپ چاہتے ہیں کہ مولانا آزاد کی شہرۂ آفاق

تفسیر ''ترجمان القرآن'' پر حواشی لکھیں، لیکن بعض نا قابل بیان وجوہات کی وجہ سے آپ کی یہ آرزو بھی تادم تحریر پوری نہیں ہوسکی، خدا کرے کہ آپ کی یہ آوزو کبھی پوری ہوجائے۔

پھر حال ہی کی بات ہے کہ آپ نے ایک ٹیلیفونک رابطے میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ:

''مولوی طاہر! میری دلی تمنا ہے کہ مولانا آزاد کی سوانح عمری پر عربی میں ایک کتاب لکھوں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک طرف تو برسوں سے میں مختلف پریشانیوں کے ساتھ رواروی پر مشتمل مسافرت کا دن گزار رہا ہوں، تو دوسری طرف اتنے بڑے کام کو سرانجام دینے کے لئے جن مواد کی ضرورت ہے، وہ یہاں (سعودی عرب) میں نہیں ملتے، خاکہ ذہن میں تیار ہے، خدا کی توفیق شامل حال ہوئی تو بنگلا دیش آتے ہی اس پر کام شروع کردوں گا''۔

پانچواں باب

مولانا حسین احمد صاحب ایک نئی جماعت کی فکر میں

روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) سے کافی حد تک نا چاقی ہوگئی تو مولانا حسین احمد صاحب نے یہاں اپنا درس قرآن کا سلسلہ بند کردیا، حتی کہ ان لوگوں سے مکمل علیحدگی اختیار کرلی، اس صورت میں آپ کی جو قدر قلیل ہی سہی اس سے توقعات وابستہ تھیں وہ بالکل ختم ہوگئیں۔

اس تنظیم سے مکمل طور پر علیحدگی کے معا بعد آپ کو اپنے بعض دوستوں جن میں جناب محمد اقبال صاحب باغکونوی اور جناب محمد طاہر صاحب بن ماسٹر علی احمد صاحب باغکونوی کے علاوہ جناب احسان اللہ صاحب فوئمالوی پیش پیش تھے نے یہ مشورہ دیا تھا کہ کیوں نہ آپ ایک باضابطہ جماعت کی تشکیل کے لئے کوشش کیا کریں، ویسے آپ کو ان دوستوں کا یہ مشورہ پسند آیا تھا، یوں اس سلسلے کی ایک کوشش بھی کی گئی تھی، لیکن کچھ عرصہ گزرتے نا گزرتے آپ کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ جن دوستوں نے آپ کو یہ مشورہ دیا وہ بذات خود اس باب میں پتے کے نہیں ہیں، اس لئے آپ کی جدو جہد میں بروقت رنگ نہیں بھرا تھا، آپ کو اس دوران جہاں تک دیکھا گیا، کافی حد تک پریشان حال تھے، لیکن آپ اس کوشش میں مگن تھے کہ کسی بھی صورت میں ایک علیحدہ مگر بامعنی تنظیم کی بنیاد ڈالی جائے، جس کے لئے آپ نے سردھڑ کی بازیاں لگائی تھیں۔

اس سلسلے میں آپ نے ایک سے زیادہ مرتبہ حجاز مقدس کی زیارتیں کیں، جہاں آپ نے روہنگیا برادری کے بعض دل جلے اور ملت وقوم کے حوالے سے فکر مند حضرات کے علاوہ اپنے بعض احباب اور خیر اندیشوں سے ایک نئی تنظیم کے حوالے سے مذاکرات اور تبادلۂ خیالات کیا، جنہوں نے آپ کو

کسی بھی حالت میں ایک نئی تنظیم کی تشکیل کا مشورہ دیا، اور عندیہ دیا تھا کہ وہ حضرات ہر حالت میں آپ کا بھرپور ساتھ دیں گے۔

محمد جعفر حبیب کی نماز جنازے میں شرکت

۱۹۸۷ء میں ہمارے عظیم قومی قائدِ تحریک آزادی حضرت محمد جعفر حبیب (۱) کا اچانک چاٹگام میں انتقال ہوگیا تو مرحوم کی نماز جنازے میں محترم مولانا حسین احمد کی معیت میں میں نے بھی شرکت کی، ہم حضرت قائد کے جنازے کے ساتھ چاٹگام سے نائکان سری پہنچے، اور میت کی تدفین کے بعد

---

(۱) دورِ آخر میں سرزمین ارکان کے عظیم مردِ مجاہد حضرت محمد جعفر بن حبیب الزمان چوہدری بن ابوالخیر بن انور علی بن کرم علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی کی ولادت ۱۹۳۹ء میں بیولہ فارہ (کجافہ) علی چنگ، بوسیدنگ میں ہوئی، آپ نے اپنی آبائی بستی کے مکتب میں دینیات کی ابتدائی تعلیم پائی، ساتھ ہی ساتھ بستی کے پرائمری سرکاری اسکول سے تیسری جماعت کی تعلیم پاکر شقدارفارہ، منگڈو کے ہائی اسکول میں داخلہ لیا، جہاں سے ۱۹۵۲ء میں مٹرک کا امتحان پاس کیا، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بنگال کا سفر کیا، اور ڈھاکہ نٹرڈیم کالج سے ۱۹۵۹ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر کے برما کے دار الحکومت رنگون پہنچے، اور رنگون یونیورسیٹی سے ۱۹۶۲ء میں بی اے پھر ۱۹۶۴ء میں بی ایل کی ڈگریاں حاصل کیں، اس کے بعد:

۱۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک طالب علمی کے دوران یوتھ تحریک سے وابستہ رہے۔

۲۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک روہنگیا انڈی پیڈنٹ فورسس (RIF) کی روح رواں رہے۔

۳۔ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۳ء تک ارکان آزاد فوج (RNLP) میں نائب صدارت کے عہدے پر فائز رہے۔

۴۔ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۷ء تک روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کے عہدۂ صدارت پر فائز رہے۔

۵۔ ۱۹۸۷ء میں میڈیکل کالج ہسپتال چاٹگام، بنگلادیش میں آپ کا غیر متوقع طور پر انتقال ہوگیا، اور سرحدی علاقہ نائکان سری میں آپ کی تدفین ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

محمد جعفر حبیب روہنگیا قوم کے ایک عظیم قومی ہیرو تھے، عرصۂ دراز تک روہنگیا انڈی پنڈنٹ فورس (RIF) کے علاوہ ارکان آزاد فوج (RNLP) کے نائبِ صدارت کے عہدے پر فائز رہے، آپ کے مبارک ہاتھوں سے ۱۹۷۳ء میں روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کی تاسیس کی شکل میں تحریک آزادیٔ ارکان کی تجدید واحیاء ہوئی۔ جس کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں تا حال باقی ہے، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر دے، اور بال بال مغفرت فرمائے، آمین۔

غمگین سے غمگین ترین اور نہایت افسردہ خاطری کے ساتھ چاٹگام واپس لوٹے تھے۔

اس جنازے کے دوران مولانا نے حاضرین کے سامنے ایک زوردار خطاب کیا تھا، جس سے لوگ بڑے محظوظ ہوئے، اس خطاب میں آپ نے روہنگیا قوم کے اس وقت کے حالات پر عموماً اور قائد مرحوم کی زندگی اور ان کی خدمات وکارناموں پر خصوصاً بڑی دردمندی کے ساتھ اظہار خیال کیا تھا، ویسے بھی آپ ہماری برادری میں ایک مستعد عالم کی حیثیت سے جانے مانے ہونے کے ساتھ قوم کے فکری، سیاسی اور انقلابی حلقوں میں مشہور بھی، تو اس جنازے کے دوران روہنگیا قوم کے وہ سیاست دان جو اسی زمانے میں کسی سیاسی وانقلابی جماعتوں کے ساتھ وابستہ نہ تھے، ان کی خاص نظریں آپ پر لگیں، جن میں الحاج سلیم احمد بن نور الزمان خیر فاروی اور مولانا محمد کبیر بن حضرت مولانا راغب اللہ صاحب خواندنگی پیش پیش تھے، انہوں نے آپ کو ایک مجلس میں دعوت دی اور حالات حاضرہ پر طویل گفت وشنید کے بعد یہ بات طے پائی کہ اس وقت سرزمین ارکان اور وہاں کے مظلوم مسلمانوں کی نجات کے لئے ایک سیاسی وانقلابی پارٹی کی تشکیل ناگزیر ہے، چناں چہ اگلے چند جلسوں کے اندر ''روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن'' (RLO) کی بنیاد پڑ گئی، یوں یہاں سے آپ کے باضابطہ سیاسی وانقلابی سفر کا آغاز ہوگیا، اور درج ذیل حضرات پر مشتمل ایک مجلس عاملہ کی تشکیل عمل میں آ گئی تھی:

۱۔ صدر: الحاج سلیم احمد صاحب خیر فاوی۔

۲۔ سکریٹری جنزل: الحاج مولانا محمد کبیر صاحب خواندنگی۔

۳۔ رکن مجلس عاملہ: الحاج انعام اللہ صاحب کیلادنگی۔

۴۔ رکن مجلس عاملہ: الحاج مولانا حسین احمد صاحب لمبابیلی۔

۵۔ رکن مجلس عاملہ: جناب محمد اسلام صاحب اکیابی۔

ان مذکورہ جلسوں میں شاید دیگر حضرات بھی شریک رہے ہوں گے، لیکن مذکورہ ان حضرات کے علاوہ کسی دوسرے کے متعلق معلومات فراہم نہیں ہوسکیں۔

ہندوستان کا سفر

سن ۱۹۸۸ء میں ''روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن'' (RLO) کا باضابطہ اعلان ہو چکا تو روہنگیا برادری کے سیاسی حلقوں میں چہ میگوئیاں بھی شروع ہو چکی تھیں، کہیں سے اس کے حق میں آوازیں آرہیں تو کہیں سے اس کی مخالفت کی صدائیں بھی بلند ہو رہی تھیں، غرض ہر کجا ہلچل کا سماں نظر آرہا تھا۔

ایسے حالات میں یہاں ایک بات جو قابل ذکر ہے وہ یہ کہ مولانا حسین احمد صاحب نے اوائل او کے دوران تاسیس لیڈروں کے سامنے ایک شرط رکھی تھی، جسے خود آپ کی زبانی سماعت فرمائیں:

> ''روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے دوران تاسیس میں نے متعلقہ لیڈروں کے سامنے ایک شرط رکھی تھی کہ میں اس نئ تنظیم میں باضابطہ طور پر شریکِ سفر ہونے اور اس قافلہ کے ساتھ سرگرم عمل ہونے سے پہلے ہندوستان کا سفر کروں گا، اور ندوۃ جا کر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ملاقات کے بعد آپ کے سامنے سرزمین ارکان کے حالات رکھوں گا، اور آپ سے جو اشارہ ملے گا اس پر عمل پیرا ہوں گا، ویسے بھی حضرت مولانا جیسی شخصیت سے میری امید ہے کہ آپ ایسے حالات میں آپ ضرور ہماری رہنمائی فرمائیں گے''۔

بہر حال مولانا نے ہندوستان کے سفر کے لئے ضروری تیاری مکمل کر لی، اور آپ کے استاد و مربی حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی (۱) سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام ایک سفارش

---

(۱) حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی دامت برکاتہم کی پیدائش جزیرۂ مہیش خالی، کوکس بازار میں ہوئی، میرے علم کے مطابق تقریبا چھ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ ارکان گئے، اور وہاں کے موجودہ دارالحکومت اکیاب میں مقیم رہے، بعد میں یہاں سے دوبارہ اپنے وطن واپس آئے۔ آپ نے جامعہ اسلامیہ پٹیہ سے سند فراغت حاصل کی، اور بعد میں اسی جامعہ کے عرصۂ دراز تک مدرس رہے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایماء پر جامعہ دارالمعارف کے نام سے چاٹگام میں ایک قابل قدر ادارہ کی بنیاد رکھی، تادم تحریر آپ اس کے مدیر ہیں، آپ حضرت مولانا ندوی سے خاصے مستفید ہیں، اور بہت ساری قابل قدر کتابوں کے مصنف بھی، اور حال ہی میں آپ نے اپنی آپ بیتی ''نقوش زندگی'' شائع کی ہے، اللہ تعالی آپ کی زندگی میں برکت دے، آمین یارب العالمین۔

نامہ حاصل کیا، اور اپنی طرف سے حضرت مولانا ندوی کے نام ایک یاد داشت لکھی، جس میں ارکان کے اس وقت کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، فکری اور ثقافتی حالات کو کھل کر بیان کیا گیا تھا۔

بہر حال تیاری کے بعد آپ ندوۃ العلماء پہنچے، جہاں ایک روایت کے مطابق آپ نے گیارہ روز قیام کیا، یہاں آپ کی سرگرمی کے حوالے سے خود آپ ہی کی زبانی کچھ باتیں حاضر خدمت ہیں:

۱۔ چوں کہ میں ایک پوری قوم کی جانب سے ایک تنظیم کا نمائندہ بن کر ندوے پہنچا تو میری خاص پذیرائی ہوئی تھی، مجھے ندوے میں قیام کے لئے جو جگہ ملی تھی وہ خاصی شاندار تھی، مولوی محمد امین ندوی غلبنوی جو اس زمانے میں ندوے کا طالب علم تھا، اس کا کہنا تھا کہ ''مولانا! آپ کو قیام کے لئے جو کمرہ ملا ہے وہ ایک عام کمرہ نہیں ہے، بلکہ یہ اس شان کا کمرہ ہے کہ جس میں ملکوں کے وزراء اور دیگر بڑی بڑی شخصیات کو ٹھہرایا جاتا ہے'' یاد رہے کہ اس زمانے میں مولانا عبد العزیز صاحب بھٹکلی مہمان خانے کا منتظم تھے، انہوں نے مجھے بڑی شان سے ٹھہرایا، اور خدمت گزاری میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی تھی، اللہ تعالی ان کو جزائے خیر دے۔

۲۔ ندوے میں دوران قیام دونوں اوقات کے کھانے حضرت مولانا ندوی کے ساتھ حضرت کے دسترخوان میں کھانے کی سعادت نصیب ہوئی تھی، کھانے میں کافی لوگ حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت مولانا کے کھانے خود آپ کے ذاتی مصارف سے آیا کرتے تھے، لیکن آپ کھانے سارے مہمانوں کی معیت میں تناول فرمایا کرتے تھے، ہمیشہ کھانے میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور ان کے بھائی حضرت مولانا سید واضح حسنی ندوی تشریف فرما ہوتے تھے۔

۳۔ میرے دوران قیام روز بعد عصر حضرت مولانا ندوی کی رہائش گاہ کے آنگن (جو ندوے کی جامع مسجد کے بغل میں واقع ہے) میں عام زائرین سے ملاقات کے بطور حضرت جو تشریف فرما ہوتے تھے، اس میں مجھے روزانہ حاضری کی توفیق ہوئی تھی، جس میں علماء، طلباء کے علاوہ دور دراز سے آئے ہوئے مہمان اور آپ کے متعلقین کی بڑی تعداد ہوا کرتی تھی، لوگ آپ سے ملتے اور آپ کے ارشادات سنتے تھے، قبل المغرب تک یہ مجلس ختم ہو جاتی تھی۔

۴۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مجھے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی نے بلا کر حضرت مولانا ندوی سے

آپ کے کمرۂ خاص میں اکیلے میں ملاقات کرایا، حضرت نے مجھ سے مخاطب ہوکر جو باتیں کیں، وہ مجھے بہت کم یاد رہیں، کیوں کہ اس وقت میں خود کو ہی بھول چکا تھا، پھر حضرت مولانا کو اکیلے میں پاکر میرے دل کے دیرینہ جذبات کا جو طوفان امنڈ آیا تھا، اسے میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

۵۔ حضرت مولانا ندوی کے سامنے ایک یادداشت پیش کی گئی تھی، جس میں روہنگیا قوم کی حالت زار کے علاوہ کچھ اپنا ذاتی دکھڑا بھی درج کیا گیا تھا، اس کے بعد حضرت کے حکم سے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے میرے نام کی شمولیت کے ساتھ روہنگیا لیبریشن آرگنایزیشن (RLO) کے لئے ایک سفارش نامہ لکھا، جس میں حضرت مولانا ندوی کا دستخط ثبت تھا، اب گویا مجھے اجازت مل چکی کہ میں مؤخر الذکر تنظیم میں باضابطہ طور پر شامل ہوکر سرگرم عمل ہوجاؤں، ویسے میں اس سفر سے واپسی کے بعد اس تنظیم (RLO) میں باضابطہ طور پر شامل ہوگیا تھا۔

۶۔ اس زمانے میں حضرت مولانا ندوی کی گرانمایہ اور معرکۃ الآراء تصنیف ''المرتضیٰ'' چھپ کر منظر عام پر آچکی تھی، اس کے چند نسخے جو خاص خاص شخصیات کو ہدیہ میں دینے کے لئے حضرت کے سامنے حاضر کئے جاچکے تھے، ان میں سے ایک نسخہ حضرت نے اپنے مبارک ہاتھوں سے ''کلمۂ ہدیہ'' لکھ کر مجھے بھی عنایت فرمایا، یوں حضرت کے مبارک ہاتھوں سے اس ناچیز کا نام لکھا جانا، یہ میری زندگی کے لئے ایک بڑی سعادت کی چیز ہے۔

۷۔ میرے ندوے میں قیام کے دوران حضرت مولانا ندوی کی مشارکت (بلکہ آپ کی زیر صدارت) مسلم انٹلکچویل فورم کے زیر اہتمام ایک اجلاس گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا، جس میں مجھے بھی دعوت شرکت ملی تھی، حاضری پر دیکھا کہ اس اجلاس میں ملک بھر کے بڑے بڑے علماء، دانشوران، سیاسی وفکری قائدین اور ثقافتی وسماجی عمائدین کے علاوہ چند وزراء بھی حاضر تھے۔ اس اجلاس میں شرکت کے بعد ندوے کے چند اساتذۂ کرام جن میں حضرت مولانا نذر الحفیظ ازہری ندوی صاحب ناقابل فراموش ہیں نے مجھ سے یہاں تک بتایا تھا کہ ''حسین احمد صاحب! آپ بڑے سعادت مند ہیں، کہ ادھر آپ کی تشریف آوری ہوئی تو ادھر لکھنؤ کی سرزمین میں حضرت مولانا ندوی کی مشارکت میں ملک کا اتنا بڑا اجلاس منعقد ہوا ہے''۔

۱۹۸۸ء کے دوران ہماری دیگر جماعتیں

۱۹۸۸ء کے دوران جس زمانے میں روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کا اعلان ہورہا تھا، اسی زمانے میں ہماری قومی سطح پر تحریک اسلامی یا دیگر عناوین کے تحت کام کرنے والی اور بھی چند جماعتیں موجود تھیں، اس ضمن میں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ آج کل کی طرح اسی زمانے میں دنیا کے گوشے گوشے میں ارکان اور روہنگیا مسلمانوں کے نام پر بھانت بھانت کی جماعتیں موجود نہیں تھیں، جو بھی تھیں وہ سرزمین ارکان سے ملحق یا سرحدی علاقے میں ہی تھیں، آج کل تو ماشاء اللہ تعالی روہنگیا برادری میں جماعتیں اگرچہ نام نہاد ہی کیوں نہ ہوں بنانے اور انٹرنیٹ کی سہولیات سے فائدہ اٹھا کر اعلان کے ساتھ ہر کجا ڈھونگ رچانے کی ہر کسی کو لت لگی ہوئی ہے، اور افسوس کی بات ہے کہ ہر کوئی عہدۂ صدارت کے علاوہ دیگر کسی بھی عہدے پر مطمئن نہیں، ہماری برادری میں میرے علم کے مطابق ۲۰۱۱ء کے بعد یہ بیماری ایک وباء بن کر پھیلی ہے، اگر ہماری حالت ایسی رہی تو اندیشہ ہے کہ آگے چل کر برادری کے جتنے افراد ہیں، ان کا تعلق اندرون وطن سے ہو یا بیرون وطن سے کہ ہر ایک افراد ایک ایک پارٹی کے صدر بن جائیں گے، الامان والحفیظ۔

روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے اعلان کے دوران بہرحال کسی تنظیم کے بننے بنانے کی ایک معیار ضرور تھی، کسی نہ کسی حد تک اصول وضوابط کے ساتھ تنظیمیں بنتیں اور متحرک ہوکر کام بھی کرتی تھیں، لیکن جہاں تک نظر آرہی ہیں کہ آج کل کام کرنے کی کوئی بھی ضرورت نہیں ہوتی، بس اعلان کردو اور اپنے آپ کو روہنگیا قوم کی نمائندہ تنظیم ہونے کا ڈھونگ رچاؤ، اس سے آگے کچھ بھی نہیں، انٹرنیٹ حاضر ہے، اعلان کرنے اور ڈھونگ رچایا کرنے میں کوئی مشکل نہیں۔

بہرحال روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے اعلان کے دوران متحرک اور غیر متحرک جتنی بھی تنظیمیں روہنگیا برادری کے نام پر تھیں، ان میں سے معروف یہ تھیں:

۱۔ ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF): جو محترم اڈووکٹ نور الاسلام صاحب شیل خالوی اور مسٹر شبیر حسین صاحب فوئمالوی (مرحوم) کی قیادت میں متحرک اور سرگرم عمل تھی، لازمی سروسامان کے حوالے سے اس زمانے میں یہ تنظیم معروف تھی، جس کے پاس جدید قسم کے اسلحہ جات موجود تھے، اور

روہنگیا برادری میں اس تنظیم کی کافی حد تک پذیرائی تھی۔

۲۔ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO): یہ تنظیم بھی تحریک اسلامی کے زیر عنوان مولانا سیف الاسلام صاحب شرف الدین بیلوی اور محترم ڈاکٹر محمد یونس باغکونوی اور پروفیسر محمد زکریا صاحب تنگ بازاری وغیرہ کی قیادت میں میدان عمل میں فعال تھی، جس کے افراد کچھ جدید ترین اسلحہ جات سے لیس تھے، اور ہر ایک کافی پر جوش بھی۔

۳۔ اتحاد المجاہدین ارکان: یہ تنظیم مولانا محمد حنیف راغبؔ فرندگی کی زیر سرکردگی اسی زمانے میں نت نئی تو تھی لیکن کافی حد تک معروف ومشہور اور سرگرم تھی، جس میں چند دانش وران تھے، مگر اس تنظیم کے دعوی کے مطابق اس میں شامل ہونے والوں کی اکثریت روہنگیا علماء اور مدارس کے طلباء تھی، جس کی سرپرستی اس تنظیم کے دعوی کے مطابق ارکان کے چار بزرگ ترین علماء وصلحاء کر رہے تھے، راغب ارکانی صاحب ان کی طرف سے نیابت کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔

۴۔ روہنگیا فدائین محاذ (RPF): ۱۹۸۷ء میں قائد تحریک آزادی حضرت جعفر حبیب کے انتقال حسرت آیات کے بعد اس کی زمام قیادت حضرت مولانا اڈووکٹ شفیق احمد صاحب تنگ بازاری کے ہاتھ آئی، لیکن روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے اعلان کے دوران یہ تنظیم فعال نہ تھی، بات یہ ہے کہ جناب شبیر حسین صاحب فوئمالوی بشمول ان کے سارے ہم خیالوں کا ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ میں شامل ہونے کے بعد یہ تنظیم عملاً غیر فعال ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی کسی قدر رینگ رہی تھی، بعد میں یہ بالکل کالعدم ہو چکی ہے۔

۵۔ ارکان پیوپل فریڈم پارٹی (APFP): یہ ایک ایسی تنظیم تھی جسے ارکانی علماء اور دانش وران اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، اور اس کی سرگرمیوں کو منفی اور تخریبی سمجھتے اور کہا بھی کرتے تھے، جس کی قیادت مشرقی ارکان کے ایک برمیز وانگریزی تعلیم یافتہ جوان مسٹر محی الدین صاحب مقیم حال ولایات متحدہ امریکہ کر رہے تھے۔

۶۔ حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان: یہ تنظیم مولوی عبد القدوس صاحب ہاتھی فاروی کی زیر قیادت اسی زمانے میں ارکان بنگلا دیش کے سرحدی علاقے میں قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی، جس کا دعوی تھا

کہ اگرچہ مولوی عبد القدوس صاحب اس تنظیم کی قیادت کر رہے ہیں لیکن اس کی سرپرستی یا حقیقی قیادت کی باگ ڈور سرزمین ارکان کے معروف عالم دین حضرت مولانا میر احمد مبارک معروف بہ ناظم صاحب کے ہاتھ میں ہے۔

۷۔ روہنگیا اسلامک لیبریشن آرگنائزیشن (RILO): اسی زمانے میں یہ تنظیم اگرچہ غیر متحرک تھی، لیکن اس کی کسی قدر شہرت اس کے قائد جناب محمد شاہ باغکونوی (مرحوم) کے وجود سے تھی، یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اس تنظیم نے آگے چل کر روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) سے انضمام کی کوشش کی، اس حوالے سے کسی قدر پیش رفت بھی ہوئی تھی، مگر بعض وجوہات کی بنیاد پر اس کو اس کوشش پر ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا، اللہ تعالی مرحوم محمد شاہ باغکونوی کو جزائے خیر دے، بڑے نڈر اور آن بان کے لیڈر تھے، بڑے مخلص بھی تھے اور قوم کے ہم درد بھی (۱)

تنظیم کی طرف سے سعودی عرب کا دورہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دورہ سے واپسی پر مولانا حسین احمد صاحب کو فکری اور سیاسی حوالے سے کافی مطمئن دیکھا گیا تھا، اب آپ جان ودل سے روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی ترقی اور بہبودی کے کام میں مصروف ہو گئے تھے، اس تنظیم میں آپ کی دیگر سرگرمیوں کی تفصیلات سے قطع نظر اس تنظیم کے ارباب حل وعقد کی چاہت وخواہش پر آپ نے سعودی عرب کا دورہ کیا، جہاں ایک طرف ہماری برادری کے بعض اہل فکر کے علاوہ وہاں کے بعض فکری حلقوں سے ملاقاتیں کیں، اور اس نئی ابھرنے والی تنظیم کے متعلق ان کو مطلع وآگاہ کیا، تو دوسری طرف تنظیم کی معاشی حالت کو درست کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی بھی لگائی گئی تھی۔

مولانا نے اس دورے کے دوران روزنامہ ''عکاظ'' میں ایک تفصیلی انٹرویو دیا، انٹرویو لینے والا کوئی

(۱) مذکورہ ان تمام پارٹیوں کے علاوہ دیگر متحرک اور غیر متحرک جماعتوں کی مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی تصنیف ''سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں'' کا پہلا اور دوسرا ایڈیشن۔

درویش نامی صحافی تھا،آپ نے اس میں تنظیم کی بعض سرگرمیوں کے ساتھ سرزمین ارکان کی حالت زار کے علاوہ دیگر ضروری موضوعات پر کھل کر تفصیلی گفتگو کی۔

مولانا کے بیان والا یہ پرچہ میری نظر سے گزرا،شاید یہ پرچہ اب بھی میرے ذاتی اثاثہ میں موجود ہو،جسے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا تھا کہ آپ اسی زمانے میں اپنی تنظیم کے حوالے سے بڑے مطمئن تھے،اور ساتھ ساتھ اس تنظیم کے زیر سائے روہنگیا قوم کے مسائل حل کرنے اور اس مظلوم قوم کو مگھ اور برمی مظالم سے نجات دلانے کے حوالے سے بھی بڑے پر امید تھے،لیکن افسوس ہے کہ بعض لوگوں کی نادانی اور غرور و پندار نے آپ کی اس امید پر پانی پھر دیا تھا،اور بات بھی یہی ہے کہ دنیا میں ہر امید پوری کب ہوتی ہے؟ دراصل آپ کی سرگرمیوں کے متعلق تاریخ کا یہ تجربہ ہمارے لئے ایک درس عبرت ہے،جس سے ہمیں فائدہ اٹھانا ضرور چاہئے۔

مولانا محترم نے سعودی عرب کے اس سے پہلے اور بعد میں بھی بہتوں مرتبہ سفر کئے تھے،لیکن اس دورے کے دوران آپ نے جو سیاسی سرگرمیاں دکھائی تھیں وہ بڑی قابل قدر تھیں،جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ آپ نے اس دورے کے دوران عکاظ کے علاوہ بھی دیگر اخبارات میں پریس بریفنگ دی تھی،جس میں آپ نے ارکان کے حالات پر کھل کر گفتگو کی۔اور ساتھ ہی ساتھ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے اہداف و مقاصد اور پروگراموں کو واضح انداز میں بیان کیا،اور دنیا کو بتایا کہ ارکان اور وہاں کے مسلمانوں کے حالات کے پیش نظر روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کیا چاہتی ہے۔

مولانا کا یہ بیان سامنے آتے ہی سعودی عرب میں پائی جانے والی روہنگیا برادری کے بعض حلقوں کی جانب سے موافق ومخالف مختلف ردعمل سامنے آیا تھا،دوستوں نے اس بیان کا دل کھول کر خیر مقدم کیا،لیکن بعض نادان بلکہ سازش کے شکار لوگوں نے اور وہ بھی بعض حضرات کی ایماء پر اس کی کھل کر مخالفت کی،جس کا اجمال کچھ یہ ہے کہ:

۱۔ مولانا کے دیرینہ ساتھیوں،احباب ورفقائے کار کے علاوہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے حامیوں نے اس انٹرویو پر خوشی کا اظہار کیا،جن کا کہنا تھا کہ آپ کا انٹرویو زمینی حقائق اور واقعیت

پر مبنی تھا،جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اس انٹرویو کے بعد مولانا محترم کے بعض مخالفین اور بطور خاص اس وقت کی ہماری بعض متحرک جماعتوں کے اراکین وکارکنان (شاید ان جماعتوں کے لیڈروں کے شہ پر ہو) آپ کی مخالفت پر کھل کر سامنے آئے تھے،جن کا دعوی تھا کہ آپ کا انٹرویو اور اس میں روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی طرف سے کیا گیا دعوی زمینی حقائق اور واقعیت کا سراسر برعکس تھا،ویسے ان مخالفین نے آپ کے خلاف ہر کجا واویلا مچایا،حتی کہ سرزمین امن وسکون میں آپ کا جینا تک دوبھر کر دیا تھا،لیکن آپ بھی ہار ماننے والے کب تھے؟ آپ نے ان مخالفین کا ڈھٹ کر مقابلہ کیا،حتی کہ سنا تھا کہ ان مخالفین میں سے بہتوں نے بعد میں تائب ہو کر آپ سے معافی بھی مانگ لی تھی۔

آپ کے مذکورہ انٹرویو پر میرا اتنا کہنا ہے کہ اگرچہ اس پر مخالف وموافق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے،اور ہر ایک کو کہنے کا حق بھی حاصل ہے،لیکن ارکان اور یہاں کے مسلمانوں کے حوالے سے جتنی بھی باتیں کہی گئی ہیں،وہ تب بھی سچائیت اور واقعیت پر مبنی تھیں،اور اب بھی یہ جوں کا توں باقی ہیں۔

ارایل اواور اسلامک فرنٹ کے مابین کشیدگی

مولانا محترم کی سعودی عرب کے سفر سے واپسی کے بعد ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) اور روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے درمیان شدید سے شدید ترین کشیدگی شروع ہوگئی تھی، جس میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا تھا،اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ فرنٹ کے بیس سے زائد مجاہدین جن کے سرغنہ مسٹر رشید احمد (بامونگ) معروف بہ مایو رشید اور عبد القیوم والیاس تھے،بیس سے زائد جدید ترین اسلحہ جات سمیت روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) میں شامل ہو گئے تھے،مسٹر نور الاسلام صاحب نے اپنے ان اسلحہ جات کی بازیابی کے لئے سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی،فرنٹ کی جانب سے روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) والوں کو دھمکیوں پر دھمکیاں دی جا رہی تھیں،لیکن ارایل کی روح رواں مولانا محمد کبیر نے فرنٹ کے چیلنجز کو قبول کرتے ہوئے صاف جواب دیا تھا کہ کسی بھی قیمت میں فرنٹ کو اسلحہ جات واپس نہیں کئے جائیں گے۔بہر حال ان مجاہدین کے فرنٹ سے بچھڑ

جانے اورارایل اومیں شامل ہونے کے کچھ خلفیات بھی ہیں، جو یہ ہیں کہ:

''۱۹۸۸ء کے دوران عین رمضان المبارک میں ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے کچھ مجاہدین نے جناب محترم نورالاسلام صاحب (اس وقت کے اسلامک فرنٹ کے صدر) کی لاعلمی میں اتحادالمجاہدین کے معسکر پر حملہ کردیا تھا، اوراس کے تمام سروسامان اٹھاکر فرنٹ کے معسکر میں لے جائے گئے تھے، جس کی وجہ سے ہمارے سیاسی وانقلابی حلقوں میں ایک ہنگامہ بپا ہوگیا تھا، یہ واقعہ جب ہو رہا تھا اس وقت مسٹر نورالاسلام صاحب سعودی عرب کے دورے پر تھے، یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تو مسٹر نورالاسلام صاحب اپنے دورہ کو مختصر کرکے بنگلا دیش واپس آگئے، اس کے معابعد اتحادالمجاہدین کے معسکر کی زیارت کی اور سارے سامان مع کچھ زائد معاوضے کے واپس کردینے کے علاوہ کھلے الفاظ میں معافی بھی مانگی تھی، اس کے بعد مسٹر نورالاسلام صاحب نے اپنے شرپسند مجاہدین سے کہا کہ تم سب اپنے اپنے اخلاق کو سنوارنے کے لئے ایک ایک چلہ جماعت تبلیغ میں لگاکے آؤ، لیکن افسوس ہے کہ ان شرپسند عناصر پر اس حکم کا الٹا اثر ہوگیا تھا، اور بجائے اس کے وہ عناصر چلہ کو جاکر اپنے اپنے اخلاق کو سنوارتے بلکہ اندر ہی اندر میں خود فرنٹ اوراس کے قائد پر برہم ہوگئے تھے۔ آخرکار ان شرپسندوں نے خفیہ طور پر روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے بعض سرکردہ لیڈروں سے رابطہ کیا، اور بات خفیہ طور پر طے کرلی کہ یہ شرپسند لوگ فرنٹ سے فرار ہوکے ارایل او میں شامل ہوجائیں گے، چناں چہ بعد میں ہوا بھی ویسا۔ جس کی وجہ سے دونوں تنظیموں کے مابین ایک وقت تک شدید کشیدگی جاری تھی''۔

بہرحال ان شرپسند عناصر کے فرنٹ سے بچھڑکر روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) میں شمولیت کی وجہ سے دونوں جماعتوں کے مابین سخت کشمکش شروع ہوچکی تھی، حتی کہ ایک دور ایسا بھی آیا تھا کہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) جس کا معسکر ٹینگ خالی کے مقام پر تھا کو تشویش لاحق ہوچکی تھی

کہ فرنٹ والے کہیں اس پر حملہ نہ کردیں، کیوں کہ اسی زمانے میں فرنٹ والے آئے دن اس تیاری میں تھے کہ کسی بھی طریقے سے ارایل او کے معسکر پر حملہ کرکے اسلحہ جات کی بازیابی کو ممکن بنایا جاسکے، لیکن بالآخر ایسی نوبت نہیں آئی تھی، اس کے بعد روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) اوران شرپسند عناصر اوران اسلحہ جات کا کیا حشر ہوا، اس کی قدرے تفصیلات انشاء اللہ تعالی اگلی سطور میں آرہی ہیں۔

اتحادالمجاہدین کے مجاہدین کی ارایل او میں شمولیت

ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے مجاہدین کی روہنگیا لیبریش آرگنائزیشن (RLO) میں شمولیت کے بعد مؤخرالذکر تنظیم کی ہماری قومی سطح پر کافی شہرت ہوچکی تھی، فرنٹ اگرچہ اس کوشش میں تھی کہ کسی بھی طریقے سے اپنے اسلحہ جات بازیاب کرنے میں کامیاب ہوجائے، لیکن آخر تک اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہوسکا۔

ادھر ارایل او کے وہ مجاہدین جو فرنٹ سے بچھڑے ہوئے تھے، انہوں نے دوبارہ یہ کوشش شروع کررکھی تھی کہ اتحادالمجاہدین کے وہ سامان جو نورالاسلام صاحب نے واپس کردیا تھا، انہیں اتحادوالوں سے کسی بھی قیمت پر چھین لیا جائے، اس حوالے سے ہمارے ممدوح مولانا حسین احمد صاحب نے بڑی کوشش کی تھی، آپ نے اتحادوالوں کے معسکر میں سے چند سرکردہ لوگوں کو اپنا لیا تھا، جن میں آپ کے پھوپی زاد بھائی مولوی محمد حسین ساؤفرانگی (نائب کمانڈر) اورالحاج محمد قاسم صاحب علی تانجوی ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا حسین احمد صاحب اتحادالمجاہدین کے مجاہدین اور سارے سروسامان کو استقبال کرنے کے لئے بذات خود چاٹگام سے اوکیہ اورکوٹ بازار ہوتے ہوئے شونافارا پہنچے، اتحاد والوں سے یہ کہا گیا تھا کہ اگر اتحادالمجاہدین اور ارایل او پورے انضمام کی شکل میں ایک ہوجائے تو ایک بڑی تنظیم قومی سطح پر وجود میں آجائے گی، جس کی وجہ سے نہ صرف ہم سب کا بڑا فائدہ ہوگا بلکہ یہ قوم کے لئے ایک بڑی خوش آئند بات ہوگی، اب مولوی محمد حسین اور حاجی محمد قاسم کی کوشش سے اتحاد کے تقریباً سارے مجاہدین (جو اس وقت بڑے پریشانی کے عالم میں معسکر میں دن رات گزار رہے تھے) اتحاد کے معسکر کو چھوڑ چھاڑ کر روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن میں شمولیت کے لئے راضی ہوگئے

، یوں اتحاد کے سارے مجاہدین (دو ایک جن میں مولوی محبت علی خیر مورہ فاروی اور مولوی حشمت اللہ کو چھوڑ کر) مولانا حسین احمد صاحب سے شونا فارا کو آملے تو آپ نے ان ساروں کو ٹنگ خالی کے مقام پر لے گیا اور دو ایک روز تک ان کو ارایل او کے ساتھ رکھ کر آہستہ آہستہ سب کو فارغ کر دیا گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے مذکورہ مجاہدین کو روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) میں لانے میں جس طرح مولانا محمد کبیر صاحب (سکریٹری جنرل ارایل او) کی کوشش تھی، ٹھیک اسی طرح اتحاد المجاہدین کے مجاہدین کو ارایل او میں لانے میں مولانا حسین احمد صاحب کی بار آور کوششیں شامل حال تھیں، اس حوالے سے ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر اتحاد المجاہدین کے معسکر کے اندر آپ کے پھوپی زاد بھائی مولوی محمد حسین صاحب نہیں ہوتے، تو شاید مولانا کو اتنی بڑی کامیابی ملی بھی ہوتی، یعنی اتحاد کے مجاہدین کو بہلا پھسلانے میں آپ کے شہ پر مولوی محمد حسین صاحب نے بڑا کردار ادا کیا تھا۔

اتحاد المجاہدین والوں سے وعدہ تو بہت کچھ کیا گیا تھا، لیکن یہاں بعد میں اتحاد والوں کے بیان کے مطابق ایک بھی وعدہ پورا نہیں کیا گیا، ان میں سے ایک کا بیان یہاں ملاحظہ ہو کہ:

> ''اتحاد المجاہدین کے معسکر سے فرار ہونے سے بہتوں دن پہلے مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ ہماری بات طے ہو چکی تھی، ہمارے ساتھ بہت کچھ وعدہ بھی کیا گیا تھا، آپ ہمیں استقبال کرنے کے لئے چاٹگام سے اوکیہ اور کوٹ بازار ہوتے ہو ئے شونا فارا کے مقام تک آئے، اور ہم سب کو لے کر ٹینگ خالی کے مقام پر لے گئے تھے، لیکن بڑے افسوس کا مقام تھا کہ ہمارے ساتھ جو جو وعدہ کیا گیا تھا اس کا ایک بھی پاس ولحاظ نہیں رکھا گیا، چند دن جاتے نہ جاتے ارایل او والے سارے وعدے سے یک سر مکھر گئے تھے، یعنی ہمیں ان کے ساتھ چند دن رکھ کر ہم سے سارے اسلحہ جات چھین لئے گئے اور ہمیں حکمت ومصلحت کا نام دے کر معسکر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فارغ کر دیا گیا تھا، ویسے ہم چند دن ادھر ادھر مارے مارے پھیرتے رہے، بعد میں ہمارا پرسان حال تک کوئی نہیں رہا''۔

ارایل او میں خلفشاریاں

۱۹۸۸ء کے اواخر میں روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) ایک طرح کی داخلی خلفشاری کی شکار ہو چکی تھی، تنظیم کے صدر اگر چہ جناب سلیم احمد صاحب خیر فاروی تھے، لیکن مولانا محمد کبیر صاحب خواندگی تنظیم میں ہر ایک اعتبار سے اپنے آپ کو نمایاں دکھانے پر تلے ہوئے تھے، اب مولانا حسین احمد صاحب کا جہاں تک سوال ہے کہ آپ تنظیم کے اندر میری اطلاعات کے مطابق جمہوری روایات کو فروغ دینے کے قائل تھے، لیکن مولانا محمد کبیر صاحب کسی کی بھی سننے کو تیار نہیں تھے، یوں مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا محمد کبیر صاحب کے درمیان رسہ کشی اور تناؤ شروع ہو گیا تھا۔

ایک طرف روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) مالی اعتبار سے سخت ترین پریشانی کی شکار تھی، تو دوسری طرف اس کے نمایاں ترین لیڈروں کے مابین اقتدار کی رسہ کشی کا دور دورہ شروع ہو چکا تھا، پھر ایسے حالات پر مستزاد ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کی طرف سے ارایل او پر دباؤ پر دباؤ دیا جا رہا تھا کہ وہ اس کے اسلحہ جات فورا واپس کر دے، جس کا اجمالی تذکرہ اوپر گزر چکا ہے، یعنی فرنٹ والے ہمیشہ اس تاک میں تھے کہ کسی بھی طریقے سے وہ اپنے اسلحہ جات کی بازیابی کو یقینی بنا سکے، کبھی دھمکیوں پر دھمکیاں دے رہے تھے اور کبھی کبھار گھیراؤ پر گھیراؤ بھی کیا جا رہا تھا۔

ایسے حالات میں روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے نمایاں ترین لیڈروں کے مابین جس یک جہتی اور ہم آہنگی کی ضرورت تھی اس کے برعکس اس میں فکری، سیاسی، ذہنی، عملی، کرداری غرض ہر ایک اعتبار سے افراتفری، تناؤ بلکہ رسہ کشیاں شروع ہو چکی تھیں، بالآخر مولانا حسین احمد صاحب نے اپنوں کے مابین پائے جانے والے اختلافات کو مزید طول دینے کے بجائے ایک قسم کی علیحدگی یا گوشہ نشینی ہی کو اپنی ذات کے لئے عافیت اور اپنے سیاسی مستقبل لئے مناسب سمجھا تھا، یوں آپ جنگل میں دو ایک دن گزار کر ہمیشہ یعنی آج تک کے لئے زخم سے چور ہو کر چاٹگام چلے آئے تھے، آپ کی دنگل سے واپسی کے بعد اس تنظیم کی عملی باگ ڈور مولانا محمد کبیر صاحب کے ہاتھ میں چلی گئی تھی، یوں مولانا محمد کبیر صاحب ہی یہاں سیاہ سفید کے مالک بن گئے تھے، جہاں تک صدر صاحب کا تعلق تھا کہ آپ نے ہر چندان دونوں شخصیات کے مابین مفاہمت کی کوشش کی، لیکن ان کو ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا تھا۔

ایک دل شکن قومی حادثہ

مولانا حسین احمد صاحب کی روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) سے ایک قسم کی کنارہ کشی کے بعد یہ تنظیم مزید پریشانی کی شکار ہوچکی تھی، اس سے پہلے ہماری برادری کے بعض لوگ سمجھتے رہے تھے کہ اور جو بھی کچھ ہو لیکن ہماری اس نئی نویلی ابھرتی ہوئی تنظیم میں چند بڑے پتے کے لیڈران موجود ہیں، جن کے درمیان اتحاد واتفاق بھی پایا جاتا ہے، لیکن مولانا حسین احمد صاحب کی کنارہ کشی کے بعد اس تنظیم کے حوالے سے لوگوں کی آراء مختلف ہوچکی تھیں اور ہماری برادری کے اکثر لوگ جان گئے تھے کہ اس نئی جماعت کے اندر قیادت کا شدید سے شدید ترین بحران پیدا ہوچکا ہے۔

تنظیم کے صدر جناب الحاج سلیم احمد صاحب نے باوجودیکہ کوششیں کیں کہ لیڈروں کے مابین پائی جانے والی عدم ہم آہنگی کو ختم کر کے ان کے مابین اتحاد و یک جہتی کو بحال کیا جائے، لیکن جہاں تک اس وقت اندازہ کیا گیا تھا کہ مولانا محمد کبیر صاحب کے مخصوص افتادِ طبع اور ایک حد تک ان کی سخت گیر ذہنیت صدر صاحب کی کوششوں کے سامنے سنگ گراں بن کر حائل تھی، انہوں نے ہر چند کوششیں کیں کہ مولانا محمد کبیر کی موجودگی میں مولانا حسین احمد صاحب کو دوبارہ تنظیم میں واپس لایا جائے، لیکن جہاں تک میری جانکاری ہے کہ مولانا محمد کبیر صاحب نے جناب صدر صاحب کی ہر چند کوششوں کو ناکام بنادیا تھا۔

یہاں ایک بات یاد رہے کہ تنظیم کے مجاہدین کے علاوہ خود صدر صاحب کو مولانا محمد کبیر صاحب سے زیادہ مولانا حسین احمد صاحب پر اعتماد اور بھروسہ تھا، آپ کی تنظیم سے کنارہ کشی کے بعد مجاہدین کے اندر بڑی حد تک مایوسی بلکہ اداسی چھا گئی تھی، تاہم ایسے حالات میں بھی مولانا محمد کبیر صاحب نے ہر چند کوششیں کیں کہ تنظیم کو ہر ایک اعتبار سے سنبھالا دے کر اسے مختلف بحرانوں سے نکالا جاسکے، لیکن افسوس ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا گیا توں توں مجاہدین مختلف دلدل میں پھنستے گئے تھے، ایک طرف مجاہدین مالی بحران کے شکار تھے، تو دوسری طرف ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے دباؤ سے سخت پریشان، ایسے حالات میں ان کے لئے یہاں زمین بالکل تنگ ہوچکی تھی، حتیٰ کہ ایک زمانہ ایسا آن پہنچا تھا کہ سرحد کے اس پار ان کے لئے بچنے کا کوئی بھی راستہ بچا ہی نہیں تھا، ایسے حالات میں

انہوں نے برمی فوجی حکام سے رابطہ کیا، یوں عبدالقیوم، محمد الیاس اور محمد ایوب وغیرہ کی قیادت میں متعلقہ سرحدی فوجی حکام کے سامنے انہوں نے اپنے سارے ہتھیار ڈال دیئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس حوالے سے راقم نے اپنی تالیف ''حیات نور'' میں ایک تحریر لکھی ہے، جو حاضرِ خدمت ہے:

> ''بلاشبہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) والوں کے چہرے پر خود اس تنظیم کے ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ بدعنوان مولوی نما، منہ پھٹ اور سینہ زور آدمی کی سازش کے نتیجے میں ان نام نہاد مجاہدین کے برمی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا واقعہ بلاشبہ ایک بدنما داغ بلکہ کلنگ کا ٹیکہ تھا اور ہے، ارایل اووالے اس اکیلا بد ترین واقعہ بلکہ اپنی نوعیت کے اس منفرد قومی حادثہ کے روہنگیا قوم کے سامنے جوب ده تھے اور ہمیشہ رہیں گے، جو تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ تھا اور رہے گا''۔(۱)

ارکانی مسلمانوں کی انقلابی اور تحریکی سرگرمی کے اس طویل دور میں ان مجاہدین کا ہتھیار ڈالنا ایک دل شکن اور مایوس کن واقعہ تھا، جو روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے دور قیادت میں رونما ہوا تھا، جسے بعض لوگوں نے اس تنظیم کے لیڈروں کی عدم صلاحیت اور ناعاقبت اندیشی سے بھی تعبیر کیا تھا، بہرحال لوگ اسے جس الفاظ سے بھی تعبیر کریں یا نہ کریں، لیکن سچ تو یہی ہے کہ اس عظیم المیہ نے پوری قوم کو بے حد متأثر کیا تھا، اس واقعہ کے بعد مولانا محمد کبیر سمیت اس تنظیم کے سارے لوگ چاٹگام جا چھپے تھے، لیکن ہر طرف سے ان پر لعنت وملامت کا بوچھاڑ شروع ہوچکا تھا، ہتھیار ڈالنے والے شر پسند عناصر تو ظاہر ہے کہ برمی فوجی حکام کے شیطانی جال کے شکار ہوچکے تھے، ان پر جتنی بھی ملامتیں کی جائیں تو بھی کم ہیں، لیکن اس تنظیم کے لیڈروں کی ذمے داریوں کا جہاں تک سوال ہے کہ در اصل بات یہی ہے کہ اس زمانے میں ہماری برادری کی سوچ بچار رکھنے والے حلقوں کا یہی کہنا تھا کہ اس قومی حاثہ کا پورا پورا ذمے داریوں تو عموماً روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے تمام کے تمام لیڈران ہیں، تاہم مخصوص طور پر اس کی حقیقی ذمے داری مولانا محمد کبیر صاحب کے سر پر ہے، جن کی

---

(۱) محمد طاہر جمال ندوی، حیاتِ نور، ص:۲۲۱۔

عدم صلاحیت، نا قابلیت اور مخصوص افتادِ طبع ہی نے اتنے بڑے حاثہ کو جنم دیا تھا، کاش ان کے اندر تھوڑے ہی تواضع رہے ہوتے، کہتے ہیں کہ قومی سطح پر اتنا بڑا حاثہ رونما ہی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالی ان کو معاف فرمائے۔آمین۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے سارے لیڈران بشمول مولانا حسین احمد صاحب اس واقعہ کے ذمے دار ہیں، لیکن ان لوگوں کے خیالات کے برعکس میرے خیال میں آپ اس واقعۂ جانکاہ کے ذمے دار نہیں ہیں، کیوں کہ پچھلی سطور میں عرض کی جا چکی ہے کہ اس حادثہ کے بہتوں دنوں پہلے مولانا حسین احمد صاحب نے اس تنظیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، اس لئے اس حاثہ کی ذمے داری میں آپ کو کسی بھی طرح لپیٹا نہیں جا سکتا، صرف یہی نہیں بلکہ اس حاثہ کے طویل عرصہ بعد میں نے اس تنظیم کے بعض لیڈروں جن میں الحاج سلیم احمد صاحب نا قابل فراموش ہیں سے طول طویل گفتگو کی تھی، جن کا کہنا تھا کہ کاش اگر اس وقت مولانا حسین احمد صاحب کو تنظیم سے کنارہ کش نہیں ہونا پڑتا، تو شاید روہنگیا قوم کے دورِ آخر کی تاریخ میں اتنا بڑا حادثہ رونما ہی ہوتا، اور تو اور اس زمانے میں اس تنظیم کے صدر سلیم احمد صاحب نے مزید یہاں تک بتایا تھا کہ:

''ہمارے تقریباً سارے کے سارے مجاہدین اور ذاتی طور پر میں بھی مولانا حسین احمد صاحب کے چاہنے والوں میں سے تھا، ہم سب کو آپ پر اعتماد اور کافی بھروسہ تھا، لیکن مولانا محمد کبیر صاحب نے مولانا حسین احمد صاحب کے لئے یہاں کا ماحول ایسا بنا دیا تھا کہ کوئی گنجائش نہیں تھی کہ مولانا یہاں آکر کام کریں، کاش اس وقت آپ یہاں دوبارہ آسکتے تو شاید مجاہدین آپ کے گرد دلجمعی کے ساتھ جمع ہو جاتے، لیکن مولانا محمد کبیر صاحب کو یہ گوارہ ہی کب تھا؟ کیا کریں کہ ہمیں مولانا محمد کبیر صاحب کی نا عاقبت اندیشی، غرور و پندار اور ان کے مخصوص افتادِ طبع نے ہی دے مارا ہے، بالآخر جس کا خمیازہ پوری قوم کو بھگتنا پڑا ہے''۔

پھر بھی جہاں تک دیکھا اور اندازہ کیا گیا کہ اس حادثۂ جانکاہ نے مولانا حسین احمد صاحب کے دل و دماغ پر شدید سے شدید ترین دھچکا لگایا تھا، جس نے آپ کی سیاسی سوچ بچار پر شدید اثر ڈالا تھا، اس

واقعہ کے بعد آپ سیاسی اور فکری اعتبار سے کافی حد تک کشمکش اور الجھن سے دوچار ہو چکے تھے، جہاں تک میرا ذاتی خیال ہے کہ آپ جیسے فراخ دل اور وسیع النظر انسان کو امید تھی کہ اگرچہ وقتی طور پر اس تنظیم کے بعض لیڈروں کے مابین عدم اعتماد، عدم مفاہمت اور اختلاف کی بدلی چھائی ہوئی تھی، لیکن بہت ہی قلیل مدت میں یہ بدلی ضرور چھٹ جائے گی، مگر افسوس کہ آخر کار ایسا نہیں ہو سکا تھا۔

ادھر اس واقعہ کے عرصہ بعد میں نے مولانا محمد کبیر صاحب سے ڈھیر ساری ملاقاتیں کی تھیں، اس حوالے سے ان کے ساتھ طول طویل گفتگو کی گئی تھی، ایک مجلس میں گفتگو کے دوران میں نے آپ سے کہا کہ مولانا محترم! ار ایل او کے بعض لیڈران اس حادثہ کا پورا پورا ذمہ دار آپ کو ٹھہراتے نہیں تھکتے ہیں، تو اس پر آپ کا کیا خیال ہے؟ تو آپ نے میرے اس سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ:

''درحقیقت بات ہی یہی ہے کہ ان نکمے لوگوں نے اپنی اپنی ذمے داریوں کا حق بالکل ادا نہیں کیا تھا، صرف یہی نہیں کہ ان میں سے بعض لوگوں نے اپنی ذمے داریوں سے پہلو تہی بھی کی تھی، مصیبت آنے والی تھی اور آئی، جب کہ یہ لوگ ساری ذمے داری میرے سر پر تھونپ کر راہ فرار اختیار کرنے کو اپنی اپنی عافیت سمجھ رہے ہیں، اور میرے خلاف سازشوں پر سازشیں کرتے پھر رہے ہیں، درحقیقت بات یہی ہے کہ یہ لوگ سرے سے پتے کے نہیں تھے اور نہیں ہیں، انقلاب کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، جو ان نکموں کے ذریعے برپا ہو جاتا، میرا قصور ہی یہی تھا کہ میں نے ان پر کچھ بھروسہ کیا تھا، کاش اگر مجھے ان کی صلاحیت اور لیاقت کا اندازہ ہوا ہوتا، تو شاید آج میرے چہرۂ زیبا پر اتنا بڑا کلنگ کا ٹیکہ لگا ہی ہوتا''۔

بہر حال اس واقعہ کے بعد روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) اگلے کم سے کم تین سالوں تک خاموشی اور سرد مہری کی شکار ہو چکی تھی، یہ وقعہ نہ صرف مولانا محمد کبیر اور سلیم احمد صاحب کے لئے بلکہ اس تنظیم کے ساتھ رشتہ رکھنے والے کسی بھی انسان کی سیاسی، فکری اور انقلابی زندگی کے لئے ایک بدنما داغ ثابت ہو چکا، مخصوص طور پر مولانا محمد کبیر اور سلیم احمد صاحب کے لئے ہماری سیاسی فضاء اور انقلابی ماحول کثیف سے کثیف تر ہو چکا تھا، یہ دونوں حضرات آج اس دنیا میں نہیں ہیں، ان دونوں کی

زندگیوں میں اس واقعہ کے بعد روہنگیا سیاسیوں اور انقلابیوں کی کوششوں سے ایک سے زیادہ متحدہ فورم یا جماعتیں منظر عام پر آئیں، لیکن کسی بھی متحدہ فورم یا جماعت میں یہ دونوں مدعو نہیں تھے، اور کسی بھی متحدہ کوشش میں ان دونوں کے چہرے نظر نہیں آئے، اس سلسلے میں اور تو اور ۱۹۹۸ء کے دوران ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) اور روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے دونوں دھڑے اور قوم کے بعض اہل علم ودانش کی مسلسل اور بار آور کوششوں کے نتیجے میں ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کی بنیاد پڑی، تو اس زمانے میں قوم کے اہم لوگوں کے انتخاب کے دوران بعض لوگوں نے ارایل او والوں کے نام بھی سامنے لائے تھے، جن میں مولانا محمد کبیر اور سلیم احمد صاحب پیش پیش تھے، لیکن مذکورہ دونوں جماعتوں کی قیادات اور ان کے علاوہ بھی بعض اہم لوگوں نے یک زبان ہوکر ان دونوں ناموں کو مسترد کر دیا، اور کہا گیا تھا کہ ان دونوں کی وجہ سے ہماری تاریخ کے دور آخر میں وہ واقعہ پیش آیا جو ہماری تحریک آزادی کی تاریخ کے لئے ایک بدنما داغ سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے، دراصل راقم سطور جس کا نام بھی ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) میں شامل تھا، اور وہ اس نئی نویلی تنظیم میں شامل ہوکر قومی خدمات کے میدان میں پیش پیش تھا کی بھی یہی تمنا رہی تھی کہ اس نت نئی ابھرنے والی متحدہ تنظیم میں ارایل او سے مولانا محمد کبیر، سلیم احمد صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب بھی شامل ہوجائیں، اور راقم کی جانب سے اس حوالے سے کافی کوششیں بھی کی گئی تھیں، لیکن بعض ارباب حل وعقد کی جانب سے یہی جواب ملا کہ ''پہلے ان لوگوں کو قوم سے واضح طور پر معافی مانگنی ہوگی، اور اس کے بعد ہی سوچا جائے گا کہ آیا ان لوگوں کو اس نئی تنظیم میں شامل کرنا کہاں تک درست ہوسکتا ہے'' مگر ان لوگوں کے پاس قوم سے معافی منگوانے کی گزارش لے کر جائے تو کون جائے؟ آخر ہوا وہی جو ہونا تھا، یعنی ان حضرات کی شمولیت کے بغیر ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کا اعلان ہوگیا، تاہم یہ الگ بات ہے کہ اگر اس وقت ان حضرات کو اس نئی تشکیل پانے والی متحدہ تنظیم میں دعوت شمولیت دی بھی جاتی تو آیا وہ لوگ شامل ہوتے بھی کہ نہیں؟ اس سوال کے جواب کے بطور میری معلومات یہی ہے کہ وہ حضرات شامل ہی نہیں ہوتے، جس کی طول طویل داستان ہے، سردست اسے چھیڑنا کوئی سودمند کام نہیں ہے۔

ارایل او کو احیاء کرنے کی کوشش

روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے مجاہدین کے برمی فوجی حکام کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد ارایل او کے تمام لیڈران ایک قسم کے سیاسی اپاہج بن چکے تھے، مولانا محمد کبیر صاحب عملاً اس تنظیم سے علیحدہ ہوکے چاٹگام میں اللہ اللہ خیر صلہ کی زندگی بسر کر رہے تھے، اور اس تنظیم کے صدر جناب سلیم احمد صاحب بھی محو حیرت میں چاٹگام میں دم واپسیں لے رہے تھے، ایسے حالات میں مولانا حسین احمد صاحب آگے بڑھے اور روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کو دوبارہ احیاء کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی، جس میں آپ قدرے کامیاب بھی ہوئے۔

یہ ۱۹۹۱ء کا زمانہ تھا، ادھر ارکان سے روہنگیا مہاجرین کی ایک بڑی تعداد بنگلا دیش آچکی تھی، روہنگیا مسلمانوں کے حوالے سے ہر کجا واویلا مچا ہوا تھا، اور تو اور بنگلا دیش میں ایک قسم کا ہنگامہ بپا تھا، کہ اب کیا ہوا اور کیا ہونے والا ہے، یہی سوال ہر ایک کے دل ودماغ کو گھن کی طرح کھا رہا تھا، ہماری اس وقت بھی زیر زمین کام کرنے والی جماعتیں تھیں، لیکن مختلف امراض کی شکار بس ایک قسم کی منتظر فردا، کسی کے پاس کچھ صلاحیت تھی اور نہ قابلیت، ہر کوئی قوم کے مسائل اور مشکلات پر آنسو بہاتا تو تھا لیکن ایسے آنسو بہانے سے کیا فائدہ جسے کوئی دیکھے اور دیکھے بھی تو تڑپ کر اٹھنے کی اس کے پاس قابلیت تھی اور نہ استعداد؟

ظاہر ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب کا روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے بننے اور اس کے اعلان کرنے میں کافی کردار رہا ہے، ۱۹۸۸ء سے لے کر ۱۹۹۱ء تک کے ان چند سالوں میں کئے گئے جتنے بھی کردار رہے، وہ ظاہر ہے کہ آپ کے سامنے تھے، مولانا محمد کبیر اور آپ کے مابین جو اختلافات تھے وہ اب مولانا محمد کبیر صاحب کی تنظیم سے عملاً علیحدہ ہوجانے کے بعد ختم ہوگئے، چوں کہ مولانا کی روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے ساتھ بڑی امیدیں اور توقعات وابستہ تھیں، اس لئے آپ نہیں چاہتے تھے کہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) دنیا سے کلی طور پر ختم ہوجائے، اس لئے اب یہی سوچ کر کہ قوم کے ایسے مشکل حالات میں ایک حساس اور دردمند انسان کے لئے کسی بھی قسم کی کوشش کئے بغیر صرف اور صرف منتظر فردا بن کر بیٹھے رہنا مناسب ہے

اور نہ جائز۔

اب مولانا محترم نے جناب سلیم احمد صاحب سے ملاقات کی، جن کے ساتھ ماضی قریب و بعید میں آپ کے کسی بھی قسم کی سیاسی، فکری، انقلابی اور نظریاتی اختلافات نہیں تھے، اور یوں بھی جہاں تک دیکھا گیا تھا کہ مولانا اگرچہ یک عالم دین ہیں اور سلیم احمد صاحب ایک دانش ور، لیکن دونوں کے مابین کام اور کاز کے حوالے سے کافی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی تھی، ورنہ ظاہر ہے کہ مولانا جس آن بان کے عالم ہیں، ان سے ہماری عام قومی روایت کے مطابق جناب سلیم احمد صاحب سے کیا نسبت؟ لیکن بات یہ ہے کہ مولانا محترم جناب سلیم احمد صاحب کو ہر حال میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور اب بھی بڑی محبت اور احترام سے یاد کرتے رہتے ہیں، روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے دور میں ہو یا اس کے بعد، کہیں بھی آپ جاتے، جناب سلیم احمد صاحب کا خیال رکھتے تھے، اس حوالے سے ایک بات یاد آگئی ہے کہ ایک روز کا واقعہ تھا کہ مولانا محترم الحاج ابوالکلام صاحب خونیہ فاروی کی رہائش گاہ میں ایک اجلاس میں شریک تھے، بات چھیڑی ایک نئی تنظیم کی تشکیل کی، تو ایک مرحلہ پر الحاج ابوالکلام صاحب نے مولانا سے مخاطب ہوکر کہا تھا کہ ''ابھی سلیم احمد صاحب کی بات چھوڑیں، انہیں بھی انشاء اللہ کسی مرحلہ میں بلا لیا جائے گا'' آپ نے یہ بات سنی تو حاجی صاحب پر کافی برہم ہوکے فرمانے لگے کہ محترم سلیم صاحب میری تنظیم کے قابل قدر صدر ہیں، ہم ان کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، کیا وہ اس انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ انہیں کسی مرحلہ میں بلا لیا جائے گا؟ تو آپ کا یہی ردعمل دیکھ کر حاجی صاحب کہنے لگے کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت ساری تنظیموں کے لیڈران اور کارکنان دیکھے ہیں، لیکن مولانا حسین احمد صاحب جیسا وفادار انسان کبھی اور کہیں نہیں دیکھا۔

بہرحال مولانا محترم نے جناب سلیم احمد صاحب سے چند ملاقاتیں کیں اور بات طے کر لی گئی تھی کہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کو دوبارہ احیاء کر لیا جائے، یوں آگے چل کر آپ نے اپنے چند دوستوں، شاگردوں اور ہم خیالوں پر مشتمل جناب الحاج سلیم احمد صاحب کی زیر صدارت ہوٹل نئی یو نائیٹد چاٹگام میں اجلاس منعقد کرایا تھا، جس میں درج ذیل حضرات نے شرکت کی:

۱۔ جناب الحاج سلیم احمد بن نورالزمان صاحب خیر فاروی، منگڈوی۔
۲۔ جناب مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب لمبابیلی، بوسیدنگی۔
۳۔ جناب مولانا سیف اللہ بن مولانا عبدالجبار صاحب گدوسراوی، منگڈوی۔
۴۔ جناب مسٹر احسان اللہ صاحب فوئمالوی، بوسیدنگی۔
۵۔ جناب مولوی احمد الرحمن صاحب کیاکتوی۔
۶۔ جناب مولوی محمد طاہر جمال ندوی صاحب باغکونوی، بوسیدنگی۔

یہ اجلاس وقفے وقفے کے ساتھ تقریبا ایک مہینے سے زیادہ عرصہ تک جاری تھا، جس میں روہنگیا مسلمانوں کے حالات پر بڑی امعانِ نظر اور سنجیدگی سے غور وخوض کیا گیا تھا، علاوہ اس کے اسی زمانے میں روہنگیا قوم کی نجات وفلاح کے حوالے سے قومی سطح پر انقلابی اور سیاسی کام کرنے والی جماعتوں کی کارکردگیوں اور سرگرمیوں پر بھی خاصی نظر ڈالی گئی تھی، اور بطور خاص ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ اور روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن اور ان دونوں جماعتوں کی قیادات کی استعداد اور صلاحیات اور ان کے افکار ونظریات پر خاصی بحث کی گئی تھی، آخر میں یہ ضرورت محسوس کی گئی تھی کہ قوم کے حالات حاضرہ کے پیش نظر مذکورہ ان جماعتوں کی سرگرمیوں اور کارکردگیوں کے ہوتے ہوئے بھی روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کو دوبارہ احیاء کیا جائے، یوں مؤخر الذکر اس تنظیم کی تجدید واحیاء، اس کے امکانیات اور ضروریات پر بھی کافی گفتگو اور مشورے ہوئے تھے، آخر کار یہ بات طے پائی تھی کہ جناب الحاج سلیم احمد صاحب کی سربراہی میں اس تنظیم کو دوبارہ احیاء کر کے قوم وملت کی خیرخواہی اور نجات کے لئے از سر نو کوششیں کرنی چاہئے۔

اس اجلاس کے اختتام پر یہ تجویز بھی پاس کر لی گئی کہ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی جانب سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور حضرت مولانا سیف اللہ صاحب سعودی عرب کا دورہ کریں، جو وہاں پائی جانے والی برادری کے ان افراد کو دوبارہ فعال کریں گے، جو ماضی قریب وبعید میں اس تنظیم کے کارکن رہ چکے تھے، علاوہ ازیں تنظیم کی بہبودی کے حوالے سے بھی ممکنہ حد تک کام سر انجام دیا کریں گے، جس کی بھی بے حد ضرورت ہے۔

تنظیم کی طرف سے سعودی عرب کا دوسرا دورہ

اس مذکورہ اجلاس کے کئی دن بعد مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی طرف سے حجاز مقدس پہنچے، عمرہ اور زیارت مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فراغت کے بعد بطور خاص مکہ مکرمہ میں انہوں نے چند اجلاس کئے، جن میں مولانا حسین احمد صاحب کے دیرینہ احباب اور تنظیم کے معاونین کے علاوہ روہنگیا برادری کے بہت سارے دل جلے لوگوں نے شرکت کی تھی، ان اجلاس میں آپ نے روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی تجدید و احیاء کے علاوہ قوم کے درپیش حالات پر کھل کر گفتگو کی، یوں ہماری برادری میں ان دونوں عالموں کی کافی پذیرائی ہوئی تھی۔

اس کے بعد مولانا حسین احمد صاحب اور آپ کے رفیق سفر مولانا سیف اللہ صاحب نے سعودی عرب کی بعض بڑی اور قدآور دینی اور فکری شخصیات سے ملاقاتیں کیں، اور بعض متعلقہ انجمنوں کے ارباب بست وکشاد سے ارکان اور روہنگیا مسلمانوں کے حوالے سے تبادلۂ خیال کیا، جن میں رابطۃ العالم الاسلامی کے سکریٹری جنرل سے ملاقات ناقابل فراموش ہے۔

لیکن نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اس دورے کے دوران بھی مخالفین نے مولانا اور آپ کے ساتھی مولانا سیف اللہ صاحب سے کھل کر مخالفت کی، لیکن مولانا بھی چھوڑنے والے کب تھے؟ کہ آپ اور آپ کے حامیوں نے ان مخالفین کا ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ دنگل سے اکثر بھاگ تو گئے اور جو بچے تھے انہوں نے آپ کے سامنے حاضر ہوکر توبہ کر لی، اس سلسلے میں یہ بھی ایک قابل ذکر بات ہے کہ مخالین کی اس شدید مخالفت کے دوران آپ نے جس دلیری اور بہادری کا ثبوت دیا تھا وہ بھی ایک یاد رکھی جانے والی بات ہے۔

ایک اور دل دوز حادثہ

مولانا حسین احمد صاحب ادھر سرزمین مقدس میں پہنچ کر قومی اور تنظیمی سرگرمیوں میں جان کھپا رہے تھے، اور اس کوشش میں تھے کہ کسی بھی طریقے سے روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کو ہر

ایک اعتبار سے مستحکم کیا جائے، اور اس کے سائے تلے قوم کو متحد کر کے قومی مشکلات کے پائدار حل کی کوشش کی جائے۔

مگر افسوس کا مقام ہے کہ مولانا کا سرزمین مقدس پہنچے ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی شاید ہو پایا ہو کہ ادھر چاٹگام میں آپ کی رہائش گاہ میں گھس کر چند غنڈوں اور ڈکیتوں نے غنڈہ گردی کے ساتھ ڈکیتی کی کوشش کی تھی، جس کی وجہ سے نہ صرف آپ اور آپ کے احباب ورفقائے کار کے دلوں پر شدید دھچکا لگا تھا، بلکہ اس انوکھے حادثہ کی وجہ سے اس وقت کے ہمارے سیاسی اور انقلابی حلقوں میں بھی بڑی حد تک ہلچل مچ گئی تھی۔

ان شر پسند عناصر، غنڈوں یا ڈکیتوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی، صرف تین تھی، جن کا سرغنہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کوئی اور نہیں تھا بلکہ مولانا محترم کا ایک عزیز، چہیتا اور روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کا ایک رکن تھا، جس کو کہیں سے یہ وسوسہ پیدا ہو چکا تھا کہ مولانا محترم معاذ اللہ ایک خائن انسان ہیں، جو قومی امور کے حوالے سے چندہ حاصل کر کر کے پیٹ کی پوجا کے ساتھ رنگ رلیاں بھی کر تے ہیں، علاوہ ازیں شیطان کے بہکاوے میں آکر آپ کے اس چہیتے کو یہ شبہ بھی پیدا ہو چکا تھا کہ آپ قوم کے نام چندہ اصول کر کے خود کھاتے، پیتے اور رنگ رلیاں تو کرتے ہیں، لیکن آپ کو اپنے تنظیمی ساتھیوں اور کارکنوں کی تھوڑی بھی فکر نہیں ہوتی ہے۔

بہر حال تاریخ اور مہینہ مجھے ابھی یاد نہیں ہے، البتہ ۱۹۹۲ء کا واقعہ تھا کہ ان سر پھرے غنڈوں نے تقریباً صبح آٹھ نو بجے مولانا کی رہائش گاہ (جو اسی زمانے میں چاند گاؤں، چاٹگام کے رہائشی علاقہ بی بلاک میں واقع تھا) میں گھس کر ڈاکہ زنی کی ناکام اور نامراد کوششیں کی تھیں۔

پچھلی سطور میں جس طرح عرض کی گئی ہے کہ ان غنڈوں کا رہبر اور سرخیل کوئی اور نہیں تھا بلکہ وہ مولانا حسین احمد صاحب کا ایک چہیتا تھا، جس کا آئے دن آپ کی رہائش گاہ میں آنا جانا رہتا تھا، یوں اس کی رہنمائی میں ان غنڈوں کو آپ کی رہائش گاہ میں گھسنے میں آسانی ہوئی تھی۔

بہر حال یہ غنڈے ابھی ڈکیتی کی کوشش کر رہے تھے کہ ادھر اللہ تعالی کے فضل وکرم اور خاص رحمت سے اس گھر کے مالک کو یہ علم ہو چکا تھا کہ اس کے گھر کے ایک رہائشی پر ڈاکہ زنی کی کوشش ہو رہی

ہے، ویسے اس گھر کے مالک نے چاندگاؤں تھانہ کی پولیس کوفون کر دیا تو اللہ تعالی کی رحمت سے پولیس بھی بروقت آ پہنچی تھی۔

ابھی پولیس جائے واردات پر پہنچی تو ان غنڈوں نے بھاگنے کی کوششیں کیں، مگر تینوں کے تینوں پکڑے گئے تھے اور تھانے میں ان کے خلاف کچھ ضروری کاروائیوں کے بعد ان تینوں کو چاٹگام ہائی کورٹ کا حوالہ کر دیا گیا تھا۔

لیکن یہاں نہایت تعجب کا مقام ہے کہ ابھی یہ غنڈے جائے واردات پر رنگے ہاتھوں پکڑے جا چکے تھے، اور پولیس نے ضروری کاروائیوں کے بعد کورٹ کا حوالہ بھی کر دیا تھا، لیکن ابھی شام ڈھلے دیکھتے ہیں کہ یہ تینوں غنڈے کہیں اور نہیں بلکہ چاٹگام کے اس رہائشی علاقہ چاندگاؤں میں اطمینان سے گھوم رہے ہیں، یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہاء ہوگئی تھی۔

بہر حال مولانا محترم کو اس حادثہ کی اطلاع ملی تو آپ کے نازک دل پر کیا کچھ گذرا ہوگا؟ یہ تو ظاہر ہے، آپ سفر کو گئے تھے اپنی مظلوم قوم کی نجات کے لئے، وہاں ہر کجا ہاتھ پیر مار رہے تھے اپنی قوم کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے، لیکن طرفہ تماشا دیکھئے کہ خود آپ کی رہائش گاہ پر اپنے ایک چہیتے کی سرکردگی میں یہاں ڈاکہ زنی کی کوشش کی جارہی تھی۔

اس واقعہ کی اطلاع پاتے ہی مولانا نے اپنے رفیق سفر مولانا سیف اللہ صاحب کو حجاز میں چھوڑ کر واپسی کی راہ لی، اور اس واقعہ کے صرف اور صرف تین دن کے بعد آپ چاٹگام آپہنچے تھے، یہاں چاٹگام پہنچتے ہی آپ نے اپنے انداز میں اس حاثہ کی تحقیق کی، لیکن کیا فائدہ، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا، ابھی صبر کے سواء کیا کچھ کرنا باقی ہے؟ اگر چہ مصیبت بڑی تھی لیکن مولانا نے اس موقع پر بھی صبر وثبات کے ہتھیار تھامے اپنے آپ کو سرخرو کر دکھایا تھا۔

دارالمعارف کی دوبارہ مدرسی

اب کی بار روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی سرگرمیاں تقریبا رک جانے بعد مولانا حسین احمد صاحب ارکان کی سیاسی و انقلابی خدمات کے حوالے سے ایک برمحل پلٹ فارم کے متلاشی

تھے، ایسے حالات میں شاید آپ کو فارغ سمجھ کر روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) جو اسی زمانے میں نہایت عروج پر تھی کے لیڈروں نے دوبارہ کوششیں شروع کر دی تھیں کہ کسی بھی حیلے بہانے کے ذریعے آپ کو اس مؤخرالذکر تنظیم میں شامل کرلیا جائے، لیکن مولانا اپنے اصول پر بالکل اٹل ہی تھے اور اس بات پر ڈٹے ہوئے تھے کہ کسی بھی حالت میں جماعتِ اسلامی کی دعوت کو ارکان میں گھسنے اور پاؤں جمانے سے روکا جائے۔

ظاہر ہے کہ مولانا اس زمانے میں کافی ذہنی الجھن کے شکار تھے، لیکن خدمات کے حوالے سے میدان تو ایک نہیں، بلکہ لائق اور پتے کے لوگوں کے لئے سامنے بہت سارے میدان کھلے ہوتے ہیں، ویسے آپ کے لئے ابھی ایک انتخاب کا سوال تھا بس۔

مولانا کے ایسے حالات میں دارالمعارف الاسلامیہ چاٹگام والوں نے آپ کو دوبارہ مدرسی کے لئے دعوت دی تو آپ نے اس دعوت کو لبیک کہنا مناسب سمجھا، یوں وہاں کی مدرسی قبول کرلی تھی۔

لیکن ظاہر ہے کہ آپ کو سیاست وقیادت کا چسکا لگ چکا تھا، اب کی بار مدرسی کا مشغلہ تو تھا ہی، لیکن آپ کی نظر سرزمین ارکان کی سیاست اور سیاست وقیادت کے نام پر کام کرنے والوں پر جمی ہوئی تھی۔ بہر حال ایسے حالات میں آپ نے مدرسی کے ساتھ ہی ساتھ کچھ نجی تجارت بھی شروع کر رکھی، جس میں اگر چہ خاص کامیابی نہیں ملی، لیکن تجارت کی طرف بھی آپ کا رجحان ہوگیا تھا، یاد رہے کہ تجارت کے حوالے سے آپ کی بعض کوششوں کی تفصیلات اگلی سطور میں انشاء اللہ تعالی آئیں گی۔

اب کی بار دارالمعارف کی مدرسی بھی آپ کو راس نہیں آئی، جس کے دیگر اسباب و وجوہات سے قطع نظر اس کا ایک سبب میرے ناقص خیال میں یہ بھی تھا کہ اب مولانا خالص ایک مدرسہ کے مدرس نہیں ہو سکتے تھے، ایک طرف آپ کے سامنے سرزمین ارکان کے حالات ایک خاص انداز میں انگڑائیاں لے رہے تھے تو دوسری طرف آپ کو اپنی قومی وملی ذمے داریاں ستا رہی تھیں، اور آپ کے صبر کو دستک دے رہی تھیں کہ حسین احمد! کیا تجھے تیری قوم اور تیری ملت اس بات کی اجازت دے رہی ہے کہ تم بس ایک مدرسہ کی مدرسی پر مکتفی ہو جاؤ؟ اور ایک عام مدرسہ کے مدرسوں کی طرح ایک بے خبری کے عالم میں اپنی مظلوم قوم وملت پر گزرے ہوئے حالات وواقعات کو سرے سے بھول جاؤ؟؟

بہرصورت اب مولانا دارالمعارف الاسلامیہ کے مدرس بن چکے تھے، جس میں میرے ذاتی خیال میں قومی نہیں بھی تو آپ کی ذات کے حوالے سے کچھ فائدہ ضرور ہوا تھا، اب کی بار یہاں کے مدرسی کے دوران چند ذہین وفطین تلامذہ آپ کے گرد جمع ہو گئے، جن سے آپ اپنے خوابیدہ آرزو کو شرمندۂ تعبیر کرنے میں مدد لے سکتے تھے۔

دراصل بات یہی ہے کہ مولانا اب بھی اپنے یہ اوراس سے پہلے کے چند تلامذہ پر ایک بڑے کام کے حوالے سے پر امید ہیں، لیکن مشکل یہی ہے کہ ایک طرف آپ کے سارے تلامذہ سرزمین بنگال اور ارکان کے علاوہ دنیا کے دیگر گوشوں میں منتشر اور بکھرے ہوئے ہیں، تو ایک بڑے اور انقلابی کام کے لئے ان کو ایک جگہ پر جمع کرنا اور کرسکنا آسان کام نہیں ہے، علاوہ ازیں خود مولانا بھی آج کل ایک طویل مسافرت کی زندگی گزار رہے ہیں، یوں اتنے بڑے کام کے حوالے سے کہا جائے تو آپ کی عمر اور عمر کے ساتھ صحت کا حال بھی کچھ اچھا نظر نہیں آتا، لیکن پھر بھی آپ کے ایسے حالات میں آپ کا حوصلہ بہت بلند نظر آتا ہے، جس پر آپ کو جتنی بھی داد دی جائیں تو بھی کم ہیں، اللہ تعالی آپ کی اس بلند حوصلگی کو مزید توانا کر دیں، اور صحت کے ساتھ عمر میں بھی برکتیں عطا کریں، آمین۔

یہاں دارالمعارف الاسلامیہ کی تاسیس کے حوالے سے ایک بات بہت اہم ہے کہ ظاہر ہے کہ اس ادارہ کا بانی حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی ہیں، لیکن جن دو ایک حضرات نے اس کی تاسیس کے لئے حضرت ذوقؔ کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی اور شروع شروع میں فکری وعملی اعتبار سے ساتھ بھی دیا تھا، ان میں سے ایک مولانا حسین احمد صاحب بھی ہیں، لیکن حضرت مولانا ذوق ندوی سمیت وہاں کے چند دیگروں کو اس بات سے کلیتا انکار ہے، ان میں سے کچھ کا یہاں تک کہنا ہے کہ ان کو تو چندہ فراہمی کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

مولانا حسین احمد صاحب کی اس بار کی مدرسی کے دوران حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب سے کچھ ناچاقیاں بھی ہو گئیں، اس سلسلے میں استاد اور شاگرد کے درمیان تلخ کلامیوں پر مشتمل دوطرفہ مراسلہ کا دور دورہ بھی شروع ہو چکا تھا، اور تو اور حضرت ذوق نے اپنے شاگرد مولانا حسین احمد صاحب کے متعلق دل برداشتہ ہو کر ایسے ایسے جملے کسے تھے، جنہیں دہرانا ناچیز کے لئے مناسب

ہے اور نہ جائز، تاہم ان میں سے ایک جملہ ہی ناظرین کرام کے لئے کافی ہے کہ جسے خود مولانا حسین احمد صاحب نے بیان کیا ہے کہ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر حضرت ذوقؔ نے میرے بارے میں اپنے ایک مراسلہ میں یوں لکھا ہے کہ: ”اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ تم اتنے بڑے کم زاد ہو تو تم کو مدرسے میں استاد بنانا تو کجا میں اپنا شاگرد تک نہیں بناتا“۔

دراصل ہمارے اس دیار کے علمائے کرام کا عجیب حال ہے، بسا اوقات مدارس میں بار ہا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ مدارس کے ماحول میں استاد اور شاگرد دونوں معلم ہوں تو جبھی شاگرد تلامذہ کے مابین نمایاں ہو جائے تو خود استاد کی آنکھیاں بھی چندیا جاتی ہیں، تو دارالمعارف بھی تو آخر اس علاقے کا ایک مدرسہ ہی ہے، اس حوالے سے یہاں بھی ایک واقعہ ہوا، جسے مجھے ایک صاحب نے بڑے پرلطف انداز میں بیان کیا ہے کہ:

> ”دارالمعارف الاسلامیہ میں ایک روز النادی الثقافی کا جلسہ منعقد ہوا، جس میں حضرت ذوقؔ ندوی اور مولانا حسین احمد صاحب پینل میں حاضر تھے، جلسہ کا ناظم مولوی جشیم الدین ندوی (مرحوم) تھا، حضرت ذوقؔ کی حاضری میں جناب ناظم جلسہ نے مولانا حسین احمد صاحب کو خطاب کے لئے ان الفاظ میں دعوت دی کہ ”اب ہمارے سامنے ایک عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے“ یہ سنا تو حضرت ذوق اس جلسہ سے اٹھ چلے گئے تھے، ویسے حضرت کے یوں ہی چلے جانے پر حاضرین مجلس میں سے بعض لوگوں نے یہی تأثر لیا کہ حضرت کو یہ برداشت نہیں ہوئی تھی کہ مولانا حسین احمد جو خود حضرت ذوق کے شاگرد ہیں، یہ بھی کوئی عاشقِ رسول ہو سکتے ہیں، واللہ اعلم حقیقۃ الحال“۔

تاہم یہ ایک حقیقت پر مبنی بات ہے کہ حضرت ذوق ندوی اپنے قابل ومستعد شاگرد پر کبھی کبھار برملا اظہار فخر بھی کیا کرتے تھے، اس حوالے سے مجھے ایک بات ایک صاحب نے بتایا کہ ایک روز النادی الثقافی میں حضرت ذوق بحیثیت صدر اجلاس حاضر تھے، خطابات انگریزی میں ہو رہے تھے، آخر میں مولوی جشیم الدین ندوی صاحب (جو ناظم جلسہ تھا) نے مولانا حسین احمد صاحب کو دعوت

خطاب دی تو آپ اسٹیج پر آئے اور چند منٹ انگریزی میں خطاب کیا، اب جلسہ کے اختتام پر حضرت ذوق اپنے کمرے چلے گئے، اور اپنے بعض تلامذہ سے فرمایا کہ دیکھو! ماشاء اللہ حسین احمد نے انگریزی میں کیسا ہی خطاب کیا ہے؟

حضرت مولانا حسین احمد صاحب بھی اپنے فائق الاقران استاد پر بڑے نازاں تھے اور اب بھی ہیں، اس حوالے سے ایک واقعہ یاد آیا کہ غالباً ۱۹۸۵ء کی بات تھی کہ میں نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی معیت میں حضرت ذوق سے چاٹگام میں پہلی بار ملاقات کی، اس ملاقات کے بعد واپسی پر مولانا حسین احمد صاحب نے مجھ سے اس ملاقات کا تأثر پوچھا تو میں نے اپنے انداز میں اپنا تأثر بتا دیا، اس کے بعد مولانا نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: حضرت ذوقؔ ندوی کے چہرۂ زیبا پر میں کیا بتاؤں کہ ’’کانہ طلعت الشمش علی وجھه‘‘۔

مولانا حسین احمد صاحب حضرت مولانا محمد سلطان ذوق ندوی کو اپنے زمانے کے ایک برکۃ العصر انسان سمجھتے تھے، اس حوالے سے ایک واقعہ بھی یاد آیا کہ مولانا حسین احمد صاحب ابھی روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی مجلس عاملہ کے رکن تھے تو کسی ایک فاعل خیر نے آپ کو تنظیم کے لئے دس ہزار ڈالر کا ایک چیک دیا تو آپ نے اس چیک سمیت حضرت ذوق کے سامنے حاضری دی، اور یہ چیک حضرت ذوق کے ہاتھ پر دیتے ہوئے کہا کہ:

> ’’حضرت! یہ چیک مجھے میری تنظیم کے لئے ایک فاعل خیر کی جانب سے ملا ہے، میں اسے لے کر آپ کے سامنے اسی لئے آیا ہوں کہ آپ میرے ساتھ میری تنظیم کے حق میں دعائیں دیں، تاکہ میں اپنی مظلوم قوم کے لئے اس تنظیم کے زیر سائے مزید کام کرسکوں، ایسا کام جو میری قوم اور ملت کا شایان شان ہو‘‘۔

مولانا کے چند وفا شناس تلامذہ

حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی تدریسی زندگی بڑی طویل تو نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس قصیر المدتی دوران مدرسی میں آپ کے بہت سارے تلامذہ پائے جاتے ہیں، جن میں سے چند حضرات

کے نام اور ان کی کچھ ضروری معلومات یہاں فراہم کی جارہی ہیں:

۱۔ <u>مولوی حمید اللہ کوکس بازاری</u>:

مولوی حمید اللہ صاحب کوکس بازاری نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے رنگیا خالی کے مدرسہ (اسلامی سنٹر) میں استفادہ کیا تھا، مولوی صاحب کے متعلق جہاں تک سنا اور اس کے حوالے سے اندازہ ہوا کہ وہ بڑے ذہین وفطین طالب علم تھا، اس کے حوالے سے خود اس کے استاد کا بیان ہے کہ مولوی حمید اللہ ماشاء اللہ بڑے وفا شناس آدمی ہے، ہر حال میں میری یاد رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حیات دراز کرے آمین۔

۲۔ <u>مولوی محمد حسن بوسیدنگی صاحب</u>:

صدیق مکرم مولوی محمد حسن بن حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب کی پیدائش محلہ ریلوے بوسیدنگ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے لائق والد سے پاکر مدرسہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، یہ اس وقت کی بات تھی کہ جب اس کے والد گرامی اسی ادارہ میں ناظم برائے امور تعلیمات تھے، تو ابھی اس نے دو ایک جماعت کی تعلیم پائی کہ اس کے والد نے مع اہل خانہ بنگلا دیش کی طرف ہجرت کی، اور ٹیکناف میں سکونت اختیار کرتے ہوئے جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں مدرس مقرر ہوئے تھے۔

مولوی محمد حسن نے جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کے علاوہ جامعہ دار السنہ نہلا میں متوسطہ تک کی تعلیم پائی، اس نے ہمارے ممدوح مولانا حسین احمد صاحب سے جامعہ نہلا میں استفادہ کیا، تاہم یہ ایک الگ بات ہے کہ مولوی حسن نے حضرت مولانا سے بعد میں بھی کافی استفادہ کیا تھا، مخصوص طور پر اس زمانے میں زیادہ استفادہ کیا جب مولانا محترم ۲۰۰۳ء کے بعد سعودی عرب کے ہو چکے ہیں۔

مولوی محمد حسن بڑے زیرک عالم ہے، ذہین تو ہے ہی، ساتھ ہی ساتھ اخذ کے مادے بھی کافی حد تک ہیں، مولوی صاحب نے اپنے استاد کا خوب خوب ساتھ نبھایا، سعودی عرب میں مولانا کے قیام کے دوران آپ کی تحریکی اور دعوتی سرگرمیوں میں مولوی حسن پیش پیش تھا، اس نے ہر موقع پر اپنے استاد کی خدمت کی، اور خیر خواہی کے ساتھ پیش آتا رہا تھا۔

مولوی حسن صاحب سعودی عرب میں عرصۂ دراز تک روہنگیا برادری کے حوالے سے بننے والی

انجمن ''لجنۃ برما ویۃ'' کا رکن رہا، اس حوالے سے بھی اس کی بڑی سی بڑی خدمات تھیں، تاہم یہ الگ بات ہے کہ بعض حضرات اس پر طرح طرح کے الزامات تھوپتے نہیں تھکتے ہیں۔

مولوی محمد حسن راقم کے بھی بڑا خیر خواہ دوست ہے اور بڑا دیرینہ ساتھی بھی، جدہ میں بڑی طویل مدت تک راقم کے ساتھ رہتا تھا، ہم دونوں قومی خدمات کے حوالے سے ایک ہی ساتھ کام بھی کرتے تھے، ماشاءاللہ کافی صاحب بصیرت اور صائب رائے انسان ہے۔

۲۰۱۷ء کے بعد مولوی حسن سعودی عرب سے بنگلا دیش چلا آیا، یہاں آکر اس نے ایک دوسری شادی بھی کر لی، کوکس بازار کے علاقے میں رہائش پذیر ہے، شنید ہے کہ آج کل سابرانگ، ٹیکناف کے مدرسہ میں مدرسی کی خدمت کر رہا ہے، ماشاءاللہ عالم ہونے کے ساتھ ادیب اور شاعر بھی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کی حیات دراز کریں، آمین۔

۳۔ مولوی محمد شعیب نکھوروی:

مولوی محمد شعیب کی پیدائش شمالی منگڈو کے معروف قصبہ نکھورہ میں ہوئی، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم اپنی آبائی بستی نکھورہ میں پائی، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ نہلا میں مولانا حسین احمد صاحب سے خوب خوب استفادہ کیا، جامعہ اسلامیہ پٹیہ سے فراغت حاصل کی، مولوی صاحب آج کل جدہ میں مع اہل خانہ مقیم ہیں، اپنے استاد حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے بڑے خیر خواہ ہیں، اللہ تعالی اس کی عمر اور صحت میں برکت دیں، آمین۔

۴۔ مولوی شعیب الدین بانسکھالوی:

مولوی شعیب الدین بانسکھالوی کی پیدائش جنوبی چاٹگام کے معروف علاقہ بانسکھالی میں ہوئی، اس نے مولانا حسین احمد صاحب سے جامعہ دار لمعارف الاسلامیہ میں استفادہ کیا، مولوی صاحب نے بعد میں جامعہ ام القری میں تعلیم حاصل کی اور اس دوران بھی حضرت مولانا سے استفادہ کرتا رہا تھا، جس کا سلسلہ تادم تحریر بدستور جاری ہے۔

مولوی صاحب نہایت ذہین وفطین طالب علم ہے، اور بڑے ہشیار اور زیرک عالم بھی، اس نے اور تو اور اپنے استاد کی خدمت کرنے میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی، استاد کو بھی اس پر بڑا فخر و ناز ہے،

مولوی صاحب آج کل جامعہ اسلامیہ عالمیہ چاٹگام کے لکچرر ہے اور وہاں کی جامع مسجد کے خطیب بھی، دعا ہے کہ اللہ تعالی مولوی صاحب کی حیات دراز کرے، آمین۔

۵۔ مولوی حسین احمد صاحب ڈھاکوی:

مولانا حسین احمد صاحب ایک بہت بڑا عالم دین ہیں، ڈھاکہ کے کسی علاقہ میں شنید ہے کہ کسی ایک بڑے مدرسہ کے محدث اور مفسر قرآن کریم ہیں، ان کے استاد حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے مطابق اپنے استاد کے بڑے خیر خواہ انسان ہیں، انہوں نے مولانا محترم سے جامعہ دارالمعارف الاسلامیہ میں استفادہ کیا، شاید آپ سے ابوداؤد شریف پڑھی تھی۔

مولانا محترم اپنے لائق شاگرد کے بڑے مداح ہیں اور فرماتے ہیں کہ میرے تلامذہ میں مولوی حسین احمد ڈھاکوی بڑے وفا شناس عالم دین ہیں، علاوہ ازیں وہ ہر حال میں اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں دعا چاہتے ہیں، اس ضمن میں ایک بات یاد آگئی ہے کہ مولانا محترم نے ایک روز مجھ سے فرمایا کہ میرا شاگرد مولوی حسین احمد صاحب ہر حال میں مجھ سے دعا چاہتے رہتے ہیں، لیکن ایک تم (راقم) ہی ہو کہ اس کی ضرورت تک محسوس نہیں کرتے؟ اس کے جواب میں میں نے بولا کہ بن مانگے ملنے والی چیز کیوں مانگی جائے؟ میں جانتا ہوں کہ آپ ہر حال میں اپنی دعاؤں میں مجھے یاد فرماتے ہیں، جس کا آپ نے بارہا تذکرہ بھی فرمایا ہے، اس لئے آپ سے دعاؤں کی درخواست نہیں کی جاتی ہے، میرے اس جواب پر آپ ہنس پڑے اور بہت ساری دعائیں بھی دیں۔

۶۔ مولوی محمد شاکر بانسکھالوی:

مولانا حسین احمد صاحب کے ایک خاص شاگرد مولوی محمد شاکر کی پیدائش بانسکھالی، جنوبی چاٹگام میں ہوئی، وہ ۱۹۸۶ء کے دوران جامعہ احمدیہ سنیہ مراد پور میں پڑھتا تھا، نہ جانے کس ذریعے سے کہ اس کے ساتھ مولانا محترم کا تعارف ہوا، بعد میں وہ آپ کے اتنے قریب ہو گیا کہ لگتا تھا کہ وہ آپ کا کوئی شاگرد نہیں بلکہ ایک چھوٹا اور عزیز ترین بھائی ہے، بڑے وفادار اور وفا شناس انسان ہے، اس نے مولانا سے کسی مدرسہ میں باضابطہ طور پر تو پڑھا نہیں تھا لیکن آپ کی رہائش گاہ میں جتنا کچھ پڑھا بہت ہی خوب پڑھا تھا، مولوی صاحب کے قریبی دوستوں میں ایک اور صاحب مولوی محمد زبیر

بھی ہے، دونوں اکثر ایک ہی ساتھ رہا کرتے تھے۔

۷۔ مولوی قاضی محمد زبیر بوال خالوی:

مولوی محمد زبیر بوال خالی چاٹگام میں پیدا ہوا، ۱۹۸۵ء اور اس کے بعد بھی جامعہ احمدیہ سنیہ مراد پور کا طالب علم تھا، مولوی محمد شاکر کے قریبی دوستوں میں سے تھا، اور اب بھی ہے، مولانا محترم سے اس کا تعارف ہوا تو اس نے آپ سے خوب خوب استفادہ کیا اور جب سے تعارف ہوا تب سے لے کر اب تک وفاشناسی کا پورا پورا ثبوت پیش کیا، مولوی زبیر آج کل بوال خالی چاٹگام کے علاقہ میں عہدۂ قضا پر فائز ہے، اس علاقے میں قاضی محمد زبیر صاحب کے نام سے معروف ہے، چند مہینے پہلے مجھے قاضی صاحب کی جانب سے دعوت زیارت ملی تو میں اس سے ملنے بوال خالی گیا، اس کے شاندار دفتر میں اس سے ملاقات ہوئی تھی، بڑے احترام واکرام سے پیش آیا، جہاں تک اندازہ ہوا کہ اس علاقے میں اس کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، ماشاء اللہ بڑے خلیق، شریف اور متواضع عالم ہے، اللہ تعالی حیات دراز کرے، آمین۔

۸۔ مولوی حافظ فیض احمد/فیض اللہ سابرانگی:

مولوی حافظ فیض احمد حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ایک ہے، اس کی پیدائش سابرانگ ٹیکناف میں ہوئی، مولانا محترم سے جامعہ اسلامیہ نہلا میں استفادہ کیا، مولانا حسین احمد صاحب کے مطابق بڑا ذہین وفطین طالب علم تھا، آج کل کراچی، پاکستان میں مقیم اور وہاں کے ایک مدرسہ کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہے، عرصۂ دراز تک اپنے استاد سے کسی قسم کا رابطہ نہیں تھا، لیکن حال ہی کی بات ہے کہ اس نے آپ سے رابطہ کیا، آئے دن استاد شاگرد کے مابین طول طویل گفتگو ہوتی رہتی ہے، اس نے اپنے استاد کو یہ عندیہ بھی دے چکا ہے کہ وہ اب کی بار مولانا کے میشن کا ساتھ دے گا، اور مولانا کو بھی اس پر کافی مطمئن نظر آرہا ہے، اللہ تعالی مولوی صاحب کو توفیق سے نوازے۔

۹۔ مولوی خورشید عالم منگڈوی:

مولوی خورشید عالم منگڈوی بھی مولانا حسین احمد صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے ایک ہے، اس نے آپ سے جامعہ اسلامیہ نہلا میں استفادہ کیا، مولوی صاحب بعد میں کراچی، پاکستان پہنچا، آج کل

وہاں کے ایک مدرسہ میں اعلی درجہ کے مدرس ہے، مولانا محترم کے بیان کے مطابق وہ طالب علمی کے زمانے میں کافی ذہین وفطین تھا، استاد شاگرد کے درمیان عرصۂ دراز تک کسی قسم کا رابطہ نہیں تھا، لیکن حال ہی میں اس سے رابطہ ہوگیا، اپنے استاد کے مشن کا ساتھ دینے کا عندیہ دے چکا ہے، اللہ تعالی مولوی صاحب کو توفیق عطا کرے، آمین۔

۱۰۔ مولوی صادق حسین ساتکانوی:

مولوی صادق حسین ساتکانوی نے مولانا حسین احمد صاحب سے جامعہ اسلامیہ دار المعارف میں خوب خوب استفادہ کیا، مولانا کے بیان کے مطابق مولوی صاحب جید طالب علم اور اب عالم دین ہے، ساتکانیہ کے ایک مدرسہ میں حدیث کا مدرس ہے، شنید ہے کہ ابوداؤد شریف پڑھاتا ہے، آپ اپنے شاگرد کو ''میرے صادق حسین'' کے لفظ سے یاد کرتے ہیں، یہ لفظ بذات خود اس بات کا غماز ہے کہ مولوی صاحب ایک جید عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے استاد کا بڑا وفادار بھی ہے، مولانا محترم خاصے پرامید ہیں کہ اگلے ممکنہ کام کے حوالے سے مولوی صاحب آپ کا بھرپور ساتھ دے گا، اللہ تعالی مولوی صاحب کی حیات دراز کرے، اور کام کی توفیق عنایت فرمائے۔

۱۱۔ مولوی انعام الحق ساتکانوی:

مولوی انعام الحق صاحب نے مولانا محترم سے دار المعارف الاسلامیہ میں استفادہ کیا، آپ کے بیان کے مطابق جید اور کافی حساس طالب علم تھا، آج کل ایک مدرسہ کا مدرس ہے، مولانا اپنے لائق شاگرد پر بہت کچھ امید رکھتے ہیں، خدا کرے کہ آپ کی امید بھر آئے، آمین۔

۱۲۔ مولوی عبید الحق کیا کتوی:

مولوی عبید الحق صاحب کیا کتو ارکان میں پیدا ہوئے، انہوں نے مولانا محترم سے دار السنہ نہلا میں استفادہ کیا، آپ کے بیان کے مطابق کافی جید طالب علم اور اب عالم دین ہیں، نہلا کے دوران تعلیم مولوی صاحب اپنے استاد کے بہت ہی قریب رہتے تھے، اور اس کے بعد والے زمانے میں بھی اپنے استاد کے بڑے خیرخواہ نظر آئے، فراغت کے بعد وطن واپس گئے، حال کی بات ہے کہ وہ اپنے علاقے کے ایک دینی مدرسہ کی اعلی درجات کا مدرس ہیں، کچھ سال پہلے کی

بات ہے کہ مولوی صاحب کے لئے ان کے استاد نے حرمین کی زیارت کے لئے ویزہ اور ٹکٹ بھیجنا چاہا تھا، لیکن بعض وجوہات کی وجہ سے یہ کام اگرچہ نہیں ہوسکا مگر اس کوشش سے یہ بات عیاں طور پر نظر آتی ہے کہ آپ کا یہ لائق شاگرد آپ کے کتنے قریب اور چہیتا ہے، اللہ تعالی ان کی حیات دراز فرمائے۔

۱۳۔ مولوی شفیع الاعظم ہاٹہزاروی:

مولوی شفیع الاعظم ہاٹہزاروی نے مولانا محترم سے دارالمعارف میں استفادہ کیا، مولانا کے مطابق جید طالب علم تھا، اور شاید مستعد مطلوب علم بھی، نہ جانے آج کل مولوی صاحب کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟

۱۴۔ مولانا امیر حسین ٹیکنافی:

مولانا امیر حسین صاحب کی پیدائش ٹیکناف میں ہوئی، انہوں نے مولانا محترم سے دارالسنہ نہلا میں پڑھا، فراغت کے بعد شاید چاٹگام یونیورسیٹی سے ڈگری حاصل کی، آج کل مہیش خالی کے کسی سرکاری مدرسہ کے پرنسپل ہیں، مولانا کے مطابق بڑے ذہین اور نہایت حساس طالب علم تھے، اور مستعد و باصلاحیت عالم دین بھی۔

۱۵۔ مولوی اختر حسین اوکیاوی:

مولوی اختر حسین صاحب اوکیاوی نے مولانا محترم سے دارالسنہ نہلا میں استفادہ کیا، آپ کے بیان کے مطابق بڑے جید طالب علم تھا، ان کے بعد کے حالات معلوم نہیں ہوسکے، خدا معلوم کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں؟۔

۱۶۔ مولوی ممتاز الدین ناکون خالوی:

مولوی ممتاز الدین ناکون خالوی (ٹیکناف) نے مولانا محترم سے شاید دارالسنہ نہلا میں استفادہ کیا، بڑے شریف اور کافی جید طالب علم تھا، اس کے بعد کے حالات معلوم نہیں ہوسکے۔ خدا معلوم کہاں اور کس حالت میں ہے؟۔

۱۷۔ مولوی نور احمد ٹیکنافی:

مولوی نور احمد صاحب ٹیکنافی نے حضرت مولانا محترم سے جامعہ اسلامیہ دارالسنہ نہلا میں استفادہ کیا، کہتے ہیں کہ وہ بہت ذہین طالب علم تھا، اور اب مستعد مطلوب علم بھی، آج کل سابرانگ ٹیکناف والے مدرسہ کے مدرس ہیں، اللہ تعالی عمر اور صحت میں برکت عطا کرے، آمین۔

۱۸۔ پروفیسر مولانا امیر حسین نہلوی:

پروفیسر مولانا امیر حسین صاحب نے مولانا محترم سے رنگیا خالی والے سرکاری مدرسہ (اسلامی سنٹر) میں خوب خوب استفادہ کیا، آپ ایک جید طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے حساس اور فعال عالم دین بھی ہیں، علم دین کے حصول کے ساتھ ساتھ عصری علوم میں بھی کافی درک رکھتے ہیں، مولانا کے بیان کے مطابق پروفیسر صاحب آج کل چاٹگام کی کسی ایک یونیورسیٹی میں لکچرر ہیں، شاید پروفیسر بھی ہوں، استاد کو اپنے لائق شاگرد پر بڑے نازاں نظر آتا ہے، ماضی میں آپ سے کافی رابطے میں تھے، نہ جانے آج کل یہ رابطہ بحال بھی ہے کہ نہیں، اللہ تعالی ان کی عمر اور صحت میں برکت عطا کرے، آمین۔

۱۹۔ مولوی حافظ صالح احمد عاشقہ فاروی:

مولوی حافظ صالح احمد صاحب عاشقہ فاروی، منگڈوی نے مولانا محترم سے جامعہ اسلامیہ دارالسنہ میں استفادہ کیا، مولوی صاحب اپنے استاد کے بڑے چہیتے تھے، کہتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں بڑے ذہین وفطین تھے، نہ جانے آج کل کس حال میں ہیں؟۔

۲۰۔ مولوی عبدالرحیم رنگیاڈنگی مرحوم:

عزیزم مولوی عبدالرحیم صاحب رنگیاڈنگی، بوسیڈنگی مرحوم مولانا محترم کا حقیقی ماموں زاد بھائی ہے، دارالمعارف الاسلامیہ کے علاوہ مرحوم نے آپ سے مختلف مقامات میں خوب خوب استفادہ کیا، عرصۂ دراز تک ساتھ رہا، مولوی عبدالرحیم جسمانی اعتبار سے قد کا چھوٹا اور رنگ کا کالا تھا، جس کی وجہ سے مولانا محترم اس کے ساتھ شاید دل جوئی کے لئے ہو کہ مذاق کیا کرتے تھے، جید طالب علم تھا، اور نہایت بلند اخلاق کا مالک بھی، فراغت کے بعد وطن واپس گیا، مختلف مدارس میں پڑھاتا رہا تھا، ترقی کر کے ابوداؤد شریف تک کی تعلیم دی، اللہ تعالی کو کچھ اور منظور تھا کہ مولوی صاحب نے بھری جوانی کے عالم میں داعی اجل کو لبیک کہہ دیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تجارت کے حوالے سے مولانا کی جدوجہد:

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب کوئی تجارت پیشہ آدمی نہیں ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ہر انسان کو اپنی زندگی کے گزارے کے لئے ایک پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی بھی انسان کی کوشش میں کامیابی کا مدار وانحصار اللہ تعالی کی مرضی پر ہوتا ہے، انسان ہزار کوشش کرتا اور کرسکتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی کوشش میں ضرور کامیاب ہوجائے گا، تاہم کوشش ضرور کرنی ہوتی ہے، اور کوشش کے بغیر بھی انسان کامیاب کب ہوتا ہے۔

روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی تجدید واحیاء کے لئے مولانا نے بڑی کوشش کی تھی، لیکن آخر کار مختلف اسباب کی وجہ سے آپ کو اس حوالے سے ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا، اب آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ چند سالوں کے لئے میدان تجارت میں اتر کر کوشش کی جائے، تو ایسے حالات میں آپ نے ایک بیان میں کہا تھا کہ:

> ''میں نے اپنی قوم کی بہبودی اور نجات کے حوالے سے سیاسی اور انقلابی میدانوں میں اپنی بساط بھر کوشش کی، آخر زندگی کے گزارے کے لئے بھی ایک وسیلہ کی ضرورت ہوتی ہے، ویسے اب میں نے عزم کرلیا کہ اگلے کم سے کم پانچ سالوں کے لئے تجارتی میدان میں اتر کر کوشش کر کے دیکھوں گا، کامیابی تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے، انسان کی چاہت تو ہے لیکن کامرانی کا انحصار اللہ تعالی کی مرضی پر ہے۔ مدت ختم ہوتے ہی دوبارہ قومی امور کے حوالے سے میدان میں واپس آؤں گا، خدا کرے کہ میری دوبارہ واپسی میں کوئی بھی چیز حائل اور رکاوٹ نہ بن جائے، (مفہوم نہ کہ پورے الفاظ)

تجارت کے عزم کے ساتھ مولانا نے کتاب فروشی کے میدان کو چنا تھا، باہر سے کتابیں منگواتے اور چاٹگام سمیت بنگلا دیش کے مختلف مقامات جن میں مختلف علمی ادارے بھی تھے اور کتابوں کی مختلف دکانیں بھی تھیں میں بیچا کرتے تھے، لیکن میرا جہاں تک اندازہ ہے کہ آپ اس کتاب فروشی کے میدان میں اتنے کامیاب نہیں ہوسکے جتنی امیدیں آپ کو تھیں، علاوہ ازیں ظاہر ہے کہ آپ کے پاس ذاتی کوئی

دکان نہیں تھی اور نہ اس نوعیت کا کوئی ادارہ، اس لئے آپ کو خرید وفروخت کے حوالے سے کافی مشقتیں برداشت کرنی پڑی تھیں، ایسی مشقتیں جو آپ جیسے ایک نازک طبع انسان کی برداشت کی باہر تھیں۔

کتاب فروشی کے میدان میں متوقع امیدیں بھر نہ آئیں تو آپ نے ۲۰۰۲ء کے دوران سعودی عرب کی راہ لی، جہاں آپ کو چاہنے والے بہتوں تھے، اور میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنے ان چاہنے والوں پر کافی بھروسہ بھی تھا، اور آپ کو امید تھی کہ اپنے ان خیر خواہوں کے سہارے تجارت کے کسی اور میدان میں کامیابیاں ہوں گی۔

آپ نے اس بار مستقل طور پر مکہ مکرمہ میں قیام کیا، اور چند مہینے گزرتے نہ گزرتے آپ نے اپنے بعض خیر اندیشوں کے سہارے جوار حرم پاک میں دکان فروشی کی تجارت شروع کی، تاجروں سے دکانیں لیتے اور اپنی مرضی کی قیمت پر دوسروں کو بیچ دیتے تھے، ویسے پہلے پہلے اس تجارت میں آپ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تھی، لیکن بعد میں ماشاء اللہ امید سے کہیں بڑھ کر اس میں کامیابیوں سے آپ ہم کنار ہو چکے تھے۔

مگر افسوس ہے کہ مولانا کی اس تجارت میں بعض ان خیر خواہوں جن پر آپ کو کافی اعتماد اور بھروسہ تھا، ان کی بے ایمانیاں، بدعہدیاں اور بے زبانیاں آڑے آئیں، حتی کہ یہ چیزیں اتنی آگے بڑھیں کہ جن کی وجہ سے آپ کو اس تجارت سے نہ صرف ہاتھ دھونا پڑا بلکہ آپ کی زندگی کو وہ پریشانیاں لاحق ہوئیں جو کبھی بھی متوقع نہیں تھیں، اور ان بدعہدوں نے آپس میں مل کر آپ کو وہ تکلیفیں پہنچائیں جو کم سے کم آپ کو ان سے کبھی بھی امید نہیں تھیں۔

جہاں تک میرا خیال ہے کہ اس تجارت میں مولانا کی آئے دن کی ترقی نے آپ کو دے مارا، ان بدعہدوں کی آنکھیں آپ کی آئے دن کی کامیابی کو دیکھ کر چندیا گئیں، پر آپ کی چند مہینوں کی کوشش سے اتنی بڑی کامیابی ان کے خواب وخیال سے کہیں باہر تھی، اب ان کو حقد وحسد نے اتنا مجبور کردیا کہ وہ آپ کی جائز طور پر کمائی ہوئی دولت کو ڈاکہ زنی کی راہ سے ہڑپ کر جائیں، ظاہر ہے کہ آپ ایک حیثیت سے بڑے سیدھے سادھے اور عہد و پیمان کا پاس و لحاظ رکھنے والے انسان ہیں، یوں آپ کو کیا پتہ تھا کہ اپنوں کی شکل وصورت میں یہ سارے لوگ اتنی بدعہدیوں پر

اتر آئیں گے، اور آپ کی تجارت کے آگے روڑے اٹکاتے ہوئے ڈاکہ زنی کی راہ سے آپ کی جائز طور پر کمائی ہوئی دولت کو ہڑپ کر جائیں گے؟

ان بدعہدوں نے آپس میں مل کر مولانا کے خلاف نام نہاد مقدمہ دائر کر دیا، اور جعلی دستاویزات اور جھوٹے گواہوں کے سہارے آخر کار آپ کو پھانس ہی لیا، اور کم سے کم اگلے آٹھ نو سالوں کی مدت کے لئے جیل خانے کی اندھیاری میں غرق کر دیا گیا تھا۔

یہ بدعہد حیلے باز کتنے بڑے ظالم تھے وہ بھی تھوڑا ملاحظہ کیجئے کہ ادھر مولانا کو جیل خانے میں ڈال دینے کی کامیابیوں کے بعد ان کو اب بھی یقین تھا کہ آپ کسی بھی طریقے سے باہر آنے میں کامیاب ہو جائیں گے، اس لئے انہوں نے آپ کی گلو خلاصی کی راہ پر مختلف روڑے اٹکا دیئے، کہ ہماری اطلاعات کے مطابق سعودی عرب میں پائی جانے والی روہنگیا برادری کے چند ایسے نام نہاد علماء کی تصدیقات ان بدعہدوں نے حاصل کر لیں کہ جن میں یہ لکھا گیا کہ حسین احمد ابو الفضل نہ صرف تجارت کے حوالے سے دھوکے باز ہیں بلکہ دینیات وایمانیات کے اعتبار سے ایک فتنہ پرداز انسان بھی، ویسے اس قید و بند کے حالات سے گلو خلاصی میں آپ کو اتنے سال لگ گئے تھے۔

مولانا الحمدللہ تقریبا ۲۰۲۰ء میں اس قید و بند سے خلاص ہوئے، آپ کے پاس اپنے حقوق کی کھلی دستاویزات موجود ہیں، جیل سے خلاصی کے بعد میں نے آپ سے اس حوالے سے چند مرتبہ ٹیلیفونک گفتگو کی تھی، جن سے اندازہ ہوا کہ آپ کے پاس جو دستاویزات موجود ہیں ان کی بنیاد پر آپ کو اپنے حقوق کی بازیابی میں کامیابی مل سکتی ہے، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنے خاص فضل وکرم سے آپ کو کامیاب کریں، ظاہر ہے کہ آپ کی قیمتی زندگی کا ایک حصہ جو اس قید و بند کی حالت میں بیت گیا ہے وہ تو واپس آنے والا نہیں ہے، تاہم پھر بھی دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کی بھی تلافی کی کوئی راہ نکال دیں، آمین۔

حصول مال وزر اور تجارت کے حوالے سے یہاں ایک بات بتا دیتا ہوں کہ مولانا حسین احمد صاحب ہم جیسے عام انسانوں کی طرح حریص آدمی بھی نہیں ہیں، جہاں تک میں آپ کو جانتا ہوں کہ آپ کے دل کے کسی گوشے میں بھی پیسے کی بے جا محبت نہیں ہے، آپ کے دل خدمت دین وقوم کے جذبے سے ہمیشہ سرشار رہتا ہے، یہ آپ کی زندگی کا مقصد اور آپ کی جیون کا حاصل ہوتا ہے، پیسے جمع کرنا اور اس

جمع کرنے کو اپنا مقصد حیات قرار دینا آپ کا شیوہ ہرگز ہرگز نہیں ہے، میرے نزدیک یہی وہ چیز ہے جو آپ کو موجودہ دور کے ہم جیسے لوگوں کے علاوہ بعض علمائے کرام سے بھی ممتاز کرتی ہے۔

ویسے بھی میں جہاں تک جانتا ہوں کہ تجارت پر آپ کا اترنا کوئی مال جمع کرنے کی خاطر نہیں تھا، بلکہ ان مالوں کے ذریعے مظلوم روہنگیا کی خدمات کے علاوہ جس عظیم کام کے لئے وہ دنیا میں زندگی گزار رہے تھے اس کی تکمیل کی آسانی کے لئے تھا، لیکن افسوس ہے کہ ظالموں نے اس میں بھی آپ کو ناکام بنا دیا، دراصل بات یہی تھی کہ ظالموں نے آپ کو سمجھا ہی نہیں تھا، اور آپ کو تعاون کرنے کے بجائے راہوں پر آپ کے آگے روڑے اٹکانے کی کوششیں کیں، یوں کسی بھی مرحلے میں آپ کو کامیابیوں سے ہم کنار ہونے نہیں دیا گیا۔

دراصل مولانا محترم خالق کائنات کی جانب سے ایک مضطرب دل اور متحرک وجود لے کر آئے ہیں، آپ کا سینہ اپنی مظلوم قوم کی ہمدردی سے بھرپور ہے، آپ کی روح اپنی قوم کی حمایت کے لئے ہمیشہ بے چین رہتی ہے، آپ ہر جگہ کے مسلمانوں کے معاون اور ہر مقام پر بسنے والے مظلوموں کے حامی ہیں، اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دیں، آمین۔

دراصل مولانا کے انداز واطوار، طرز زندگی اور چال چلن سے لوگوں کو غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے کہ کہیں آپ ایک مال دار انسان تو نہیں ہیں؟ آپ نے اپنی زندگی میں مالی لحاظ سے یا معیشت کے حوالے سے نشیب وفراز دیکھا ہے، ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ آپ کو تنگ دستی کے بھوت نے آدبوچا بھی تھا، اس کے برعکس ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ آپ کی مالی حالت درست بھی ہو چکی تھی۔

اس حوالے سے مجھے ۱۹۹۱ء کا ایک واقعہ یاد آ گیا ہے کہ مولانا کے دوست اور میرے محترم استاد مولانا مستفیض الرحمن صاحب بانگلونوی، بوسیدگی علاج کے سلسلے میں چاٹگام آئے تھے، بانگلونوی صاحب کا خیال تھا کہ مولانا حسین احمد صاحب کی مالی حالت کافی درست ہے، لیکن ایک مہینے کی اقامت کے بعد ان کو بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ نہیں! مولانا حسین احمد صاحب اگرچہ بظاہر شاہانہ زندگی گزارتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایک بوریہ نشین، قوم وملت کے مفاد پر تڑپنے والے ایک غریب انسان ہیں، یوں ایک مہینے کے قیام کے بعد ایک روز بانگلونوی صاحب کہنے لگے کہ:

''مولانا حسین احمد صاحب! ماضی قریب وبعید میں آپ کے طرز بود وماند سے میں تو سمجھتا رہا تھا کہ آپ کی مالی حالت کافی درست ہے، لیکن اس مرتبہ ایک مہینے کی رفاقت ومعیت کے بعد بخوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ سرزمین ارکان سے نسبت رکھنے والے کوئی اور کسی بھی نمایاں عالموں کے برعکس آپ ایک مسکین اور مالی اعتبار سے حد درجہ غریب اور مفلس انسان ہیں''۔

میں نے ظاہر ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب کو بہت ہی قریب سے دیکھا، مالی اعتبار سے آپ کی حالت جیسی بھی ہو لیکن طرز زندگی اور چال چلن ہمیشہ شاہانہ دیکھا تھا، مولانا کسی بھی انسان کو اپنی زندگی کی عسرت کا اندازہ ہونے نہیں دیتے، جب بھی اللہ تعالی آپ کو فراغت نصیب کر دیتے تو آپ محتاجوں کی خیر خواہی کرنے میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑتے تھے، اور فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

آل برما مسلم کانگرس (BMC)

۲۰۰۲ء کے دوران حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی زندگی میں ایک عجیب سا موڑ آیا، وہ اس لئے کہ ایک طرف ہماری سیاسی وانقلابی فضاء میں (بعض سیاسی اسباب کی وجہ سے جن کی داستان بڑی طویل ہے) اداسی اور نا امیدی کی بدلی چھا گئی اور ہمارے زیر زمین کام کرنے والے اکثر فعال لیڈروں، رہنماؤں اور متحرک کارکنوں میں مستقل مزاجی وذہنی استقرار کی شدت سے کمی محسوس کی جانے لگی تھی، تو دوسری طرف میدان فکر وعمل اور سیاست وقیادت میں پیہم یک سو رہنے کی وجہ سے آپ کی معاشی حالت بھی ابتر سے ابتر ہو چکی تھی۔

پھر ادھر سیاسی وانقلابی نقطۂ نظر سے یہاں کی زمین ہمارے سیاست دانوں اور انقلابیوں کے لئے آئے دن تنگ کی جا رہی تو ادھر خود مولانا کو اپنے بعض دوستوں اور ساتھیوں کی مسلسل بے وفائی اور بے اعتنائی کا غم کھایا جا رہا تھا، ایسے حالات میں آپ نے فیصلہ کر لیا کہ اب ناگزیر ہے کہ سعودی عرب کی راہ لی جائے۔ یوں بھی مولانا شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ جن امنگوں اور نیک تمناؤں کے سہارے یہاں اتنے دنوں سے جی رہے، قربانیوں پر قربانیاں دے رہے ہیں، اب حالات کی

نزاکت زبان حال بن کر شہادت دے رہی ہے کہ ان پر پانی پھرا جا چکا ہے۔

یہاں ایک بات بڑی قابل ذکر ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب سیاسی اعتبار سے کانگرسی ذہنیت کا انسان ہیں، مولانا یوں بھی دیوبندی عالم تو ہیں لیکن سیاسی اعتبار سے حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کے بجائے حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی یا دوسرے الفاظ میں جمعیت علمائے ہند کو پسند کرنے والے انسان ہیں، علاوہ ازیں سب سے بڑی بات یہی ہے کہ آپ حضرت امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد کے ایک گونہ پرستاروں میں سے ایک ہیں، آزاد کی زندگی، ان کی بلند وبالا شخصیت اور استعداد ولیاقت پر بڑے فدا ہیں، یوں آپ نے اب کی بار کی اپنی سیاسی تنظیم کا نام بھی کانگریسی ڈھب پر دیا ہے، جو ظاہر ہے۔

بہر حال اب کی بار ۲۰۰۲ء میں سعودی عرب کی راہ لینے سے پہلے آپ نے اپنے بعض احباب اور چاہنے والوں کے سامنے اظہار خیال کیا کہ:

''میں نے سالہا سال تک اپنی مظلوم قوم کی نجات کی خاطر اس میدان عمل وتطبیق میں جان کھپائی ہے، بایں ہمہ جس بلند مقصد کے حصول کے لئے میں نے اتنی کوششیں کیں، اتنی مشقتیں برداشت کیں، اب حالات کے تناظر میں دیکھتا ہوں کہ اس مقصد کے حصول کے لئے طویل المدتی پروگرام کی ضرورت ہے، چوں کہ ابھی ایک طرف حالات بھی ہمارے متعاکس چل رہے ہیں تو دوسری طرف میری معاشی حالت اس دوران ابتر سے ابتر ہو چکی ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے میں پانچ سالوں تک میدان عمل وتطبیق سے کسی قدر دور ومجبور ہو کر کچھ اپنی معاشی حالت کی درستگی کے لئے کوشش کرتا ہوں، تا کہ اس کے بعد ملی وقومی کام کے کرنے میں آسانی پیدا ہو سکے، البتہ یاد رہے کہ جس مقصد کے لئے میں میدان چھوڑ کر جا رہا ہوں، اندیشہ ہے کہ وہاں سے بآسانی واپس بھی لوٹ سکوں گا''۔ (مفہوم ہے نہ کہ پورے الفاظ)

مولانا ۲۰۰۲ء میں سعودی عرب اس نیت سے پہنچے کہ پانچ سال وہاں رہ کر اپنی معاشی حالت درست کریں گے، اس کے بعد دوبارہ واپس لوٹیں گے، مگر ایسا ہو نہ سکا، اور جس اندیشے کا آپ نے

جاتے وقت برملا اظہار کیا تھا آخر کار ہوا بھی کچھ ویسا، بہر حال آپ نے وہاں دکانوں کی تجارت شروع کی، ہماری جانکاری کے مطابق آپ اصل مالکوں سے دکانیں لیتے اور دوسروں کو فروخت کر دیتے تھے، یوں اللہ تعالی نے آپ کی اس تجارت میں کافی برکت دی اور دیکھتے ہی دیکھتے لاکھوں کے مالک ہو چکے تھے، مگر افسوس ہے کہ بعد میں مولانا کی اس سود مند تجارت پر کچھ منحوس لوگوں کی بری نظریں لگ گئیں، اس کے بعد کیا کچھ ہوا اس کی طول طویل داستان ہے، جو اپنی جگہ پر موجود۔

ادھر آپ کی تجارت کا حال وہ تھا جو ابھی ابھی گزر چکا ہے، تو ادھر بات یہ ہے کہ جس انسان کا دل اپنی مظلوم قوم کی محبت سے سرشار ہو وہ آخر کب تک اپنی قومی و ملی خدمات سے دور رہ سکتا ہے؟ ویسے آپ نے ۲۰۰۴ء سے اپنی نجی تجارت کے تہ بتہ روہنگیا برادری کے مابین اپنے انداز میں دینی، دعوتی، فکری اور سیاسی سرگرمیوں کا از سر نو آغاز کیا، جس کا سلسلہ درمیان کے چند سالوں کو چھوڑ کرتا حال جاری ہے۔

آپ کی اس دعوتی، فکری اور کسی قدر ثقافتی سرگرمی سے پہلے ایک بات کا تذکرہ نہایت ضروری ہے کہ ۲۰۰۰ء یا اس سے بھی پہلے کی بات تھی کہ ہماری برادری کے کچھ نیم پڑھے شر پسند نوجوان جو نام نہاد سلفیت سے متاثر ہو کر ہماری برادری میں گمراہی پھیلا رہے تھے، مولانا نے اپنے مرشد حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیز ویؒ (خلیفہ و مجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین صاحب احمد مدنیؒ) کے ایماء اور آپ کے شفیق مربی و استاد حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب ہاٹہزاروی (خلیفہ و مجاز بیعت حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ) کے اشارے اور کسی قدر ان کے فکری تعاون سے ان شر پسندوں کی سرکوبی کی کوششیں شروع کر رکھی تھیں، جس میں آپ حد درجہ کامیاب ہو کے بنگلا دیش چلے آئے تھے۔

لیکن نہایت افسوس کا مقام تھا کہ بعض اسباب و وجوہات کی بنیاد پر آپ دو سالوں یعنی ۲۰۰۲ء تک واپس نہ جا سکے تھے، تو بعض دانا، بینا اور باخبر لوگوں کے مطابق اس درمیانی مدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہماری برادری کے ایک زخم سے چور مولوی صاحب نے خوشہ چین یا کفش بردارِ علمائے دیوبند کے لبادے اور آڑ میں مولانا کے اس مفتوحہ میدان میں اترنے کی اس لئے کوشش کی کہ مولانا

حسین احمد صاحب کا ہماری برادری میں اس طرح فاتح بن کر مزید چڑھتے ابھرتے رہنا ان مولوی صاحب کے لئے بڑے خطرے کا اشارہ ہے، کیوں کہ ان مولوی صاحب نے اپنے ذاتی مستقبل کو مزید سنوارنے کے لئے بزعم خود جو شمع شہرت جلا رکھی تھی وہ ہمیشہ کے لئے دھبر دوس ہونے اور بجھ جانے کا شدید اندیشہ ہے۔ تو ان مولوی صاحب کی وجہ سے کاز کا حد درجہ نقصان ہو گیا تھا، کیوں کہ:

☆ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ راقم کے نزدیک ان مولوی صاحب کی تمام تر کوششیں وجد وجہد (بزعم خود) غیر مرتب، غیر منظم ہونے کے علی الرغم موضوع کے حوالے سے حکمت ناشناسی اور ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھیں، جس کا منطقی انجام نہ صرف ان کی ذات کے لئے (جس کی لمبی چوڑی تفصیلات سے صرفِ نظر) بلکہ وہاں پائے جانے والی ہماری برادری اور ایک حیثیت سے پوری قوم کے لئے بہت ہی برا نکلا۔ علاوہ ازیں مصیبت پر مصیبتیں یہی تھیں کہ :

☆ مولوی صاحب کے حالات سے واقف اور ان کی مجالس میں شرکت کرنے والے بعض سمجھ دار مشاہدین کے بیان کے مطابق ان کی زبان، اندازِ بیان اور طرزِ گفتگو میں وہ تاثیر نہیں ہوتی جو عام طور پر ایک داعی الی اللہ (مناظر بھی تو ایک حیثیت سے داعی الی اللہ ہوتا ہے) کی زبان میں ہوا کرتی ہے۔

☆ مولوی صاحب بزعم خود ایک منطقی و فلسفی ہونے کے ساتھ مناظر بھی ہیں، لیکن مخالفین ان کے مناظرے و مباحثے کی زبان اور محاورات سے بالکل نابلد تھے، اور ان مخالف عناصر سے مناظرے کے لئے جو زبان اور محاورات کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس سرے سے نہیں تھے۔ تو ظاہر ہے کہ ان کے مکالمے و مباحثے یا ان کے الفاظ میں مناظرے کا منطقی انجام کیا، کیسا اور کس آن بان کا نکلا ہو گا؟ اور

☆ مولوی صاحب کی زبان میں فطری طور پر لکنت تھی اور ہے، یا کم سے کم اس میں غیر ضروری بلکہ بہت ہی غیر ضروری ٹھہراؤ پایا جاتا تھا اور پایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے مخالفین بلکہ عام سامعین بھی بھور محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تو ایسا انسان مناظرے میں جیت کا سہرا اپنا سر کیسے لے سکتا ہے؟ خاشا و کلا کبھی نہیں۔

☆ مولوی صاحب نے نام نہاد مناظرے کے حوالے سے عام اجلاس بلانے کے بجائے لوگوں کے گھروں میں متعدد جلسے منعقد کرائے، جن میں مخالفین میں سے ان افراد نے شرکت نہیں کی جنہیں

فریق مخالف میں ذمے دار یا سرغنہ سمجھا جاتا ہو،جس کی وجہ سے عام سمجھ دار لوگوں کے علاوہ مخالفین کے بعض بڑے بڑوں نے یہ تاثر لیا بلکہ کہنا تک شروع کر دیا تھا کہ مولوی صاحب کی ایسی بزدلانہ حرکتیں اور سرگرمیاں ذمے دارانہ ہونے کے بجائے کاز اور موضوع کی نسبت سے ان کی بدطینتی وبد باطنی (ان کے مطابق) کا عین عکاس ہیں، علاوہ ازیں بعض لوگوں نے ان کی ایسی حرکتوں کو بلند حوصلگی اور بزدلی کے میزان میں بھی تولنا شروع کر دیا تھا۔

☆ چند دن جاتے نہ جاتے مولوی صاحب بشمول ان کے چند حواریوں نے یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ انہوں نے ان شر پسند اور گمراہ کن عناصر کو دنگل میں مات دینے کے بعد ان کے ساتھ ایک معاہدہ بھی کر لیا ہے، جس میں ان کے مطابق ان گمراہ عناصر نے توبہ کر لی اور وہ راہ راست پر آ گئے ہیں ،لیکن بعد میں سوال کھڑا ہوا کہ مولوی صاحب اور ان کے حواریوں کا یہ ڈھنڈورا پیٹنا کہاں تک زمینی حقائق وواقعیت پر مبنی نہیں تھا؟ جب کہ مخالفین نے ان کے برعکس یہ واویلا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ مولوی صاحب دنگل میں ان سے مات کھا چکے ہیں۔

☆ موضوع اور مناظرہ کے حوالے سے مولوی صاحب نے ایک رسالہ لکھا، تقاضے کے مطابق کہ وہ عربی میں ہونا چاہئے تھا، لیکن نہ جانے کیوں (شاید لوگ جانتے بھی ہوں گے) کہ انہوں نے کچھ ٹوٹی پھوٹی اردو میں لکھ ڈالا، جب کہ ظاہر ہے کہ مخالفین اردو زبان سے سرے سے ناواقف ہیں، تو اس کے بعد ان شر پسند مخالفین نے بات مشہور کر دی کہ مولوی صاحب عربی زبان وادب سے ناواقف ہیں۔تو ظاہر ہے کہ اس سے فائدہ کس کا ہوا اور نقصان کس کا؟؟

راقم سطور سعودی عرب میں ۲۰۰۳ء کو پہنچا، اس زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب اپنی نجی تجارت کے علی الرغم دعوتی سرگرمی میں کافی مصروف ومگن تھے، آل برما مسلم کانگرس کی بنیاد پڑنے کے دوران راقم اگر چہ ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کی مجلس عاملہ کا ممبر اور سعودی عرب میں اس تنظیم کی طرف سے آفیشل مندوب تھا، لیکن ماضی کی طرح آپ کی سرگرمیوں کو کسی قدر قریب سے دیکھ رہا تھا، ۲۰۰۶ء کے دوران آپ نے راقم کو اپنی تحریک میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی تھی، لیکن بعض نا قابل بیان وجوہات کی بنیاد پر آپ کی دعوت کو لبیک کہنا ممکن نہیں ہوسکا۔

تقریباً ۲۰۰۷ء کے دوران آپ نے آل برما مسلم کانگرس (BMC) کی مجلس عاملہ کی تشکیل دی، جس میں وہاں پائے جانے والی ہماری برادری کی چند نمایاں ترین شخصیات جیسے ماسٹر محمد سلطان شقدار فاروی، ماسٹر عزیز احمد بوسیدنگی، حضرت مولانا مقبول احمد بارنگیار ڈیلوی، مولانا محمد حسن بوسیدنگی شامل تھیں۔

آمدم برسر مطلب ! بات یہ ہے کہ حالات حاضرہ کے تناظر میں اہل نظر اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ سعودی عرب کی سرزمین ہماری ان جیسی سرگرمیوں کے لئے کتنی مناسب یا نامناسب ہے، ایسی دل شکن فضاء اور سیاست کے حوالے سے ایسے مایوس کن ماحول میں بھی مولانا بطور خاص سیاست کے حوالے سے جن سرگرمیوں کا مظاہرہ جس شان اور جس آن بان سے کر رہے تھے، وہ ہر کسی کی ہمت وحوصلہ کی بات نہیں تھی، اور سچ کہوں تو اب بھی نہیں ہے، آپ اس زمانے میں اور تادم تحریر بھی روہنگیا سیاست کے حوالے سے وہاں جس عزم جواں اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس کا تصور عام انسان تو کجا کسی متوقع برے انجام سے واقف انسان کبھی نہیں کر سکتا، لیکن آپ کے طرز سر گرمی سے جو اندازہ کیا گیا اور کیا جا رہا ہے کہ آپ ایک جرات مند ہونے کے علاوہ خود خوف وغم سے مقابلہ کرنے والا کرشماتی انسان ہیں، اس حوالے سے آپ کا کہنا یہ ہے کہ:

> ’’حالات حاضرہ کے تناظر میں کون نہیں جانتا کہ سعودی عرب کی سرزمین ہماری اس نوعیت کی تحریکی سرگرمیوں کے لئے کتنی نامناسب ہے؟ خود ہمارے ساتھیوں میں سے بڑے بڑے بھی اس حوالے سے فکر مند تھے اور ہیں، جن کی ہمتیں جواب دینے کے قریب تھیں اور اب بھی ہیں، لیکن مجھے کسی قسم کے انجام کی فکر نہیں، کیوں کہ میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ میری اس نوعیت کے کام کی انجام دہی کے لئے سر دھڑ کی بازیاں لگانی پڑتی ہیں، بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں، مختلف پریشانیاں سہنی پڑتی ہیں، بھانت بھانت کی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، کال کوٹھری کی اندھیاری میں غرق ہونا پڑتا ہے، اور اگر ضرورت پڑی تو جانوں کا نذرانہ تک پیش کرنا پڑتا ہے، تبھی اللہ تعالی کو منظور ہو تو کبھی کہیں جا کر ایک تحریک

کامیابی سے ہم کنار ہوسکتی ہے، حقیقت میں بات یہ ہے کہ اور تو اور موت تک سے ڈرنے والا انسان میری اس نوعیت کے کام کے لئے میدان میں اترنے کا مستحق نہیں ہے، چنانچہ ظاہر ہے کہ میرے خلاف بھی بہت کچھ ہوتا رہا، آئے دن میں مختلف ومتنوع چیلنج سے مقابلہ کرتا رہا، ماضی میں بھی میں تین چار مرتبہ حراست میں لیا جاچکا، آخر کار باضابطہ طور پر حراست میں لیا جاچکا تھا، جس کی وجہ سے میں کبھی بھی گھبرایا ہوا نہ تھا، اور نہ اب بھی کسی قسم کے غم واندوہ کا شکار ہوں، کیوں کہ اللہ تعالی کے فضل وکرم سے مجھے اپنی ذات پر پورا اعتماد ہے کہ: **ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین**"۔

ظاہر ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب آل برما مسلم کانگرس سے پہلے روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے مؤسس رکن اور اس کی مجلس عاملہ کے فعال ومؤثر ممبر رہ چکے ہیں، لیکن موخر الذکر یہ تنظیم بس ایک سیاسی اور انقلابی تنظیم تھی، اب کی بار آپ نے آل برما مسلم کانگرس کے نام سے جس جماعت کی بنیاد رکھی، یہ محض ایک سیاسی اور انقلابی پارٹی یا تنظیم نہیں، بلکہ آپ کی بعض تقاریر اور تحریروں کے مطابق یہ ایک مستقل تحریک ہے۔

مولانا نے اس تحریک کے زیر سائے بہت سارے مفید کام انجام دیے، جن کی وجہ سے پوری قوم کو عموما اور وہاں پائی جانے والی روہنگیا برادری کو خصوصا بہت ہی فائدہ پہنچا، سر دست ایک طرح کے اس عجالے میں پورا احصاء تو ممکن نہیں، تاہم ان میں سے بعض چیزوں کا اجمال یہ ہے کہ:

(۱) ۲۰۰۴ء کے بعد مولانا حسین احمد صاحب نے اپنی تحریک کا آغاز اپنے ماضی کی دعوتی اور اصلاحی کڑی سے جڑتے ہوئے کیا، واقعہ یہ ہے کہ سعودی عرب میں افسوس ہے کہ ہماری برادری میں کچھ من چلے قسم کے نادان، علم وفن سے نابلد نوجوان پیدا ہوئے، (جن کا اجمالی تذکرہ سطور بالا میں بھی کیا گیا ہے) جو اسلام دشمن عناصر اور گم راہ کن فرقوں کے شکار ہو چکے تھے، اور جو اپنی گم راہ کن تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ہماری برادری کو گم راہ کرنے پر تلے ہوئے تھے، باوثوق ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق یہ نوجوان نام نہاد اہل حدیث کی آڑ میں دانستہ یا نادانستہ طور پر

پرویزی، احمدی، تکفیری، خوارج، اسلام دشمن یہود ونصاری کے علاوہ بہتوں انسانیت دشمن عناصر اور فرقوں کے گماشتے، چیلے اور ہتھکنڈے بنے کام کر رہے تھے، اب مولانا نے ان من چلے عناصر کو آڑے ہاتھوں لیا اور اپنی مؤثر تقریروں اور زوردار خطابات کے سہارے ان پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ وہ میدان سے دم دبا کے بھاگنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ تو ظاہر ہے کہ آپ کی یہ قابل قدر اور مؤثر کام دینی، ایمانی، روحانی، فکری اور دعوتی ہونے کے علاوہ "**دفع المضرات اقدم علی جلب المنفعات**" والے اصول کے لحاظ سے کتنی بڑی اہمیت کا حامل کام تھا۔

(۲) ساتھ ہی ساتھ آپ نے **دفع المضرات** کے ساتھ **جلب المنفعات** کا کام بھی بڑی باریک بینی اور پوری سنجیدگی سے جاری رکھا، اس حوالے سے بھی آپ نے درجنوں اجلاس کرائے، جن میں سینکڑوں کی تعداد میں علماء ومشائخ، پڑھے لکھے دانش وران اور ہزاروں کی تعداد میں عوام جمع ہوتے تھے، جہاں آپ نے اپنی قابل قدر دینی وایمانی، علمی وفکری، ثقافتی وسیاسی خطابات کے ذریعے ہماری ذہنی طور پر مضمحل برادری کی رہنمائی کی، اور اپنے خطابات کی ہزاروں کی تعداد میں کیسٹیں بنوا بنوا کر لوگوں میں تقسیم کروائیں، ویسے اصلاح احوال کے حوالے سے آپ کی یہ خدمت بڑی مؤثر رہی تھی۔

(۳) ۱۹۴۸ء سے لے کر مولانا کی اس بارآور و باثمر تحریکی خدمات کی ابتداء تک ہمارے ماضی کے بعض بزرگوں اور رہنماؤں اور حال کے بعض قائدوں اور سیاست دانوں کی بعض غلط اقدامات اور ناعاقبت اندیشانہ سرگرمیوں یا بعض شخصیات کی منفی کرداروں کی وجہ سے (خاکم بدہن اور گستاخی معاف!) ہمارے سیاسی وانقلابی حلقوں اور اخلاقی وفکری فضاء میں جو مایوسی اور اداسی کی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں، آپ نے اپنی مؤثر سرگرمی کے ذریعے ان کو بڑی حد تک صاف کیا، اور برادری کے اداس اور مایوس لوگوں کو امید کی کرنیں دکھائیں۔

(۴) مولانا کی ان سرگرمیوں سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آپ کے ہم عصر سیاست وقیادت اور تحریک وانقلاب کے مزاج سے تقریبا ناآشنا ایک مولوی صاحب کی سیاست وقیادت کے نام پر (بڑے بڑے دعوؤں اور وہ بھی بڑی سینہ زوری کے ساتھ) کچھ ناعاقبت اندیشانہ حرکات وسکنات کے نتیجے میں ایک طرف جو عموما علمائے ارکان کے مقدس ماتھے پر کلنگ کا ٹھیکہ لگ گیا تھا، تو دوسری

طرف خصوصا ہمارے دانشوران کو علمائے ارکان کے سروں پر جو یہ اور اس قسم کی دیگر شکایتیں تھوپنے کا موقع مل چکا تھا'' کہ یہ لوگ سرے سے اس میدان کے نہیں ہیں'' ان کا کسی قدر ازالہ ہوگیا۔ اس حوالے سے مولانا حسین احمد صاحب نے ان شکایات کی بڑی باریک بینی سے تدارک کیا، پھر ان مولوی صاحب کے غلط دعوؤں اور ناعاقبت اندیشانہ حرکات وسکنات کی وجہ سے علماء کے متعلق ہماری عام برادری کے علاوہ ہمارے بااثر دانشوروں کے دماغوں میں جو خلش ورنجش اور ان کے دلوں میں جو نفرتیں وکدورتیں پیدا ہوچکی تھیں، آپ نے اپنی خداداد لیاقت وصلاحیت اور اپنے جرات مندانہ کردار واقدامات کے ذریعے اس بات کا عملی ثبوت دیا کہ ہمارے دانشوروں کو علمائے ارکان کے متعلق اور کچھ ہو نہ ہو تو کم سے کم اپنے دل ودماغ میں آئی ہوئی شکایات پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔

سعودی عرب میں مولانا نے آل برما مسلم کانگرس کی ایک مرکزی یونٹ (شاید عارضی) قائم کی تھی، جو اب بھی ہے، پروگرام تھا اور ہے کہ جہاں جہاں روہنگیا برادری (جیسے یوروپ، ملائشیا، انڈونیشیا، متحدہ عرب امارات، پاکستان وغیرہ) پائی جاتی ہے، وہاں ایک ایک یونٹ قائم ہو، کاش اگر آپ حراست میں لئے گئے نہ ہوتے، تو آج تک شاید یہ ساری یونٹیں قائم ہوچکی ہوتیں، رہا بنگلا دیش کہ آپ اسے اپنی تحریک کے لئے مستقل مرکز قرار دینا چاہتے ہیں۔

مولانا جماعت کے مصارف کے لئے لوگوں کے چندے، صدقات وخیرات پر انحصار کرنے کے شدید مخالف ہیں، اس حوالے سے مولانا کا کہنا ہے کہ جماعت کے مصارف کے لئے ابتدائی طور پر ممبروں کو آگے بڑھنا ہوگا، اور ایک مناسب رقم کو تجارت میں لگا کر اس کے منافع سے جماعت کو چلانا ہوگا، آپ کے مطابق چوں کہ ہماری اس نوعیت کے کام کی انجام دہی کے لئے بھاری رقم کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے جماعت کے مجوزہ مستقل منصوبوں اور پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مسلم جہاں کی بھاری امداد وتعاون کی ضرورت ہوگی۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب حراست میں لئے جانے کے بعد نہ صرف آپ کی بلکہ آپ کے تقریبا تمام احباب کی امید تھی کہ آپ جلد رہا ہوجائیں گے، اور قافلہ کو مسلسل آگے بڑھائیں گے، لیکن آپ کی رہائی کے خلاف بڑی بڑی سازشیں ہونے کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہوسکا، اور آس ویاس کے ملے

جلے حالات میں دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی رہائی کو کوئی آٹھ سال سے زیادہ مدت لگ گئی تھی، جس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ نہ صرف آپ کا بڑا نقصان ہوا، بلکہ پوری قوم کو خسارے کا بوجھ اٹھانا پڑا، اس دوران کتنے آپ کے قابل قدر احباب اور رفقائے تھے، جنہوں نے اس جہانِ فانی سے رخصتیں لیں، اور کتنے آپ کے ہم سفر تھے کہ جو بعض اسباب ووجوہات کی وجہ سے قافلہ سے بچھڑ گئے، یا غلط ہاتھوں کے شکار ہوکر انہوں نے راہیں جدا کرلیں، لیکن پھر بھی آپ کے چند ایسے رفقائے کار تھے، جو آپ کی رہائی کے شدید منتظر تھے۔

بڑے افسوس اور حسرت کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کی رہائی کو روکنے کے لئے خود ہماری برادری کے کچھ قوم دشمن عناصر نے بڑی بڑی سازشیں کیں، اور اس حوالے سے بھاری رقوم کے ساتھ واسطے استعمال کئے، اور تو اور باضابطہ طور پر تشہیر تک کی گئی تھی کہ آپ حالت زندان میں اس جہاں سے کوچ کر چکے ہیں، تاکہ آپ کے منتظرِ فرد احباب اور رفقائے کار کے حوصلے ٹوٹ جائیں، اور وہ مایوس ہوکر ہمیشہ کے لئے بکھر جائیں، لیکن اللہ تعالی کا کرم تھا کہ آس ویاس کے ان ملے جلے حالات میں بھی آپ کے بعض احباب کے حوصلے پست نہیں کئے جاسکے تھے۔

یہ دنیا بڑی ستم گر ہے کہ بسا اوقات یہاں ظالموں کو ان کی ستم ظریفی پر ہزار داد ملتی ہیں، اور مظلوموں کی بے بسی پر آنسو بہانے کے بجائے ان کی مظلومیت کا مذاق اڑایا جاتا ہے! جہاں بلبلیں ناکردہ جرم کی پاداش میں قید صیاد میں ہوا کرتی ہیں تو الو ہر کجا اپنی فتح کی راگنی گاتے اور کامرانی کی تاریں چھیڑتے پھرتے ہیں، تو یہاں مولانا کے حوالے سے بھی ایسا کچھ ہوتا رہا تھا۔

آہ! زنداں کے شب وروز میں مولانا پر کیا کچھ بیتا ہوگا، آپ کے طبع نازک پر کتنا اندوہ ناک بار پڑا ہوگا، آپ کی کتنی ذاتی وقومی توقعات اور امیدیں خاک میں مل چکی ہوں گی، آپ کی ناز پروردہ اولاد واہل پر کتنی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں گے، آپ کے گھرانے اور خاندان پر کتنی پریشانیاں لاحق ہوئی ہوں گی، یہ وہ جانے اور خدا جانے۔ لیکن ظالمو یاد رکھو! اللہ کے گھر میں دیر ہے، لیکن سدا اندھیر نہیں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تمہیں معاف کرے، اور منظور ہو تو تمہاری ہدایت کا فیصلہ فرمائے۔

بہرحال ۲۰۱۸ء میں مولانا اچانک رہا ہوگئے۔ الحمد للہ۔ اور امید کے مطابق آپ نے اپنے ملی

اور قومی کاز کو آگے بڑھانے کے لئے تازہ دم ہوکر دوبارہ کمر ہمت کس بھی لی، یوں دیکھتے ہی دیکھتے آپ کے وہ احباب اور رفقائے کار جو منتظر فردا تھے، ایک ایک کر کے آپ کے گرد جمع ہو گئے، صرف یہی نہیں بلکہ مزید خوشی کی بات ہے کہ چند ایسے قابل قدر افراد بھی آپ کے قافلے میں شامل ہو گئے، جو اس قافلے میں اگر چہ نت نئے ہیں، لیکن ان کو آپ کی ذات عالی مرتبت اور آپ کے دینی وملی، علمی و ثقافتی، فکری و سیاسی صلاحیات وکمالات پر امید نہیں بلکہ یقین سا ہو چلا ہے کہ لے دے کر شاید اس مظلوم ومعصوم، اداس و مضمحل قوم کے لئے ایک ہی ناخدا باقی رہ گیا ہے، جو ناپید کنار سمندر کی موج و تلاطم میں ہچکولے کھاتی ہوئی اس قومی کشتی کو خدا کرے تو پار لگا سکتا ہے، پھر اس پر مستزاد یہ ہے کہ کاضی قریب و بعید میں کبھی آپ کے مخالفین کی صف اول میں پائی جانے والی ہماری برادری کی چند نمایاں ترین شخصیات بھی آپ کے ہم آہنگ ہو گئیں، جن میں سے بعض کا بیان ہے کہ:

''اگر چہ مدتوں پہلے ہم حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی من موہنی اور دلاویز شخصیت اور آپ کے بعض موہوبی وکسبی صلاحیات وکمالات سے واقف ہو چکے تھے، لیکن افسوس ہے کہ ہم آپ کے بعض حاسدین کے حقد وحسد کے جال میں بری طرح پھنس چکے تھے، اب سالوں بعد یہ معلوم ہونے پر حسرت کی انتہا ہو گئی ہے کہ ہم نے نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ آپ سے دور رہنے کی شکل میں پوری قوم پر ظلم ڈھایا ہے، کاش آپ کی قربت پہلے نصیب ہوئی ہوتی، اور آپ کے کمالات سے ہم مستفید ہو سکے ہوتے، آج تک شاید دنیا اس مظلوم قوم کی حالت کسی دوسری شکل میں دیکھ رہی ہوتی''۔

تقریباً ۲۰۲۱ء کے بعد سے مولانا حسین احمد صاحب اپنی جماعت کو منظم ومرتب کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، لیکن کچھ حالات کے تقاضے اور وقت کی نزاکت کے ساتھ بعض قانونی مشکلات حائل ہیں، اور سمجھ رہے ہیں کہ ان مشکلات کو حل کئے بغیر جماعت کے بعض ضروری پروگراموں کو آگے بڑھانا مناسب نہیں، خدا کرے کہ حالات اپنی مثبت انگڑائیوں کے ساتھ بدل جائیں، اور ان قانونی مشکلات کے حل کے لئے کوئی راہ نکل آئے۔

ظاہر ہے کہ مولانا کی جماعت کا نام تقریباً ۲۰۰۴ء سے آل برما مسلم کانگرس (BMC) ہے، آپ

کے مطابق جس کا دستور بھی ہے اور منشور بھی، حالات کے تقاضے اور وقت کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ٹھہراؤ کے ساتھ کچھ سرگرمیاں بھی چل رہی ہیں۔ تاہم ماضی قریب میں آپ کے بعض مخلص احباب اور بہت ہی قریبی رفقائے کار کی طرف سے ایک تجویز پیش گئی تھی کہ وطن عزیز کے زمینی حقائق کے پیش نظر جماعت کا نام بدل دیا جائے۔ پھر چند مہینے کی بات تھی کہ اس تجویز کے حوالے سے جماعت کا ایک اعلی سطحی اجلاس منعقد کیا گیا تھا، جس میں بڑے غور وفکر اور کافی بحث ومباحثے کے بعد جماعت کے نام کو تبدیل کرنے کی قرارداد پاس ہوئی، اور زمینی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے جماعت کا نام ارکان نیشنل کانگرس (ANC) رکھا گیا۔ اس کے بعد طبعی امر ہے کہ جماعت کے دستور ومنشور میں بھی ضروری تبدیلیاں لائی جائیں، جس کے لئے مولانا کی زیر صدارت اور ایک اجلاس بلا گیا تھا، جس میں اس ضرورت کو پوری کرنے کے لئے چار رکنی ایک کمیشن بنا دیا گیا، جو دستور ومنشور میں ضروری تغییر وتبدل اور اضافے وترمیم کر کے اسے حتمی شکل دے گا۔

دعوی تو نہیں، مگر بات یہ ہے کہ ایک سعودی عرب تو کیا، شکر ہے کہ میں دنیا کے چپے چپے میں رہائش پذیر ہماری برادری کی نمایاں ترین فکری اور سیاسی شخصیات کے حالات وکمالات اور ان کے کوائف سے ضروری حد تک واقف ہوں، تو حالات کے تناظر میں عرض ہے کہ آج کل جو قابل قدر احباب و رفقائے کار آپ کے گرد جمع ہو چکے ہیں، میرے علم کے مطابق یہ ہماری برادری کے چنیدہ اور نمایاں ترین افراد ہیں، اور شک نہیں ہے کہ جو اپنے اپنے مقام پر قابل قدر بھی، جس کا احساس اور کسی کو ہو نہ ہو مگر مولانا کو ضرور ہے، اگر ان شخصیات اور ان کی استعداد اور صلاحیات کو برمحل اور صحیح معنی میں بروئے کار لایا جائے گا تو امید نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ یہ جماعت اور اس کی سرگرمیاں بڑی قلیل مدت میں روہنگیا قوم کے خزاں دیدہ گلشن میں باد بہار کے جھونکے بن کر آسکیں گی، اگر چاہے خدا کرے۔

لیکن کیا کہوں اور کیسے بتاؤں؟ باتیں بڑی نازک اور دل خراش ہیں! کہ مولانا اور آپ کی جماعت آج جس زنداں نما ماحول میں محصور ہے، وہاں انسان تو کیا بلکہ باد بہار سے متاثر چڑیوں تک کے چہچہانے پر پابندیاں لگی ہوئی ہیں، وہاں بلبلیں ہیں مگر سدا خاموشی پر مجبور، کوئل ہیں مگر گلشن ہستی کے نام نہاد رکھوالوں کی ستم ظریفی سے پریشان ورنجور، وہاں صبح نو کی امید شاید کی جاسکتی ہوگی، لیکن ہر آن

ہر کسی کی شام زندگی کے لئے دروازہ کھلا ہی کھلا رہتا ہے، قدرت نے اس گلشن کو نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ عام انسانوں کے لئے بھی سدابہار بنایا ہے، ہر پل وہاں خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتیں اور ساری کائنات میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں، لیکن نہ جانے اس پر کس عفریت کا سایہ پڑا ہے اور کس منحوس کی نظر لگ گئی ہے کہ۔۔۔۔۔۔تو اس دل شکن ماحول اور اس محبوسی کے عالم میں ایک انسان کرے تو کیا کرے؟ ویسے آج ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا اور آپ کے احباب کو وہاں سے نکلنا ہی ہوگا، ورنہ آپ اپنی ملت وقوم اور اپنے وطن عزیز کو باغ و بہار سے آشنا کرانے کے لئے جو امیدیں لئے جی رہے ہیں، وہ کبھی بھی (خاکم بدہن) بھر نہ آسکیں گی، اور آپ کے تمام کئے کرائے کام دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

چھٹا باب

ذہانت اور حاضر دماغی

اس بات میں کسی قسم کا شک نہیں ہے کہ مولانا حسین احمد ایک ذہین انسان ہیں، قدرت نے آپ کے اندر صفتِ ذہانت کو کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے، طالب علمی کے زمانے سے آپ کی ذہانت کا چرچا بڑے اور وسیع پیمانے پر ہونے لگا تھا، اور میرے ذاتی مشاہدہ اور علم کے مطابق یہ چرچا بالکل سچائیت اور حقیقت پر مبنی تھا، صرف ہمارے علمی اور تعلیمی حلقوں میں نہیں بلکہ ہمارے سیاسی حلقوں میں بھی آپ کی ذہانت کے چرچے عام طور پر ہونے لگے تھے، آپ نے ہمارے سیاسی حلقوں میں اپنی ذہانت وفطانت کا سکہ اس طرح جمایا کہ جس طرح ماضی میں ہمارے تعلیمی اور تدریسی حلقوں میں جمایا تھا، اور آپ کے احباب اور رفقائے کار کو ہمیشہ اس حوالے سے آپ کا گن گاتے ہوئے دیکھا گیا۔

ذہین ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مولانا محترم خاصے حاضر دماغ انسان بھی ہیں، اور اس کے ساتھ بڑے مناظر بھی، جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے دوران تعلیم آپ نے چند مناظرے کی مجالس میں حصہ لیا تھا، جہاں آپ کو بارہا کامیابی نصیب ہوئی تھی، اسی طرح فراغتِ تعلیم کے بعد میدین عمل و تطبیق میں بھی بعض بدعتی اور منحرف لوگوں اور گروہوں سے آپ نے اہل السنت والجماعت کی جانب سے مناظرہ و مباحثہ کیا تھا، اور ہر کجا آپ نے اہل السنت والجماعت کے عقیدہ ومسلک کی سچائیت اور حقیقت کا لوہا منوایا تھا، اللہ تعالی کے فضل وکرم سے ان تمام مناظروں میں نہ صرف رسوائی کا سامنا کرنا نہیں پڑا، بلکہ ہر مرتبہ فتح وکامرانی نے آپ کا قدم چوما تھا، اور کبھی کبھار منحرفین میدان سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے تھے، اس حوالے سے زندہ مثال نہلا والے مناظرہ سے دی جاسکتی ہے، کہ چاٹگام سے آئے ہوئے دو بدعتی عالم نے میدان چھوڑ کر ایسا بھاگا کہ بعد میں انہوں نے وہاں آنے تک کا کبھی نام نہیں لیا۔

مولانا کی انشاء پردازی

مولانا حسین احمد صاحب بعض لوگوں کے نزدیک ادیب وانشاء پرداز ہیں، مگر ظاہر ہے کہ آپ کے قلم شریف سے آج تک چند مختصر خطوط ومقالات کے سوا کوئی چیز منظر عام پر نہیں آسکی، خطوط تو خطوط ہوتے ہیں، تاہم مقالات کا جہاں تک تعلق ہے کہ ان میں بالعموم کچھ غیر مہذب چیزوں کے ساتھ ہی ساتھ کچھ معارضانہ شان ہی نمایاں ہے، بات یہ ہے کہ آپ کی تحریر چاہے اردو میں ہو یا عربی میں ان میں متانت اور سنجیدگی کے بجائے آپ کے مخصوص افتادِ طبع اور مزاج کی گرامی کی تیز وتند جھلکیاں نظر آتی ہیں، ظاہر ہے کہ آپ ان مذکورہ دونوں زبانوں کے اہل لسان میں سے نہیں ہیں، اس لئے آپ کی تحریر میں فنی اور لسانی فروگزاشتیں کافی حد تک پائی جاتی ہیں، لیکن یہ سچ ہے کہ آپ جو کچھ بھی لکھا کرتے ہیں کسی قدر آپ کی بے تھکی زبان کی طرح روانی سے لکھتے ہیں، علمی، فنی یا لسانی لحاظ سے جو کچھ بھی ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ آپ کی ٹوٹی پھوٹی تحریر میں بانکپن نما چیزیں نمایاں ہے۔

مولانا محترم سے صرف میں نے نہیں بلکہ بعض دیگر دوستوں اور خیر اندیشوں نے ماضی میں بارہا گزارش کی تھی آپ کسی ضروری موضوع پر لکھیں، تو ہمارے اصرار کے جواب میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ ''لکھنا تو بڑی بات نہیں، لیکن میرے قلم سے جو بھی نکلے وہ عالمانہ اور فاضلانہ ضرور ہونا چاہئے، ورنہ لکھنے سے نہ لکھنا ہی بہتر ہے'' ویسے آج تک آپ کے قلم شریف سے کوئی بھی عالمانہ اور فاضلانہ تحریریں منظر عام پر نہیں آسکیں، مستقبل کا اللہ معلوم۔

ادھر حال ہی کی بات ہے کہ آپ نے ناچیز سے ایک دو ٹیلیفونک رابطے کے دوران فرمایا تھا کہ عربی میں تابعین اور اتباع التابعین کے حالات پر مشتمل میرے قلم سے ایک ضخیم چیز مسودہ کی شکل میں تیار ہو چکی ہے، علاوہ ازیں اردو زبان میں چند روہنگیا علمائے کرام اور مشہور اعیان پر ایک اور مسودہ بھی تیار ہوا ہے، آپ کے مطابق یہ ساری چیزیں آپ نے مکہ مکرمہ میں دوران نظر بندی لکھی تھیں، میں نے بارہا عرض کی تھی کہ آپ میرے پاس ان مسودے کا ایک ایک نسخہ ارسال فرمائیں، لیکن باوجود چند مرتبہ یاددہانی کے آج تک میں ان نسخہ جات کے حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا، بارہا جواب یہی ملتا ہے کہ یہ نسخے ابھی میرے پاس نہیں ہیں، اگر ہاتھ آجائیں تو تمہارے پاس بھیج دوں گا،

اگر آپ کے بیان کے مطابق یہ چیزیں سامنے آئیں گی تو ایک بڑے کام اور شان کی بات ہوگی (۱) کاش اس وقت یہ چیزیں میرے سامنے ہوتیں تو اس باب میں آپ کی انشاء پردازی کے حوالے سے زیادہ کچھ لکھنا ممکن بھی ہوتا۔

جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے کہ مولانا محترم دیگر میدانوں کی طرح تحریر کے حوالے سے کافی غیور نکلے ہیں، آپ کے قلم شریف سے کوئی بھی چیز نکلے اور کوئی اس پر ٹوکنا بھی شروع کردے، آپ کی غیرت شاید یہ برداشت کر سکے گی، اور شاید یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی قلم کاری اور انشاء پردازی پر کوئی کبھی نظر ثانی کی بھی ہمت کرے، کیوں کہ اس حوالے سے آپ کو بارہا یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ''میری تحریریں میرے مرنے کے بعد چھپ کر منظر عام پر آسکیں گی'' تو آپ کی اس بات سے شاید یہی مطلب کا نکالنا آسان ہو کہ آپ زیادہ سے زیادہ لکھنا چاہتے ہیں، لیکن آپ کی تحریروں پر لوگ ٹوکے اور آپ زندہ بھی رہیں یہ آپ کے تقاضائے غیرت کی منافی بات ہے، پھر بھی آپ کے بعض خیر اندیشوں کی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ کے اشہب قلم روہنگیا مظلوموں کے حوالے سے میدان میں دوڑے، اور دنیا یہ دیکھے کہ سرزمین ارکان نے کتنے بڑے پائے کے قلم کار پیدا کر کے میدان علم و فضل کا حوالہ کیا ہے، ویسے بھی ضروری ہے کہ ایک عالم وفاضل کے علوم وفنون رہتی دنیا کے لئے زندہ و جاوید اور سرمدی بن جائے، ورنہ ظاہر ہے کہ ہمارے دیگر بڑے بڑے علماء اور فضلاء کی طرح آپ بھی اپنے کفن سے لپٹے سارے علوم وفنون اپنی قبر کو لے جائیں گے، جو کم سے کم سرزمین ارکان اور وہاں کی اگلی نسلوں کے لئے خسارے کی بات ہوگی، اللہ مولانا کو توفیق سے نوازے، آمین۔

بہر حال مولانا محترم کی عربی دانی کم سے کم میرے ناقص خیال میں سرزمین ارکان کے علمائے کرام

---

(۱) یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ محترم حضرت مولانا حسین احمد صاحب ایک طویل نظر بندی کے بعد حال ہی میں الحمد للہ تعالی رہا ہو چکے ہیں، اور اس نظر بندی کی بھی ایک طول طویل داستان ہے، جس کی کچھ جھکیاں ان تحریروں میں کہیں کہیں نظر آئیں گی، مولانا محترم کے بیان کے مطابق مذکورہ چیزیں آپ نے دوران نظر بندی لکھی ہیں، فرماتے ہیں کہ جو آج کل ایک سعودی آدمی کے پاس محفوظ ہیں، خدا معلوم کہ قیامت تلک یہ تحریریں منظر عام پر آسکیں گی یا نہیں؟ تعالی آپ اور آپ کی ان تحریروں کا بھلا کرے، آمین۔

کے لئے قابل فخر ہے،آپ بڑی روانی سے عربی زبان بول لیتے ہیں،صرف یہی نہیں بلکہ بسا اوقات عرب علماء وفصحاء تک کو زبان کے حوالے سے ٹوک لیتے ہیں،اسی طرح اردو بھی بڑی آسانی کے ساتھ پڑھ اور بول لیتے ہیں،تاہم ان دونوں زبانوں میں انشاء پردازی کا جہاں تک سوال ہے کہ پچھلی سطور میں جس طرح عرض کی گئی ہے کہ آج تک آپ کے مبارک قلم سے ایسی کوئی چیز منظر عام پر نہیں آئی یا نہیں آسکی کہ جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکے کہ آپ ان دونوں زبانوں میں بولنے کی حد تک جتنی بھی مہارت رکھتے ہیں،کم سے کم اتنی ہی ان میں لکھنے کی بھی قدرت رکھتے ہوں۔

علاوہ ازیں آپ برمیز اور انگریزی زبانیں بھی کسی قدر پڑھ بول لیتے ہیں،تاہم ان دونوں زبانوں میں آپ کو کبھی لکھتے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا،پھر جہاں تک ہندی اور بنگالی زبانوں کا تعلق ہے کہ آپ یہ دونوں زبانیں تو سمجھ لیتے ہیں لیکن ان زبانوں کا ابجد تک آپ کو نہیں آتا،تاہم بنگالی زبان کے متعلق ایک تعجب کی بات ہے کہ آپ جس طرح عرض کی گئی ہے کہ بنگلا پڑھ لکھ تو نہیں سکتے،لیکن ادیبوں کے ادبیات پر ایسے گرفت اور کلام کرتے ہیں کہ خود ادیب بھی متحیر اور ششدر رہ جاتے ہیں،راقم کی نظروں کے سامنے اس حوالے سے بہت سارے واقعات ہو چکے ہیں۔

نہ جانے کیوں کہ گستاخی معاف! کہ مولانا محترم لکھتے بہت کم ہیں،لیکن کہتے بہت زیادہ،آج یہ لکھنے کی امید ہے اور کل وہ لکھنے کی آرزو ستا رہی ہوتی ہے،لکھنے کے لئے ایسے ایسے موضوعات سامنے لاتے ہیں کہ دل دہل جاتا ہے کہ آیا وہ کبھی آپ سے ہو بھی پائے گا کہ نہیں؟

مولانا محترم حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے حوالے سے فرمایا کرتے ہیں کہ ''لکھنے والوں کو چاہئے کہ ایک صفحہ لکھنے کے لئے سو صفحات پڑھیں،اور سو صفحات لکھنے کے لئے ہزار صفحات پڑھا کریں''،اس بات سے شاید مولانا کا مطلب یہی ہو کہ آج کل کے لکھنے والے پڑھتے بہت کم ہیں اور لکھتے بہت زیادہ۔تاہم یہ الگ بات ہے کوئی آدمی زندگی بھر پڑھتے رہیں یا پڑھتے نہیں لیکن پڑھنے کا ڈھونگ رچاتے پھریں،اور لکھنے کی طرح ایک صفحہ بھی لکھے بغیر اس جہان فانی سے رخصت لئے چلے جائیں،یہ بھی تو کوئی اچھی بات نہیں ہے نا؟۔

ارکان کے حوالے سے مولانا کا کچھ سیاسی نقطۂ نظر

روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے زمانے میں (جس میں مولانا مجلس عاملہ کے ممبر ہونے کے علاوہ ایک طویل زمانے تک اس کی روح رواں بھی رہ چکے ہیں) آپ یا آپ کی تنظیم کا نصب العین کھل کر سامنے آچکا تھا،وہ تھا ''حق خود ارادیت'' جس کے میرے نزدیک دیگر مفاہیم میں سے ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ارکان کے مستقبل کے حوالے سے خود ارکان کے باشندے ایک ریفرنڈم کے ذریعے فیصلہ کریں گے،جس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں کہ جن میں:

۱۔ ظاہر ہے کہ ارکان میں دیگر نسلی گروہوں کے ساتھ دو بڑی قومیں آباد ہیں،ایک کا نام مگھ جو بدھ مت کے پیرو اور دوسرے کا نام روہنگیا جو مسلمان ہیں،بالعموم ارکان میں ان کی مخلوط زندگیاں ہیں،اب حق خود ارادیت کی بنیاد پر جو ممکنہ ریفرنڈم ہوگا وہ رواداری اور بقائے باہمی کے اصول پر ہوگا،جس میں ارکان کے حوالے سے تقسیم کی کوئی بات نہیں ہوگی،بات ہوگی مل جل کر رہنے کی۔

۲۔ ارکان میں برمیوں کا جہاں تک سوال ہے کہ وہ تو ظاہر ہے کہ یہ لوگ یہاں کے لئے اجنبی ہیں،دخلاء ہیں اور غاصب ہیں،ان کو ایک نہ ایک دن یہاں سے نکل جانا ہی ہے،رہا دیگر نسلی گروہوں کے علی الرغم ارکان میں جو بڑی قومیں پائی جاتی ہیں،ان کے مابین جو ریفرنڈم ہوگا،آیا وہ دو قومی نظریات کے اصول پر تقسیم کی بنیاد پر ہوگا کہ نہیں؟اور اگر رواداری اور بقائے باہمی کے اصول پر ریفرنڈم نہیں ہوگا تو ظاہر ہے کہ ارکان کو تقسیم کرنے کی بنیاد پر ہوگا،ایسے حالات میں ارکان تقسیم ہو کر دو الگ الگ ملک بن جائے گا،جہاں تعیین حدود کی باتوں کے علاوہ دیگر بڑی بڑی مشکلات سامنے آئیں گی،جنہیں حل کرنا بھی آسان کام نہیں ہوگا۔

مطلب یہی ہے کہ ''حق خود ارادیت'' کا نصب العین روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے علاوہ دیگر جماعتوں کا بھی نصب العین رہا ہے،جس کی تفصیلات میرے علم کے مطابق ارکان کے متعلق آج تک کھل کر سامنے نہیں آئی ہیں،اس لئے ہم بانگ دہل یہ دعوی کرنے میں حق بجانب ہیں کہ حق خود ارادیت والا نصب العین ارکان کے حوالے سے ایک غیر واضح نصب العین ہے،جس کی تفصیلات کو سامنے لانا کل بھی ضروری تھا اور آج بھی ضروری ہے۔

ویسے مولانا حسین احمد صاحب بھی ہماری برادری کے ایک سیاست دان اور رہنماء ہیں، اور روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن (RLO) پھر برما مسلم کانگرس (BMC) کے ایک لیڈر بھی، ماضی میں آپ کی جتنی بھی تقریریں سنی گئیں، اور ان سے اخذ نتائج کیا گیا، ان کے پیش نظر میرے لئے حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہو گیا ہے کہ آیا آپ ارکان کے حوالے سے رواداری اور بقائے باہمی کے اصول پر کاربند ہیں یا دو قومی نظریات کی بنیاد پر تقسیم کے خواہاں؟ کیوں کہ آپ کے ماضی کی بعض تقاریر سے یہ بو آتی تھی کہ آپ کل ارکان میں اسلام اور مسلمانوں کی بالادستی کے شدید خواہاں ہیں، اس کے برعکس بعض مجالس میں آپ کی تقاریر میں یہ رجحان بھی صاف نظر آتا تھا کہ آپ سرزمین ارکان میں رواداری اور بقائے باہمی کے اصول کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ کو کبھی برمیوں کی طرح مگھوں پر بھی نالاں اور برگشتہ برستے نظر آتے تھے، اور کبھی کبھار مگھوں کے ساتھ مصالحت پر آمادہ بھی نظر آتے تھے، اور کہوں تو در اصل بات ہی یہی ہے کہ ایک صرف مولانا تو کیا درحقیقت ارکان کی سیاست کے حوالے سے ہمارے سیاست دانوں کے بھی مابین ایک واضح نظریہ کا فقدان ہے، شاید اس وجہ سے بھی روہنگیا سیاست دانوں کے مابین ہم آہنگی نہیں ہو پائی جارہی ہو، جس کی شدید ضرورت تھی اور ضرورت رہے گی۔

ادھر ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے لیڈروں نے جماعت اسلامی سے متأثر ہو کر کل ارکان میں اسلام کی بالادستی لانے کی کوشش کی، اور ارکان میں فریضۂ اقامت دین کی راگنی الاپی تھی، تو مولانا حسین احمد صاحب نے ان سے یہ کہہ کر مخالفت کی کہ ہمارے جیتے جی ارکان میں جماعت اسلامی کے نظریات وافکار کا فروغ نہیں ہوسکتا، ویسے آپ حضرت مولانا مودودی صاحب کے افکار ونظریات سے متأثر شدہ جماعت کی کھل کر مخالفت کی تھی، اس دوران آپ کے دیئے ہوئے بیانات سے یہ سمجھنا کوئی دشواری نہیں تھی کہ آپ حضرت مولانا سید ابوالاعلی مودودی کے افکار ونظریات کو ایک صالح افکار ونظریات اور ان کے پیش کردہ بعض تصورات کو معیاری ماننے کے حامی نہیں تھے، آپ کی مجالس میں اس حوالے سے باتیں چھڑ جاتی تھیں، تو آپ جماعت اسلامی کے برعکس علمائے دیوبند کے پیش کردہ افکار ونظریات کی حمایت میں باتیں کیا کرتے تھے، یوں بھی واضح ہے کہ مولانا محترم جماعت علمائے دیوبند کے حامی اور طرف دار عالم ہیں، کبھی کبھار آپ فرمایا

کرتے تھے کہ ''ہم کسی بھی حالت میں علمائے دیوبند کی عزت وناموس کو خاک میں ملنے نہیں دیں گے، جان جائے تو جائے ہم اپنے اسلاف کی لاج ضرور رکھیں گے، علاوہ ازیں اس ضمن میں ایک بات یہ بھی ہے کہ آپ نے علمائے دیوبند کی حمایت میں چند مناظرے بھی کئے، جن میں ماشاء اللہ ہمیشہ آپ کی جیت کے ساتھ مخالفین کی ہار ہوئی تھی، خدا آپ کی حیات میں برکت دے، اور اسلاف کی لاج رکھنے کی مزید توفیق سے نوازے۔

نصابِ متداولہ پر آپ کی رائے

آج تک یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی ہے کہ ہمارے دینی مدارس میں صدیوں سے درس نظامیہ کا جو نصاب چل رہا ہے، اس پر نظر ثانی کی بے حد ضرورت ہے، اس پر بعض لوگوں کا کہنا ہے اس کی اصلاح یا تطویر ہونی چاہئے، جب کہ بعض حضرات کی رائے یہ بھی ہے کہ اس کو سرے سے تغییر وتبدیل کر دینا چاہئے، میرے ناقص خیال میں جو سردست ناممکنات میں سے ہے۔

اس حوالے سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے مختلف بیانات سے آپ کا نقطۂ نظر میرے سامنے کھل کر سامنے آچکا ہے، ان بیانات کے مطابق آپ اس نصاب کو کلی طور پر تبدیل یا تغییر کے حامی نہیں ہیں، لیکن اس پر امعان نظر سے کام لے کر اسے زمانے کے تقاضے اور حالات کی نزاکت کے مطابق کرتے ہوئے اس کی اصلاح کی شدید ضرورت محسوس کرتے ہیں، یوں آپ کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس باب میں زیادہ سے زیادہ گفتگو کی اشد ضرورت ہے، اس حوالے سے میں نے ایک مقالہ ''مدارس اسلامیہ کے نصاب ونظام اور جدید تقاضے'' کے عنوان سے لکھا، جو الحمد للہ ناظرین کرام کے ہاتھوں ہاتھ پہنچ کر بے حد مقبول ہو چکا ہے، یہ مقالہ مولانا کی نظر سے بھی گزرا ہے، آپ نے اس مقالہ کے حوالے سے کچھ اصلاح کے ساتھ راقم کو داد تحسین بھی دی ہے۔

یہاں صرف مزید اتنی سی بات عرض ہے کہ مولانا محترم اپنے عہد شباب میں ہمارے مدارس دینیہ میں منطق کی جن کتابوں کی تعلیم دی جاتی ہیں ان پر نہایت نالاں اور برگشتہ تھے، لیکن عمر کے ساتھ آپ کی اس برگشتگی میں کمی محسوس کی گئی ہے، اور فرمایا کرتے تھے کہ منطق کے بعض مقالے اور مباحث

پر مشتمل بعض کتابیں درس میں رکھنے کی ضرورت بھی ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ آپ کا یہ بھی فرمانا ہے کہ نصاب متداولہ میں تفسیر جیسی لازمی اور لابدی چیزوں پر ہمارے مدارس میں بہت کم توجہ دی جاتی ہے، اس لئے مدارس دینیہ کے لئے لازمی ہے کہ تفسیر جیسے اہم موضوع پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے، اس سلسلے میں آپ نے بعض ارباب فکر وعمل سے ضروری گفتگو بھی کی تھی، جو اس زمانے کے مطابق خاصی بارآور رہی تھی، لیکن بعض وجوہات کی بنیاد پر بعد میں اس پر مزید عمل درآمد نہیں ہوسکا تھا۔

مولانا ایک جواں مرد مناظر ہیں

مولانا حسین احمد صاحب ایک دلیر، بے باک، جواں مرد اور مثالی مناظر عالم دین ہیں، اس حوالے سے پچھلی سطور میں کچھ باتیں بکھرے ہوئے انداز میں گزر بھی چکی ہیں، بات یہ ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں بدعتیوں اور بعض منحرف گروہوں سے بہت سارے مناظرے کئے تھے، اور جہاں بھی آپ نے مناظرے کئے، فتح وکامرانی نے آپ کا قدم چوما تھا، اس حوالے سے ایک بات کا تذکرہ یہاں کردوں تو شاید ہی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ آج سے چند سال پہلے حجاز مقدس (بطور خاص مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور جدہ) میں ایک فتنہ نے سر اٹھایا تھا، کہ روہنگیا برادری میں سے ایک چھوٹی سی ٹولی نے حجاز مقدس کے کچھ علماء نما منحرف عناصر کے شہ پاکر اور ان کے مخصوص تعاون سے مذہب احناف اور بطور خاص علمائے دیوبند کو سب وشتم اور گالم گلوج کا نشانہ بنانا شروع کردیا تھا، اور ان کی توہین وتذلیل میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی تھی، اور یہ ٹولی اتنی اترانی شروع کردی تھی کہ جن کو دیکھ کر کسی بھی ایماندار انسان کی رگ حمیت وغیرت، عقیدت ومحبت میں آگ سلگ سکتی تھی۔

ایسے حالات میں مولانا حسین احمد صاحب حجاز مقدس تشریف لے گئے، اور آپ کے چند دوستوں اور رفقائے کار نے اس شیطانی وابلیسی فتنے کی طرف توجہ دلائی، ویسے آپ اس فتنے کی سرکوبی کے لئے تیار ہوگئے تھے۔

لیکن یہاں ایک افسوس کی بات بھی ہے کہ اس شیطانی تولی کے جو بھی لوگ تھے، ان کی اکثریت یا تو طلبہ اور وہ بھی ثانوی درجے کے تھے، اور جو علماء نما تھے وہ بھی تقریبا علم وفن سے عاری، تو ایسے

لوگوں سے مناظرہ کرے بھی تو کیا خاک کرے؟ پھر مولانا نے ان کو مناظرے کی برملا دعوتیں دیں، لیکن وہ حاضر ہی نہیں ہوتے تھے، آخرکار ان کو ایک مجلس میں حاضر ہونے پر مجبور کیا گیا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی حاضر ہوئے، ابھی بات شروع ہوئی تو وہ لوگ آپ کے سامنے گفتگو ہی کیا کرتے اور زبان ہی کیا کھولتے بلکہ آپ نے جس علمی زبان میں گفتگو شروع کی وہ بھی ان کی سمجھ سے باہر تھی، آخرکار وہ سارے خجل ہو بھاگے تھے، ویسے آپ کی کوشش سے اس فتنہ کی خاصی سرکوبی ہوچکی تھی۔ اس حوالے سے میں نے ایک جگہ میں لکھا تھا کہ:

> ”گئی صدی کی آخری دہائیوں سے لے کر سرزمین مقدس میں روہنگیا برادری میں پائے جانے والے چندان طالب علموں جو یا علم وفن کے اعتبار سے ناپختہ تھے، یا سرزمین مقدس میں پائے جانے والے نام نہاد چند شرپسند شیوخ سے متأثر تھے نے شدید قسم کے فتنے کھڑے کئے رکھے تھے، جن کے سدباب کے لئے برصغیر کے چند بڑے بڑے علمائے کرام نے کوششیں کی تھیں، جن میں بنگلا دیش کے حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب (سابق نائب مہتمم جامعہ اسلامیہ پٹیہ) پیش پیش تھے، اس سلسلے میں ارکان کے اور ایک عالم صاحب نے بھی اپنے انداز میں کوشش کی تھی، لیکن ان کو اس حوالے سے خاصے ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا تھا“۔

اس سلسلے میں ایک بات کا تذکرہ کردوں کہ مولانا حسین احمد صاحب کی طرح ہماری برادری کے ایک مولانا صاحب جن کا نام یہاں لینا مناسب نہیں سمجھ رہا ہوں نے بھی اس مذکورہ فتنے کی سرکوبی کے لئے کوشش کی تھی لیکن ان دونوں کی کوششوں میں ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ مولانا حسین احمد صاحب کی کوشش عین حکمت اور دانائی پر مبنی تھی، آپ نے حالات کے تقاضے اور وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کافی بصیرت اور فراست سے کام لیا تھا، جب کہ مؤخر الذکر مولانا صاحب کے اندر سرے سے ایسی صلاحیت اور فہم وفراست کا فقدان تھا، یوں کام بھی ہوا اور مولانا حسین احمد صاحب ان شرپسندوں کی شرارت سے کسی قدر بچنے میں ایک وقت کے لئے کامیاب ہوگئے تھے، جب کہ ان مولانا صاحب کو ان شرپسندوں نے عین موقع پر ایسا پھنسایا کہ اور تو اور ان کو سعودی عرب میں تقریبا پانچ سالوں تک قید وبند

کی زندگی گزارنی پڑی تھی، بہر حال پھر بھی مولانا صاحب داد تحسین کا مستحق ہیں کہ انہوں نے فتنے کے سد باب کے لئے کوشش کی، اوراس راہ میں اپنی زندگی کا ایک حصہ بطور نذرانہ پیش بھی کیا تھا۔

مولانا حسین احمد صاحب کی زبان میں روانی کے ساتھ ساتھ ضروری مقامات میں طغیانی بھی ہوا کرتی ہے، علاوہ ازیں باتوں اور گفتگو میں تسلسل اور ترتیب بھی، اس حوالے سے ہماری برادری کا وہ مولانا صاحب (جن کا تذکرہ ابھی ابھی گزر چکا ہے، اور جس کے متعلق اس کے بعض حواریوں کا دعوی ہے کہ وہ ایک بڑے عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مجاہد، مناظر، باحث، منطقی اور کلامی ہیں) کے کلام اور گفتگو اور جدلیاتی مباحث میں ترتیب شاید ہی پائی جاتی ہو، لیکن تسلسل، روانی اور طغیانی نہیں پائی جاتی ہے، مولانا کے مقابلے میں یا دوسرے الفاظ میں آپ کی بہ نسبت ان مولانا صاحب کی زبان میں ایک قسم کی لکنت اور گونگا پنی پائی جاتی ہے، اور کبھی کبھار نا قابل صبر حد تک ان کی گفتگو میں بھاری پن اور ٹھہراؤ پایا جاتا ہے، شاید ان کم زوریوں کی وجہ سے وہ دنگل کے معرکوں میں ناکام ہوا کرتے تھے، پھر بھی وہ اوران کے بعض ناسمت شناس حواریوں کا دعوی تھا اور ہے کہ وہ مولانا صاحب بڑے کامیاب مناظر ہیں، اور صرف بات اتنی ہی نہیں ان کے دعوی کے مطابق ان جیسے عالم ارکان کی کسی ماں نے پیدا ہی نہیں کیا ہے، لیکن میں نے تو ذاتی طور پر ان کو کسی بھی معرکہ میں آج تک سرخرو ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، خدا ان مولانا صاحب کی حیات میں برکت دے، اور اگلے دن اگر زندگی ہے تو دنگل سے سرخرو ہو کے واپس آنے کی توفیق سے نوازے۔

مولانا حسین احمد صاحب کی اس کوشش میں آپ کے استاد حضرت مولانا مفتی عبدالرحمن صاحبؒ سابق نائب مہتمم جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے تعاون اوران کی نیک دعائیں شامل حال تھیں، مفتی صاحب نے آپ کو نہ صرف تعاون کیا بلکہ آپ نے مولانا محترم کے سر پر ایک طرح کی ذمے داری ڈالی تھی کہ کسی بھی طریقے سے اس فتنے کی سرکوبی کی جائے، تا کہ سرزمین پاک میں علمائے اہل السنت والجماعت کی لاج رہے۔ مفتی صاحب کے علاوہ اس حوالے سے مولانا محترم کو حضرت علامہ مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) کی تائید اور دعائیں بھی حاصل تھیں، اس حوالے سے میں نے ایک دوسری جگہ میں یوں لکھا تھا کہ:

"جہاں تک میرا علم ہے کہ ۲۰۰۳ء کے دوران اور اس کے بعد کے عرصے میں حضرت مولانا مفتی عبدالرحمن صاحب ہاٹھزاروی کے شہ پر یا ان کے بھرپور تعاون سے مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب بھی ان سر پھرے نوجوانوں کی جانب سے اٹھائے گئے فتنوں کے سد باب کے لئے میدان میں کود پڑے، جس میں آپ کے مرشد حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) کی دعائیں وتوجیہات بھی بڑی حد تک تھیں، تو آپ نے ان شر پسندوں پر ایسا وار کیا کہ جس کی تاب نہ لا کر ان شر پسندوں کی اکثریت تائب ہو گئی، اوران میں سے کٹر قسم کے نوجوان جو دراصل کسی مفاد پرستی کے دلدل میں پھنس چکے تھے، وہ بھی ایک طویل مدت تک کے لئے میدان سے غائب ہو گئے تھے"۔

دراصل انسانی زندگی میں پیٹ بھرنے کی مصیبت بھی بسا اوقات انسان کو راہ اعتدال سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیتی ہے، ہماری برادری کے ان شر پسند نوجوانوں کے ٹولوں کی جو حالت تھی، اب بھی ان کی یہی حالت جوں کا توں باقی ہے، مصیبت یہی تھی کہ ان میں سے بعض لوگ شر پسند عناصر کے شکار تو تھے ہی، اوران میں سے بعض لوگ قادیانیوں، احمدیوں، پرویزیوں اور تو اور بعض ذرائع کے مطابق انسانیت کے دشمن یہودیوں کے نرغے میں بھی آ چکے ہیں، جو اسلام اور انسانیت کے دشمنوں کے چیلے، گماشتے اور حواری بن کر اسلامیان ارکان پر پے در پے حملوں میں ملوث ہیں، کسی زمانے میں ان کی یہی شر پسندی سعودی عرب میں پائی جانے والی ہماری برادری تک محدود تھی، لیکن اب تو بنگلا دیش اور پاکستان کے علاوہ اندرون وطن ارکان میں بھی ان کی شر پسندی پھیلی ہوئی ہے، خاص طور پر ہماری برادری کے مابین ایسے ایسے فتنے اٹھاتے پھر رہے ہیں کہ جنہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس حوالے سے سب سے بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ آج سے چند سال پہلے سے ہماری برادری کے چند ارکانی علماء نما لوگ اپنی نجی زندگی کو پر رونق دیکھنے یا بنانے کی خاطر اندرون وطن یا سر حدی علاقہ جات میں اس فتنے کی پرچار میں ملوث ہیں، خدا ان کو ہدایت دے۔

مولانا کی ایک تعمیری سوچ

مولانا حسین احمد صاحب جس آن بان کے عالم دین ہیں، ان سے کوئی تخریبی سوچ تو ہو ہی نہیں سکتی، جہاں تک دیکھا اور اندازہ کیا گیا کہ آپ کی سوچ و بچار ہمیشہ تعمیری ہوا کرتی ہے، جو ایک صحیح معنی کے عالم دین سے متوقع ہے، اس حوالے سے یہاں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں کہ:

''غالباً ۱۹۹۳ء کے موسم بہار کا واقعہ ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب بعد نماز عصر اپنے چند شاگردوں جن میں راقم بھی تھا، ہوا خوری کے لئے اپنی رہائش گاہ سے نکلے، دراں حالیکہ آپ کی رہائش گاہ چاند گاؤں، چاٹگام بلاک بی کی تیسری گلی پر تھی، ابھی ہم آپ کے ساتھ راستے پر ٹہل رہے تھے، ادھر سامنے سے آنے والا ایک فقیر منش (بھکاری) جس کی عمر تقریباً ستر سال سے کم نہیں تھی، اور جس کے چہرے پر سفید اور متدین داڑھی بھی تھی نے آپ کے آگے ہاتھ پھیلایا تو آپ اور آپ کے بعض شاگردوں نے اس فقیر کی بساط بھر خدمت کی، اب اس فقیر نے اپنی زبان کھولی اور کہنے لگا کہ ''یہ دنیا بہت بری ہو چکی ہے، اگر مجھ میں شکتی ہوتی تو میں اس دنیا کو الٹ دیتا'' اب آپ سے رہا نہیں گیا اور اس سے پوچھا کہ بابا جی کیا وجہ ہے کہ آپ دنیا اور اہل دنیا سے اتنے نالاں اور برہم ہیں؟ تو اس فقیر نے بولا کہ مجھے اس جہاں میں ایک بھی انسان نظر نہیں آتا، اب اتنی سی بات کے اختتام پر آپ نے اس فقیر کو کچھ مثبت انداز میں سنجیدگی کے ساتھ نصیحت کرتے ہوئے رخصت کیا، پھر ہمیں فرمانے لگے کہ دیکھو بھائیو! دنیا اور اہل دنیا کے متعلق یہاں اور تو اور ایک فقیر آدمی تک کی کیا سوچ ہے، ظاہر ہے کہ وہ ایک بھکاری ہے، عمر رسیدہ اور متدین داڑھی والا ہے، اس ایک آدمی کے تخریبی ذہن سے آپ اور ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ دنیا میں تخریبی ذہن رکھنے والے انسان کتنے ہوں گے، اور ان کے مقابلے میں تعمیری ذہن رکھنے والے کتنے، آج اس طرح کی تخریبی ذہنیت کی وجہ سے ہمارے معاشرے ہر کجا خسارے پر خسارے اٹھا رہے ہیں''۔

اس فقیر منش کے ساتھ مولانا کی گفتگو اور اس کے معا بعد آپ کے مذکورہ بیان نے میرے دل پر خاص اثر کیا تھا، الحمد للہ اس کا اثر تا دم تحریر باقی ہے، اور خدا کرے تو زندگی بھر باقی رہے گی، سچ بتاؤں تو بات یہی ہے کہ اس واقعہ سے پہلے میرا ابھی ذہن کچھ اس طرح کا تھا کہ اس جہاں میں اچھے انسانوں کی تعداد کم اور برے لوگوں کی زیادہ ہے، مگر حقیقت میں بات ایسی بالکل نہیں ہے، بلکہ سرے سے اس کی برعکس ہے، بھلا! بروں کی تعداد اگر ایک منٹ کے لئے زیادہ بھی مان لی جائے، تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس فقیر آدمی کی ذہنیت کے مطابق اس جہاں کو زیر و زبر کر دیا جائے۔

کون نہیں جانتا کہ اس جہاں میں جتنے بھی انبیاء علیہم السلام تشریف لائے، اور جتنے بھی اولیاء اللہ اور صلحاء گزرے اور جتنی بھی نفوس قدسیہ اہل دنیا اور مخلوق خداوندی کی خدمات انجام دے کر راہی ملک بقاء ہوئے، وہ سارے کے سارے تعمیری ذہن کے تھے، دنیا اور اہل دنیا کی خیر خواہی ان کا مقصد تھا، آج کس کی جرأت ہو سکتی ہے کہ ان نفوس قدسیہ میں سے ایک کو بھی تخریبی ذہن کا ثابت کرے، اور یہ ثابت کرے کہ ان کی زندگیاں اور سرگرمیاں مخلوق خداوندی کی عدم خیر خواہی پر مشتمل تھیں۔

غرض مولانا محترم کی تقریر سے راقم نے زندگی بھر کے لئے ایک اہم اصول پا لیا، کہ انسان کو اس جہاں میں ہمیشہ ہمیشہ تعمیری ذہنیت کا ہونا چاہئے اور تخریبی ذہنیت رکھنا تو دور کی بات بلکہ تخریبی ذہنیت رکھنے والوں کو راہ راست پر لانے کی جدوجہد اور کوششیں کرنی چاہئے، جو دراصل نفوس قدسیہ (جن میں تمام انبیاء، اولیاء، اور صلحاء شامل ہیں) کے نقوش قدم پر چلتے ہوئے اس جہاں اور جہاں والوں کی خیر خواہی کی بنیاد پر ہر حال میں بھلائی کے لئے سوچنا چاہئے۔

بعض عادات واطوار

محترم مولانا حسین احمد صاحب سچی بات کے (چاہے اپنے باپ کے منہ پر کیوں نہ کہنا پڑے) بڑے رسیا ہیں، اس حوالے سے آپ کے بعض احباب، رفقائے کار اور چاہنے والوں کی یہی شکایت ہوتی ہے کہ آپ بڑے منہ پھٹ انسان ہیں، آپ کو جہاں تک میں نے دیکھا کہ آپ کی بعض دل شکن باتیں بسا اوقات لوگوں کی دل آزاری کا سبب بھی بن جاتی ہیں، جن کی وجہ سے آپ

کے انگنت احباب اور رفقائے کار اور آپ کو دل سے چاہنے والے آپ سے بگڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روٹھ گئے تھے، کبھی کبھار آپ کو دیکھا بھی گیا تھا کہ آپ کی ان دل شکن باتوں کی وجہ سے جو لوگ آپ سے روٹھ جاتے ہیں ان پر آپ افسوس بھی کیا کرتے ہیں، اور تو اور آپ کو اس بات کا اعتراف بھی ہے کہ آپ کی بعض باتیں لوگوں کی دل آزاری کا سبب بن جاتی ہیں، لیکن کیا کریں کہ تیر تو کمان سے نکل چکا ہوتا اور ٹھیک نشانے پر جا گزین بھی ہو جاتا ہے، ایسے حالات میں جتنے بھی علاج کئے جائیں بے حاصل اور بے سود ہوا کرتا ہے۔

آپ کی زندگی میں آپ کے کتنے احباب اور رفقائے کار تھے، جنہوں نے آپ کی ایسی دل شکن، دل آزار اور ناعاقبت اندیشانہ باتوں ہی کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے آپ سے روٹھ کر کسی دوسری اندھیر نگری میں گھر بسا لئے تھے، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بعض حضرات آپ کے خلاف بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اور ہر محاذ پر آپ کے خلاف بھی اتر آئے ہیں، جن کی وجہ سے بعض حالات میں آپ کو کافی خسارے اور نقصانات کا منہ بھی دیکھنا پڑا تھا۔

آج کل بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ماشاءاللہ تعالی آپ اپنی اس قسم کی حالت پر کافی سدھار لا چکے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ ''میری آرزو یہی ہے کہ میری وجہ سے کسی کا کبھی اور کہیں دل نہ دکھے، اور میری کسی بات اور کوئی حرکت لوگوں کی دل شکنی اور دل آزاری کی باعث نہ بننے پائے'' حال ہی کی بات ہے کہ اس حوالے سے آپ کو کافی حد تک بدلا سا نظر آیا، اور دعا ہے کہ خدا اپنے خاص فضل وکرم سے آپ کو مزید توفیق سے نوازے۔

اسی طرح مولانا محترم کے بعض احباب اور خیر اندیشوں کی آپ سے یہی شکایت بھی رہی ہے کہ آپ بسا اوقات بلا وجہ لوگوں پر گرفت اور غیر ضروری تنقیدیں کیا کرتے ہیں، آپ جس پائے کی شخصیت ہیں، آپ اپنے قریبی معاصرین میں سے شاید ہی کسی کو اپنے معیار پر اترے ہوئے پاتے ہیں، چاہے کہ ان معاصرین کا تعلق کسی میدان کارزار سے ہو یا کہ بزم علم وادب سے، کوئی بھی آپ کے معیار پر اترنے نہیں پاتا ہے، یوں ظاہر ہے کہ انبیائے کرام کے علاوہ کون سا انسان اس جہاں میں کامل ومکمل ہوا ہے؟ عام انسان تو اس کے جوہر میں غلطیوں، خامیوں، کوتاہیوں اور

لغزشوں کا معجون مرکب ہوتا ہے۔

بھلا تنقید اگر مثبت ہو تو کوئی بری چیز بھی کیسی ہو سکتی ہے؟ لیکن اس کا ایک سالم اور معتدل اصول اور کارآمد ضوابط ہوتے ہیں، اور تنقید برائے تنقید ہونے کے بجائے تنقید برائے اصلاح وتعمیر ایک لازمی امر ہے، ورنہ ناقد بذاتِ خود ایک مقام پر جا کر دوسروں کی تنقید کا نشانہ بن جاتا ہے، اور اس کی تنقید اس کی زندگی کے لئے ایک زہر ہلاہل ثابت ہو جاتی ہے، آج کی دنیا میں صرف اور صرف تنقید خود ناقد کے لئے کوئی اچھی چیز نہیں رہی ہے، تنقید برائے رشد وہدایت، اصلاح وخیر خواہی ضرور بھلی مانی جاتی ہے، لیکن بعض خیر اندیشوں کے مطابق مولانا حسین احمد صاحب کی کوئی بھی گرفت وتنقید بس تنقید برائے تنقید ہوا کرتی ہے، جس سے لوگوں کے فائدے کے بجائے الٹے نقصان یقینی ہے، اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ایسی تنقید کی وجہ سے خود آپ کی ذات بھی پریشانیوں کی شکار ہو جاتی ہے، بعض احباب کا کہنا ہے کہ آج کل آپ کی ایسی بے جا تنقید اور گرفت کرنے والی ذہنیت میں کافی کمی آچکی ہے، خدا کرے کہ بات کلی طور پر صحت پر مبنی ہو۔ علاوہ ازیں مولانا کی بعض دیگر عادات واطوار پر کچھ باتیں ہیں کہ:

۱۔ مولانا حسین احمد صاحب بڑے نستعلیقی ذوق کے عالم ہیں، آپ اپنی نجی اور خانگی زندگی میں ہوں یا اجتماعی اور سیاسی زندگی میں، غرض ہر کجا ایک نستعلیقی ذوق کا انسان ثابت ہوئے ہیں، آپ اپنے گھر کی ہر ایک چیزوں کو برمحل مقام پر رکھنے کے عادی ہیں، گھر صاف ہو اور کتابوں کی الماریوں کے علاوہ تمام الماریاں شفاف ہونا چاہتے ہیں، کتابوں کی الماریوں میں اگر کسی نے کوئی کتاب ٹھیک سے اور برمحل مقام پر نہیں رکھی تو آپ خاصے پریشان ہو جاتے ہیں، اور اس کی اس کرتوت کو بدذوقی سے تعبیر کرتے ہیں، میرے نزدیک یہ ایک اچھی بات ہے۔

۲۔ مولانا کی ایک عادت شریفہ یہ بھی ہے کہ آپ اپنی کسی بھی گفتگو کے دوران ہر سامع سے چاہتے ہیں کہ ہمہ تن گوش ہو کر سنے، دوران گفتگو اگر کسی پرندے نے بھی پر مارا، یا کسی نے بے جا حرکت کی تو آپ کے چہرۂ زیبا میں ناراضگی، خفگی اور برہمی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں، اور بسا اوقات آپ اپنی خفگی کا برملا اظہار بھی کر دیتے ہیں، اور اگر کوئی قریبی ساتھی ہو تو ڈانٹ ڈپٹ سے بھی کام لیا کرتے ہیں۔

۳۔ مولانا کو وقت کے پابند بہت ہی کم دیکھا گیا،صرف یہی نہیں بلکہ میرے خیال میں آپ وقت کے ساتھ چلنے کے بجائے وقت کو اپنے ساتھ چلانے کے خواہش مند ہیں، ویسے کوئی بھی کام آپ سے بر وقت یا وقت کے مطابق ہو نہیں پائے تھے،کم سے کم آج کا کام کل کے لئے اور کل کا کام مدتوں کے لئے ٹلتا رہتا ہے، میرے خیال میں آپ جیسی ایک بڑی شخصیت کی یہ ایک بڑی کم زوری ہے، جو کبھی بھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتی ،خدا کرے کہ آپ کو اس کا احساس بھی ہو جائے ، یاد رہے کہ یہ شکایت آپ سے صرف میری نہیں ،اس حوالے سے چند دیگروں کو بھی ایسی شکایتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

۴۔ بایں ہمہ مولانا محترم احقاق حق اور ابطال باطل کے حوالے سے نہایت سخت مزاج کے انسان ہیں، اس باب میں کسی بڑے سے بڑے قوت دار اور مال دار اور کسی بھی صاحب شوکت واقتدار کی پرواہ بالکل نہیں کرتے ہیں، سچی بات جو آپ کی دانست میں سچی ہوتی ہے برملا کہہ دیتے اور سب کے سامنے اظہار کر دیتے ہیں، اس ضمن میں جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ چھوٹے بڑے اور امیر و غریب کو ایک ہی سطح پر رکھنے کے عادی ہیں، غرض کلمۂ حق کے مقابلے میں کسی کا رورعایت کرنا اور اس حوالے سے کسی کے سامنے جھکنا آپ سرے سے جانتے ہی نہیں ہیں۔

۵۔ مولانا محترم سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی شخص آپ کے سامنے اگر کوئی غلط بات یا کوئی غلط لفظ بول دیتا ہے تو کسی نہ کسی طرح سے آپ اس کی اصلاح یا غلط کی جگہ صحیح بتادینے کو بروقت کوشش کرتے ہیں، بسا اوقات آپ کی یہی عادت شریفہ آپ کے غیروں کے سامنے بھی ظاہر ہو جاتی ہے، غرض آپ کسی بھی غلط بولنے والے کو چھوڑتے نہیں ہیں، آپ کی اس طبیعت سے بعض لوگ پریشان بھی ہو جاتے ہیں، شاید آپ کو اپنی اس عادت سے پیدا ہونے والے نتائج کا علم بھی ہو، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی پرواہ بہت کم ہی کیا کرتے ہیں۔

۶۔ مولانا نہایت نازک مزاج اور کسی قدر غصیلے انسان نکلے ہیں، کسی کی ذرا سی خلاف طبیعت بات اور حرکت سے آپ کا موڈ یا طبیعت فورا بدل جاتی ہے، ویسے آپ بڑی جلدی سے تیش میں آجاتے ہیں، سچ بتاؤں تو بات یہی ہے کہ آپ کسی قدر جلالی طبیعت کے انسان ہیں، اصل میں بات یہ ہے کہ آپ کے مزاج اور افتاد طبع میں کافی حد تک تضاد پایا جاتا ہے، کبھی کبھار ہلکی سی بات کو بھی برداشت کرنا

آپ کی بس کی بات نہیں ہوا کرتی ہے، جب کہ اس کے برعکس کبھی کبھار آپ کو غایت درجہ متحمل، حلیم الطبع، متواضع اور نرم مزاج کا انسان نظر آتا ہے، اور مؤخر الذکر ایسے حالات میں آپ ہر ایک کی سنتے اور اس کی ذہنی سطح پر اتر کر گفتگو کرتے ہیں، اور تیز کلامی اور تلخ نوائی سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں۔

ایک فقیر نما جاہل کے ساتھ

برصغیر ہندو پاک میں عموما اور بنگلا دیش میں خصوصا فقیر نما جاہلوں اور اوباشوں کی کوئی بھی کمی نہیں ہوتی ہے، یہاں ایک مصیبت یہ بھی ہوتی ہے کہ عموما جہلاء ان فقیر نما اوباشوں کو اللہ تعالی کے ولی اور بر گزیدہ ہستی سمجھ کر ان کے سامنے منتیں کیا کرتے ہیں، جس سے فائدہ اٹھا کر یہ اوباش لوگ ہر کجا انسانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو کچھ دینے سے مرادیں پوری ہو جاتی ہیں۔

ایک روز کا واقعہ تھا کہ میں مولانا کے ساتھ ایک عام گاڑی پر سوار ہو کر چاٹگام شہر کے اندر کہیں جا رہا تھا، ہمارے بغل والی کرسی پر ایک فقیر نما جاہل (دیکھنے میں اس کی شکل وصورت وہی تھی، جو عام طور پر ایسے بد بخت لوگوں کی ہوتی ہے) بھی سوار تھا، جو لوگوں سے پیسے مانگ رہا تھا اور عام لوگ بھی اس کو کچھ نہ کچھ دے رہے تھے، آخر میں اس نے مولانا کے سامنے ہاتھ پھیلایا، اور ایک عجیب انداز میں کہنے لگا کہ مجھے دو تو تمہاری مرادیں پوری ہو جائیں گی، اس کے جواب میں آپ نے کہا کہ تم مجھے دو تو تمہاری مراد پوری ہو جائے گی، آپ کا یہ جواب سن کر وہ فقیر نما جاہل بھڑکا، اور کہا کہ اگر نہیں دو گے تو میں تجھے جلا کر خاکستر کر دوں گا، جواب میں آپ نے بھی وہی فرمایا، اب وہ بڑے خفیف ہو کر گاڑی سے اتر گیا، اب آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ ایسوں کی راہ روکی جائے اور ان کو راہ راست پر لانے کی کوششیں کی جائیں ورنہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ لوگ انسانوں کو گم راہ کر کے صرف اور صرف پیٹ بھرنے کی خاطر کیا کیا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہیں، ہمیں دین اسلام کو سمجھنا چاہئے، ورنہ یہ لوگ انسانوں کو مزید گم راہ کریں گے۔مولانا کی تقریر سن کر سوار لوگ بڑے محظوظ ہوئے، ان میں سے بعض حضرات یہاں تک کہنے لگے کہ عالم ہو تو ایسا، کاش ہمارے ملک کے سارے علمائے کرام ایسے ہوتے تو ہماری حالت کب کی بدل چکی ہوتی ، افسوس ہے کہ خود علمائے کرام میں بھانت

بھانت کے عقائد کے حامل پائے جاتے ہیں، ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ جوان جیسے لوگوں کی حمایت پر تلے ہوئے ہیں۔

کوکس بازار کی ریسٹورنٹ میں

ایک روز کا واقعہ تھا کہ میری ملاقات محترم مولانا حسین احمد صاحب کے ایک شاگرد سے ہوئی، جس نے عرصۂ دراز تک آپ کے قریب رہ کر آپ سے استفادہ کیا تھا، آج کل اندرون وطن میں ہیں، دینی کاموں کے ساتھ ماشاء اللہ جڑے ہوئے ہیں، جنھوں نے کوکس بازار کی ایک ریسٹورنٹ میں اپنی آنکھوں دیکھا حال راقم سطور سے یوں بتایا ہے کہ:

’’ایک روز میں مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے ساتھ کوکس بازار کی ایک اچھی اور معروف ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہا تھا، ہمارے کھانے کے دوران سامنے والے میز پر چند سر پھرے نوجوان بھی کھانا کھا رہے تھے، اور ساتھ ساتھ ایسی رنگ رلیاں بھی کر رہے تھے جو عام جوانوں اور نوجوانوں کی عادت ہوتی ہے، جس سے ایک شریف انسان کو بھور سا محسوس ضرور ہوا کرتا ہے، اب آپ نے اپنے کھانے کی فراغت کے آخر میں سنت کے مطابق اپنا برتن صاف کیا، اور انگلیاں بھی چاٹیں، یہ دیکھ کر یہ نوجوان ہنس رہے تھے، اور تمسخر بھرے انداز میں اپنی اپنی جسمانی حرکتوں کے ذریعہ یہی بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ مولوی لوگ کھانے کے حوالے سے کتنے نادان اور غیر مہذب ہوا کرتے ہیں، کھانے بھی سب کچھ کھا لیتے اور آخر میں برتن اور انگلیاں تک نہیں چھوڑتے، مولانا ان کی حرکات و سکنات کو بڑے پرسکون انداز میں دیکھ رہے تھے، یہ جتنے تمسخر کر رہے تھے، آپ برتن اور انگلیاں چاٹنے میں اتنی دیر کر رہے تھے، اور آپ نے اپنے کھانے سے فراغت کے بعد ان نوجوانوں پر برسنا شروع کر دیا، اور بتایا کہ کیا تم مسلمان نہیں ہو؟ کیا تمہیں تمہارے ماں باپ اور تمہارے استادوں نے دین کے متعلق کچھ بھی

نہیں سکھایا؟ یہ ایک مسلم ملک ہے، یہاں تمہاری اتنی جرأت کہ تم سر عام سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑا رہے ہو؟؟ ویسے الحمد للہ کہ مولانا کا ان پر یہی برسنا کام آیا، اور سارے شرمندہ ہو کر معافی مانگنے لگے تھے، آخر میں آپ نے ان کو کچھ نصیحتیں کیں، اور چھوڑ دیا تھا‘‘۔

گاڑی میں فلم دیکھنے والوں کے خلاف اقدام

مولانا حسین احمد صاحب کوئی شک نہیں ہے کہ ایک بہادر، نڈر اور غیور و جرأت مند عالم دین ہیں، اس سلسلے میں مولوی محمد قاسم بن محمد سلیمان صاحب ہولی مرنگی، بوسیدنگی (۱) (جو راقم کے قریبی ساتھی اور ہم سبق تھے اور مولانا محترم کے شاگرد بھی) نے اپنی آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کیا کہ:

’’ایک روز میں مولانا کے ساتھ چاٹگام سے گاڑی پر سوار ہو کر کوکس بازار کو جا رہا تھا، ابھی ہماری گاڑی چاٹگام کو پیچھے چھوڑ کر کچھ دور نکل چکی تو ڈرائیور نے اس گاڑی میں نصب ٹیوی میں ایک انڈین فلم چلا دی، ظاہر ہے کہ ایک گاڑی میں سوار مرد و خواتین کے علاوہ مختلف طبقات کے افراد اور نیک و شرفاء بھی ہوتے ہیں، بہر حال فلم چلا دی گئی تو آپ نے بڑی دیر تک صبر کا مظاہرہ کیا، اب ایک موقع پر فلم

---

(۱) مولوی محمد قاسم بن محمد سلیمان بوسیدنگ شہر کی مغربی جانب واقع بستی ہولی مرنگ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنی بستی میں پاکر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، یہاں سے جماعت اولی تک کی تعلیم پاکر ایک روایت کے مطابق چاٹگام بنگلا دیش کی معروف دینی و روحانی مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں داخلہ لیا، جہاں سے دورۂ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد وطن واپس لوٹے اور حضرت مولانا شاہ ابوسعید صاحب کی بڑی لڑکی سے شادی کی، پھر بعد میں جامعہ اسلامیہ عالیہ کے مدرس بھی مقرر ہوئے تھے۔ مولوی صاحب ایک بہادر اور قومی حمیت رکھنے والے انسان ہیں، عرصۂ دراز تک راقم سطور کے ہم جماعت بھی رہ چکے، انہوں نے مولانا حسین احمد صاحب سے مدرسہ معین الاسلام اور دار المعارف کے دوران تعلیم استفادہ کیا تھا، عربی لکھنے اور بولنے کی بھی بڑی کوشش کرتے تھے، نہ جانے اس میں کتنی ترقی ہوئی، شنید ہے کہ اندرون وطن موجود ہیں۔

میں ایک ایسا منظر آیا کہ جسے دیکھ کر کسی بھی ایک انسان کی انسانیت اور اخلاق شرما سکتا ہے، ویسے آپ کو رہا نہ گیا، اور ایسے گرجے کہ گاڑی میں بھونچال سا آ گیا تھا، ہر کوئی آپ کی طرف دیکھ رہا تھا، اور آپ کی اس غصیلی حالت کو دیکھ کر ڈرائیور بھی خوف زدہ ہو گیا، اور اس نے فوراً فلم کا چلانا بند کر دیا، اور تو اور مجھے بھی آپ کی اس حمیت دینی اور اخلاقی تقاضے اور جرأت کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، اور اندازہ ہوا کہ آپ دینی اعتبار سے کتنے غیرت مند انسان ہیں''۔

بیعت وارادت

مولانا حسین احمد صاحب نے ۲۰۰۳ء کے دوران حضرت مولانا الحاج قاری شاہ مظفر احمد صاحب منگیز وی رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے، یوں بھی تو ظاہر ہے کہ آپ ایک جلیل القدر عالم دین ہیں، مولانا شاہ مظفر احمد صاحب سے بیعت کے بعد عبادت وبندگی اور ذکر وشغل کے حوالے سے آپ کو خاصے سرگرم دیکھا گیا تھا۔

مولانا حسین احمد صاحب طالب علمی کے دورن اور اس کے بعد بھی بعض امور کے حوالے سے حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب پر بڑے احترام کے باوجود بھی کچھ اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، لیکن جہاں تک معلوم ہوا اور آپ کو دیکھا بھی گیا ہے کہ اس بیعت کے واقعہ کے بعد مولانا نے اپنے مرشد کے حوالے سے اپنی سابقہ آراء سے کافی حد تک رجوع کر لیا، ورنہ اندازہ ہے کہ مولانا جس قسم کی آراء وخیالات اپنے مرشد پر رکھتے تھے، ان سے رجوع کئے بغیر آپ حضرت کے حلقۂ ارادت میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

اس سلسلے میں مولانا حسین احمد صاحب کے بعض احباب نے آپ سے گفتگو (ان احباب کے بیان کے مطابق) کی تھی، اور عرض کی گئی تھی آپ نے ایک ایسے شیخ کے ہاتھ میں بیعت کیوں کی جن کے بعض کردار، سرگرمیاں، طرز معاشرت، فکر وخیالات اور طرز زندگی آپ کی سمت مخالف ہے، مثال کے طور پر:

۱۔ آپ (مولانا حسین احمد صاحب) جماعت تبلیغ کے زبردست حامی اور طرف دار، جب کہ آپ

کے شیخ حضرت شاہ مظفر احمد صاحب جماعت تبلیغ کے بڑے ناقد ہیں، اور اس حوالے سے حضرت کی زندگی میں بہت ساری باتیں سنی گئی تھیں؟۔

۲۔ آپ سرزمین ارکان میں اس وقت بھی جہاد وقتال کے حامی اور طرف دار تھے اور ماشاء اللہ تعالی اب بھی ہیں، جب کہ حضرت شیخ مولانا شاہ مظفر احمد صاحب اس وقت جب آپ بیعت کر رہے تھے، جہاد وقتال سے بڑے نالاں اور برگشتہ؟؟۔

۳۔ آپ غلامی کے ایک ایک لمحہ کو بھی موت کی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں، جب کہ حضرت شاہ صاحب ایسے حالات میں صبر وثبات کو مصلحت زمانہ اور تقاضائے وقت سمجھتے تھے، اور ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب اس مصلحت پسندانہ رویے پر سدا قائم اور کاربند تھے؟؟؟۔

مولانا کے ان احباب کے بیانات کے مطابق آپ نے ان کے سارے سوالات کے ایک ایک کر کے جوابات دیئے تھے، کوئی تسلی بخش نہیں تھے، شاید اس حوالے سے آپ نے ان اپنے احباب سے خطیبانہ انداز میں گفتگو نہیں کی ہوگی، ورنہ آپ کو جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ کے جوابات چاہے جس کسی بھی موضوع پر کیوں نہ ہوں، ناقابل قبول ہونے اور تشنہ رہ جانے کا سوال بھی نہیں اٹھتا، بہر حال ان احباب کا بیان ہے کہ مرشد ومرید کے درمیان مسلک ومشرب کی یکسانیت کے علی الرغم طریقہائے فکر وخیال اور طرز زندگی میں یک رنگی اور ہم آہنگی ایک امر لازمی ہوتا ہے، ورنہ افادہ و استفادہ کی جدوجہد ایک سعی لاحاصل کے سواء اور کچھ بھی نہیں ہوتی، شاید یہاں مرشد ومرید کے مابین یہی یکسانیت رہی ہوگی، واللہ اعلم۔

بہر صورت جہاں تک میں نے اندازہ کیا کہ مولانا کے یہ احباب اور چاہنے والے آپ کے بڑے مخلص تھے اور ہیں، جن کا خیال تھا کہ مولانا حسین احمد صاحب کی زندگی اور طرز معاشرت میں رہ رہ کر جو افراط وتفریط اور بے اعتدالیاں (ان کے مطابق) ہوتی تھیں، ان کا محرک ومحور ایک مرشد کامل کے سامنے آپ کا سر تسلیم خم نہیں کرنا تھا، جس کا احساس خود مولانا کو بھی تھا، اور جہاں تک مجھے یاد ہے کہ اس حوالے سے آپ نے اپنی بعض مجالس میں اظہار خیال بھی کیا تھا۔ بہر حال بات یہی ہے کہ ایک مرشد برحق کے ہاتھ پر بیعت کرنے اور ان کے ارشادات ورہنمائی کے مطابق زندگی گزارنے سے

آپ کی زندگی میں جو رنگ آنا تھا، وہ شاید اب آ بھی گیا ہو، اللہ تعالی مولانا حسین احمد صاحب کی زندگی میں روحانیت کے حوالے سے وہ بہار لائے، جس کی توقع ہم زندگی بھر کرتے رہے ہیں، جس سے امید ہے کہ نہ صرف آپ کا فائدہ ہوگا بلکہ ایک حیثیت سے پوری قوم کو بھی فائدے ہونے کا امکان ہے، اللہ ہماری دعا قبول فرمائے، آمین، یارب العالمین۔

اس بیعت وارادت کے چند سال بعد مولانا کو اپنے احوال ومقامات کے متعلق بیان کرتے ہوئے سنا گیا، آپ کہہ رہے تھے کہ ''حضرت پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت نے میری زندگی میں جو خاص تبدیلی لائی ہے وہ بیان کرنے سے میں قاصر ہوں'' ظاہر ہے کہ راقم سطور ایک کور باطن انسان ہے، یوں اس قسم کی باتوں سے الجھنا اس کے بس کی بات نہیں ہے، لیکن خدا معلوم کہ اس وقت آپ اپنے کس قسم کے احوال ومقامات کے بارے میں اظہار خیال فرما رہے تھے، اور وہی جانتا ہے کہ اس بیعت وارادت نے آپ کی زندگی میں کون سی تبدیلیاں لائی تھیں؟ نہ جانے وہ کون سی منزل تھی کہ جس کی طرف آپ کو اس بیعت وارادت نے رواں دواں کر دیا ہو؟؟ اور وہ کون سی مثبت زندگی تھی، جسے آپ نے اس بیعت وارادت کے بعد پالیا ہو؟؟؟۔

میرے ناقص خیال میں آپ نے اس وقت اپنی زندگی کی ظاہری تبدیلی کے متعلق اظہار خیال نہیں کر رہے تھے بلکہ جو اظہار کر رہے تھے وہ سراسر باطنی اور روحانی احوال ومقامات کے بارے میں تھا، جو ہم جیسے نرے کور باطن اور بلکہ ایک قسم کے بد باطنوں کی نظر سے شاید اوجھل ہوں، بہرکیف آپ نے بیعت تو کر ہی لی، اللہ کرے کہ یہی بیعت آپ کی زندگی میں مثبت پھل لائے، جو پوری قوم کے حق میں بھی کام آئے۔

لیکن یہاں ایک افسوس کا مقام ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب کی اس بیعت وارادت کے تقریبا پانچ سالوں کے بعد حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب کا انتقال ہو گیا، حضرت شیخ سفر حج میں حجاز مقدس میں تھے، واپسی کی تیاری مکمل تھی، لیکن ادھر سے بلاوا آ گیا اور آپ نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا، الحمدللہ جنت المعلی میں مدفون ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کاش کہ مولانا حسین احمد صاحب کی حضرت شیخ کے مبارک ہاتھ پر یہ بیعت ان کے عہد شباب میں

ہوئی ہوتی، تو ظاہر ہے کہ استفادے کا اور زیادہ موقع ہوا ہوتا، پھر بھی جو ہوا کہ اچھا ہی ہوا، شاید دیر آید درست آید والی بات ہو، اللہ تعالی کی جو مرضی ہو آخر وہی تو ہوگا نا؟ اللہ تعالی اپنے خاص کرم سے مولانا کی زندگی کو مزید سنوار دیں۔

اب ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اس عنوان کے معا بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے مرشد حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات زندگی یہاں درج کئے جائیں، جو بعض حضرات کا مطالبہ بھی ہے:

حضرت مولانا شاہ مظفر احمد مینگزوی رحمۃ اللہ علیہ

ارکان کی مایۂ ناز ہستی حضرت مولانا شاہ مظفر احمد بن حاجی فضل الرحمن کی ولادت باسعادت ۱۹۲۷ء میں شمالی بوسیدنگ کی معروف بستی منگیزی میں ہوئی، آپ کے والد حاجی فضل الرحمن مرحوم نہایت سخی اور عالم دوست انسان تھے، اور صورت وسیرت کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔

مولانا مظفر احمدؒ کی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں سے شروع ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو دار العلوم تنگ بازار میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے اس علاقے کے معروف عالم دین مولانا مفتی محمد حسین صاحب مہاجر کراچی پاکستان سے خوب خوب استفادہ کیا، اس کے بعد اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور ۱۹۴۷ء میں از ہر ہند دار العلوم دیوبند جا داخل ہوئے۔ آپ نے ایک روایت کے مطابق دار العلوم دیوبند میں مسلسل گیارہ سالوں تک تعلیم حاصل کی اور اس مادر علمی کے بڑے بڑوں سے خوب خوب استفادہ کیا، لیکن بعض جاننے والوں کے مطابق یہاں آپ کا لگاؤ حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحبؒ سے زیادہ تھا، حضرت مولانا مدنی ایک طرف آپ کے استاد تھے تو دوسری طرف آپ کے شیخ طریقت بھی، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ''مسلسل گیارہ سال تک دار العلوم کے احاطے میں زندگی کے قیمتی لمحات اللہ والوں کی معیت میں گزارے، اور طالب علمی ہی کے دور میں شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی رسم پوری کی، جب حضرت

مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دور اندیش نگاہ سے مولانا ممدوح کی غیر معمولی صلاحیت، قائدانہ قابلیت اور مجاہدانہ کردار کو دیکھا تو ۱۹۵۷ء میں خرقۂ خلافت عطا کیا، اور فیض رسانی کی خاطر بیعت کی بھی اجازت دے دی، ۱۹۵۷ء میں تو حضرت ممدوح نے دار العلوم کی چار دیواری سے فراغت حاصل کی، لیکن زہے نصیب ۱۹۵۷ء میں باطنی علوم اور عشق الٰہی کے بحر بے کنار کی طرف گامزن ہونے کا آغاز ہوا''۔

فراغت کے بعد آپ وطن آئے اور اپنے آبائی گاؤں میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، مولانا نے بہت ہی قلیل مدّت میں اس مدرسہ کو ایک جان دار درس گاہ بنا دیا، آپ کی جان توڑ کوشش اور اخلاص وللّٰہیت کی وجہ سے ماشاء اللہ ملک بھر میں اس درس گاہ کی شہرت ہوئی، آپ خود بھی اس درس گاہ میں درس دیتے رہے، اس مدرسہ میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی رہی، ماشاء اللہ یہ آپ کے اخلاص کا ثمرہ ہے کہ حضرت کے انتقال کے بعد بھی یہ درس گاہ بڑی خوش اسلوبی سے چل رہی ہے۔ یوں تو آپ کی پوری زندگی قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تدریس میں اور ساتھ ہی ساتھ ارشاد وتلقین میں گزر گئی، مگر اپنے شیخ اور استاد کی طرح آپ بھی بڑے آن بان اور شان کے بزرگ تھے، قال وحال کے سنگم، زمانے کی آب وہوا سے واقف، رزم وبزم کے شہ سوار، مدرسہ میں ہیں تو بے مثال استاد ومعلّم، میدان سیاست میں ہیں تو دور اندیش سیاست دان، اور قافلۂ تحریک وجہاد میں ہیں تو ایک مجاہد فی سبیل اللہ اور رزم گہ الفت کا عظیم المرتبت شہوار۔

۱۹۷۱ء میں آپ نے دیگر اعیان اسلام سے مل کر سرزمین چاٹگام میں ارکانی مہاجرین کی فلاح وبہبود کے لئے ایک رفاہی تنظیم کی بنیاد رکھی تھی، جس کے سرپرست اعلی خطیب اعظم حضرت مولانا صدیق احمد صاحبؒ سابق شیخ الحدیث مدرسہ ضمیریہ پٹیہ تھے، اور مفتی محمد یوسف بن مولانا عبد الحمید فتح آبادیؒ خطیب اعظم صاحب کی نیابت کا فریضہ انجام دیتے تھے، جب کہ اس تنظیم کے امیر حضرت مولانا مظفر احمد منگیزوی تھے۔ ان بڑے بڑوں میں امت مسلمہ اور انسانیت کی خدمات کے حوالے سے جو جذبے اور ولولے دیکھے گئے وہ اپنی مثال آپ تھے، علاوہ ازیں حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سعد اللہ سری اور مولانا نور الاسلام صاحب انصاری بھی اس تنظیم میں شامل تھے، پہلے پہلے

اس رفاہی قسم کی تنظیم کا نام خدام الاسلام رکھا گیا تھا، بعد میں نام کی تبدیلی کے ساتھ حمایۃ الاسلام سے مشہور ہوئی تھی۔

اسی طرح سرزمین ارکان کے علمائے اسلام نے اور ایک تنظیم کی بنیاد رکھی تھی، جس کا نام خلافت کمیٹی تھا، اس میں بھی حضرت مولانا ممدوح مرکزی امیر رہ چکے تھے، بعض لوگوں نے آپ کو خلیفۃ المسلمین کا لقب بھی دیا تھا، ان مذکورہ دونوں تنظیموں نے اپنے اپنے وقت میں بہت ہی نمایاں کام بھی انجام دیا تھا۔

ان دونوں تنظیموں کے بعد گئی صدی کی آٹھویں دہائی کے اواخر میں مولانا محمد حنیف راغبؔ فرندگی کی قیادت میں اتحاد المجاہدین نامی تنظیم کی بنیاد پڑی تو کہا گیا تھا کہ اس موخر الذکر تنظیم کے چار سرپرست اعلی تھے، جن میں سے ایک حضرت مولانا ممدوح اور بقیہ تینوں بزرگوں کے نام یہ ہیں کہ :

(۱) حضرت علامہ جناب مولانا سعید الامین صاحب منگنماوی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) حضرت مولانا مفتی سلطان احمد صاحب سرپرست اعلی دار العلوم میانجان پورؒ ۔

(۳) حضرت مولانا عبد السبحان گرھا خالوی رحمۃ اللہ علیہ۔

اور ان چاروں بزرگوں میں بھی حضرت مولانا مظفر احمد صاحب کو سرپرست اعلی مقرر کیا گیا تھا، جب کہ مولانا محمد حنیف راغبؔ ان کی طرف سے نیابت کا فریضہ انجام دے رہے تھے، البتہ اس تنظیم کے مذکورہ دعوی کہاں تک صحیح تھا، اسے وہ لوگ ہی کہہ سکیں گے جو اس تنظیم کے مؤسس یا رکن رکین رہ چکے تھے، مگر یہ دعوی شہرت کے حوالے سے حد تک پہنچا ہوا تھا، جب کہ بخلاف اس دعوے کے بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ حضرت مولانا ممدوح سمیت ارکان کے ان مذکورہ بزرگوں کا بظاہر اس تنظیم سے کوئی تعلق نہیں تھا، اللہ معلوم کہ کس دعوے میں سچائیت تھی، اور اس تنظیم کے ساتھ ہمارے ان بزرگوں کی کس نوعیت کا تعلق تھا؟۔

بہر حال درس وتدریس کے ساتھ ساتھ حضرت شاہ صاحب نے سلسلۂ بیعت وارشاد کو بھی بڑی خوبی سے جاری رکھا، جہاں بھی گئے آپ نے ارشاد وتلقین کا سلسلہ جاری کیا۔ علماء وفضلاء کی سرپرستی اور رہنمائی کے علاوہ عوام الناس کے رشد وہدایت آپ کی زندگی کا ایک بڑا نصب العین رہا تھا، اسی وجہ سے آپ کے متعلقین ومریدین کا شمار بہت ہی مشکل ہے، ملک کے گوشے گوشے میں آپ کے متعلقین

پائے جاتے ہیں، اسی طرح آپ کے خلفاء بھی بہت ہیں، اور آپ کے خلفاء تقریباً سب کے سب علماء ےعظام پر مشتمل ہیں۔

۳۰/۱/۲۰۰۳ء کا واقعہ تھا کہ میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کی نیت سے ڈھاکہ پہنچا، تو مولانا محمد ناصر تنگ بازی نے مجھے فون میں اطلاع دی کہ اس روز ہوائی جہاز ٹیکنیکل خرابی کی وجہ سے پرواز نہیں کرسکتا، اور ایک روز مجھے ڈھاکہ میں انتظار کرنا پڑے گا، بعد میں مولانا ناصر صاحب نے یہ بتایا کہ اسی جہاز میں حضرت مولانا مظفر احمد صاحب اور مولانا سید الامین صاحب کے علاوہ اور ایک بزرگ جانے والے تھے، اور سب حضرات مولانا ناصر صاحب کے گھر میں مقیم ہیں، مزید یہ بھی بتایا کہ اگر آپ (یعنی ناچیز) کو کوئی پریشانی نہ ہو تو آپ بھی میرے غریب خانے میں آسکتے ہیں، اب میں نے ان بزرگوں کے نام گرامی سنتے تو مولانا کی رہائش گاہ جانا مناسب سمجھا، یوں ایک ٹیکسی کے ذریعے ان کی رہائش گاہ پہنچ گیا، رات ان دونوں بزرگوں کے ساتھ گزارا، اور ان دونوں کے ساتھ مختلف علمی اور فکری اور تحریکی موضوعات پر گفتگو بھی کی، دوران گفتگو میں نے حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب سے چند سوالات بھی کئے، جن میں سے کچھ یہ ہیں :

سوال : حضرت مولانا محترم! آپ کے کتنے خلفاء ہیں؟

جواب : دوسو کے لگ بھگ ہمارے خلفاء ملک وبیرون ملک میں ہیں۔

سوال : حضرت! کیا جنات میں بھی آپ کے خلفاء ہیں۔

جواب : جنات میں خلفاء کیسے؟ جنات سے خلافت چھین لی گئی، اس لئے جنات میں خلفاء نہیں اور نہیں ہوسکتے، البتہ مریدان بہت ہیں۔

سوال : سنتا ہوں کہ جنات کے ساتھ آپ کے بہت سے معاملات ہوتے رہتے ہیں، جب کہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ کے دیگر خلفاء تو آپ جیسے نہیں ہوتے؟

جواب : عزیزم! میرا علاقہ ایک جنات کا علاقہ ہے، اس لئے مجھ سے جنات کا بہت ہی سابقہ ہوتا ہے، جب کہ حضرت مدنیؒ کے دیگر خلفاء کے یہاں جنات بہت کم ہوتے ہیں اس لئے انہیں جنات سے سابقہ نہیں ہوتا۔

اس کے بعد میں نے حضرت کو کچھ نصیحت فرمانے کی گزارش کی تو آپ نے فرمایا :

''انسان کے ہر معاملات میں خوف الٰہی ہو تو گمراہی چھو کر بھی نہیں گزرسکتی، خوف الٰہی انسانی زندگی کے لئے سب بڑا روشن چراغ ہوتا ہے، اسی لئے تم ہر حالت میں خوف الٰہی اور تقوی شعاری کو اصول زندگی بنالو! انشاء اللہ دنیا اور آخرت میں کامیاب رہوگے، قرآن وسنت کو رہنما بنالو، ہدایت اسی میں ہے، قرآن وسنت میں ہر مشکلات کا حل موجود ہے، انسان کے لئے بس مشعل راہ یہی ہے''۔

حضرت مولانا آٹھ مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے تھے، یوں سعودی عرب میں پائے جانے والے ہمارے براوری میں حضرت کے بے شمار مریدان ہیں، غالباً یہاں بھی حضرت کے بعض خلفاء پائے جاتے ہیں، یہاں پائے جانے والے غیر مقلدین سے چندمرتبہ آپ کی گفتگو ہوئی تھی، اس حوالے سے حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ :

''شعبان المعظم ۱۹ ۱۴ھ مطابق دسمبر ۱۹۹۸ء میں سعودی عرب میں مقیم موجودہ اہل حدیث (غیر مقلدین) کے ایک وفد نے (جو علماء پر مشتمل تھے) حضرت کی خدمت میں حاضری دی، حضرت سے وفد نے کہا کہ علمائے دیوبند کے عقاید میں کچھ خامیاں ہیں، جن کے اصلاح ضروری ہے، اس وفد نے چند متنازعہ فیہ مسائل چھیڑے، راقم الحروف بھی وہیں تھا، اس وقت حضرت پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے، علماء دیوبند کا نام سن کر فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے، اور آمدہ وفد کے جملہ اعتراضات کے تسلّی بخش جواب دیئے، جوابات کیا تھے؟ بلکہ علوم ومعارف کی بارش تھی، اچانک برس پڑی تھی، جن سے وفد لاجواب ہوگیا تھا، پیر صاحب نے بعد میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے سعودی عرب کے مفتی اعظم سمیت دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے اہل حدیث یا غیر مقلد عالم کے پاس لے جایئے، میں علمائے دیوبند کا ادنی ساخادم ہوں، علمائے دیوبند کے عقائد قرآن وسنت کی روشنی میں بیان کروں گا، اگر کسی بھی غیر مقلد عالم نے یہ ثابت کردیا کہ فلاں عقیدہ قرآن کے خلاف ہے، فلاں عقیدہ سنت کے خلاف ہے تو میں اس وقت غیر مقلد بن جاؤں گا''۔

حضرت نے دو کتابیں بھی لکھیں، ان میں سے جلاء القلوب راقم کی نظر سے گزری، جو ۱۵۷ صفحات پر مشتمل ہے، اس گراں قدر تصنیف میں آپ نے تصوف وسلوک کی بنیادی اور ضروری مباحث پر خاصی روشنی ڈالی ہے، اور دوسری تصنیف اشک اہالیان برما، یہ کتاب میری نظر سے تو نہیں گزری، البتہ اس کا تذکرہ حافظ محمد صدیق صاحب نے کیا ہے۔

غرض حضرت مولانا ایک جید عالم دین، اہل دل شیخ طریقت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دور اندیش سیاست داں بھی تھے، آپ نے زندگی بھر ملک وملّت کی خدمات کیں، بالآخر حج بیت اللہ کے سفر کے دوران ۲۰۰۷ء میں وفات پائی اور جنت المعلی میں مدفون ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ساتواں باب

(مولانا حسین احمد صاحب کے چند معاصرین اور احباب)

مولانا محمد حنیف راغبؔ فرندگی

مولانا محمد حنیف صاحب راغبؔ ارکان کے مشہور شہر راسیدنگ کی ایک مردم خیز بستی فرندنگ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی میں پائی اور آپ کا نشوونما بھی وہیں ہوا، بعد میں سرزمین ارکان کے اس زمانے کے مشہور جواں عالم یا طالب علم حضرت مولانا دین محمد شہید فرندگی سے نحو وصرف اور منطق وغیرہ کی چند کتابیں پڑھیں، اور شنید ہے کہ مولانا شہید آپ کے رشتے داروں میں سے تھے، اور راغب صاحب ان کو ''چچا جان'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

مولانا دین محمد صاحب شہید کی شہرت ان کے زمانے میں شمالی مغربی ارکان میں عام تھی، یوں ان کے شاگردِ خاص ہونے کی وجہ سے مولانا راغب صاحب کی شہرت بھی بڑھنے لگی تھی، مولانا شہید اگر چہ ایک منتہی طالب علم تھے لیکن بعض ذرائع کے مطابق پورے مستند عالم نہیں تھے، تاہم جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ آپ وقت کے ایک فن کار اور بالغ نظر معلم واستاد سے کسی معنی میں بھی کم نہیں تھے، کہتے ہیں کہ حضرت شہید کی ذہنی اور فکری کیفیت کچھ اور ہی تھی، اور ایک اندازے کے مطابق آپ کی ذات قدامت اور جدت کی سنگم تھی، باوجودیکہ ہمارے درس نظامیہ کے متداول نصاب کی زمینیں بڑی کٹھن، سنگلاخ اور خارزار ہیں، لیکن مولانا شہید کے سامنے یہ کتابیں گویا موم تھیں، ساتھ ہی ساتھ کہتے ہیں کہ آپ کی ذات میں افادے اور استفادے کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، جس نے بھی آپ سے پڑھا وہ شہید کا مداح اور فدا ہو گیا تھا، مگر افسوس ہے کہ برمی درندوں نے ایک موقع پر ان کو

شہید کر دیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

راغب صاحب کے متوسطہ کی تعلیم ارکان کے چند مدارس میں ہوئی، دارالعلوم میانجان پور میں بھی آپ نے تعلیم پائی، بعد ازاں حصول اعلیٰ تعلیم کے لئے چاٹگام پہنچے اور وہاں کی معروف دینی درس گاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے علوم وفنون کی بعض کتابیں پڑھیں، لیکن دورۂ حدیث جامعہ اسلامیہ قاسم العلوم پٹیہ میں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ پاکستان گئے اور مشہور روایت کے مطابق سرزمین پاکستان کے مشہور و معروف عالم دین، مجاہد فی سبیل اللہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی سے کچھ استفادہ کیا، اس کے بعد آپ سعودی عرب گئے، کیلو اربعۃ عشرۃ جدہ کی ایک مسجد میں امامت کا فریضہ انجام دیتے رہے، اس دوران آپ نے چند دیگر روہنگیا ساتھیوں سے مل کر ''حمایت اسلام'' نامی ایک تنظیم کی بنیاد بھی رکھی اور ساتھ ہی ساتھ ''روہنگیا رسم الخط'' نامی ایک چیز بھی نکالی، اس وقت کے آپ کے ساتھیوں میں مولانا صالح احمد صاحب نکھوروی، مولانا سعید حسین صاحبؒ اور مسٹر محی الدین یوسف مقیم حال ولایات متحدہ امریکہ پیش پیش تھے۔

میں نے بذات خود مولانا صالح احمد صاحب نکھوروی کی ذاتی فائل میں کچھ چیزیں دیکھیں، جن سے اندازہ ہوا تھا کہ راغب صاحب ان مذکورہ کاموں کے حوالے سے اس زمانے میں کافی سرگرم عمل تھے۔ یوں آپ ایک مدت سعودی عرب میں گزار کر بنگلا دیش چلے آئے۔

جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ راغب صاحب اس وقت سعوودی عرب سے بنگلا دیش یوں ہی بے مقصد نہیں آئے تھے، بات یہی ہے کہ آپ نے وہاں چند لوگوں کو سرزمین ارکان کے حوالے سے کام کرنے کے لئے تیار کیا، جنہوں نے آپ سے بھر پور تعاون کا وعدہ بھی کیا تھا، چنان چہ آپ نے بنگلا دیش آتے ہی موضع سابرانگ، ٹیکناف میں ایک مدرسہ ''دار التربیۃ الاسلامیہ'' کے نام سے قائم کیا، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے روہنگیا رسم الخط کی بھی زور شور سے اشاعت شروع کر دی تھی۔

مولانا کی تدریسی خدمات کے متعلق پتہ چلا کہ آپ نے اپنی حیات مستعار میں اب تک کئے مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، آج یہاں تو کل وہاں والی بات ہے، یوں بعض حضرات کو آپ

کی مستقل مزاجی کے بارے میں کافی شکایات رہی ہیں، تاہم اس بات میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ جہاں اور جس درس گاہ میں بیٹھتے طلبہ آپ پر ٹوٹ پڑتے ہیں، آپ نے جامعہ دار السنہ نہلا، ٹیکناف کے علاوہ اور بھی دیگر چند مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، جہاں بھی گئے، آپ کے درس کی نسبت سے طلبہ کی ایک بڑی جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی، تو اس حوالے سے آپ کو ایک کامیاب مدرس کہا جا سکتا ہے، چوں کہ آپ کو خصوصی طور پر فن منطق میں ایک کامیاب مدرس کہا جاتا ہے، ادھر عمومی طور پر ہمارے طلبائے مدارس کو منطق اور یونانی فلسفہ (جسے بعض نادانوں نے اسلامی فن اور فلسفہ بنا دیا ہے) کی لت لگی رہتی ہے، اس لئے بھی شاید آپ جہاں بھی جاتے ہیں کہ طلباء کی توجہ کے محور بنے رہتے ہیں۔

مولانا راغب صاحب کے مطابق کہ ''روہنگیا مسلمانوں کی زبان کا ایک رسم الخط ہونا چاہئے'' ہمارے قومی احساس کی ایک صدائے بازگشت تھا اور ہے، لیکن آپ نے اس احساس میں کافی غیر ذمے داری، کور بینی اور حد درجہ کے غیر منطقی جذبات وخیالات سے کام لیا ہے، آپ کو اس حوالے سے تاریخی، ثقافتی، علمی اور اسلامی نقطۂ نظر سے کافی غور وفکر کرنا چاہئے تھا، لیکن افسوس ہے کہ آپ نے نہیں کیا، اور دعوی کیا ہے کہ ''روہنگیا ایک علیحدہ قوم ہے اور جس کی ایک علیحدہ زبان بھی ہے، اس لئے اس کا ایک علیحدہ اور منفرد رسم الخط ہونا ناگزیر امر ہے''۔

درحقیقت آپ کا یہ دعوی آپ کی زندگی کا سب سے بڑی تسامح تھا اور اب بھی ہے، جو آپ کر بیٹھے تھے اور اب بھی اس پر اصرار کر رہے ہیں، شاید بعد میں آپ کو اپنی اس بڑی غلطی کا احساس ہوا بھی ہوگا، لیکن بعض حضرات کے خیال میں آپ نے اپنے غرور و پندار اور اپنے ناروا ''انا'' کی وجہ سے اپنی اس غلطی سے رجوع نہیں کیا اور کرنا بھی نہیں چاہتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ اور کسی کی دورائے نہیں ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کی ایک زبان ہے، کہ اس کے لئے ایک رسم الخط بھی ہونا چاہئے، لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اس زبان کی ایک منفرد اور علیحدہ رسم الخط کی تھوڑی بھی ضرورت نہیں، کیوں کہ ہمارے سامنے عربی رسم الخط حاضر ہے، جو تقریبا پورے عالم اسلامی کی بڑی بڑی زبانوں کا مشترکہ رسم الخط ہے۔

یہ تو ظاہر سی بات ہے کہ اگر پورے عالم اسلامی کو سیاسی، ثقافتی، فکری، دینی، روحانی اور تمدنی غرض ہر ایک اعتبار سے متحد رکھنا ہو تو اسلامیان عالم کے لئے ایک واجبی امر ہے کہ ان کی تمام زبانوں کا رسم الخط عربی زبان پر مبنی ہو، چوں کہ ہم مسلمان ہیں، اس لئے ہماری قومی زبان کا رسم الخط بھی عربی رسم الخط میں ہونا ناگزیر ہے، علاوہ ازیں ہماری قومی تاریخ اس بات کی شاہدِ عیاں ہے کہ ماضی قریب وبعید میں ہمارے بزرگوں نے ہماری زبان کو عربی ہی میں لکھا تھا، جسے ہم آج بھی ہمارے تاریخی اوراق اور دستاویزات میں عیاں طور پر دیکھتے ہیں۔

کون سے اہل علم وفکر اس بات سے واقف نہیں ہے کہ عالم اسلام میں ہمارے دشمنوں، شاطروں اور سازش کاروں نے اس بابرکت رسم الخط ''عربی'' سے مسلمانوں کو علیحدہ کرنے کی کتنی ہی سازشیں کیں اور پروپیگنڈے کئے ہیں، اور جس کا سلسلہ اب بھی بدستور جاری ہے، اور تو اور صرف ترکی کو ملاحظہ کیجئے! کہ بالآخر مصطفی کمال اتاترک کے آلودہ ہاتھوں ترکی کو اس فکری نہج سے گرادینے کے لئے اسلام دشمن عناصر اور انجمنوں اور ملکوں نے کیا کچھ نہیں کیا ہے، اسی طرح انڈونیشیا اور ملائشیا کے حالات پر نظر ڈالئے۔

لیکن الحمدللہ ان مؤخر الذکر ملکوں کے مسلمانوں نے اس سازش کا مقابلہ بھی کیا ہے، اور اپنے قدیم اسلامی رسم الخط پر ڈھٹے بھی رہے ہیں، ویسے آج کل ترکی، بنگلا دیش اور جزوی طور پر انڈونیشیا اور ملائشیا کا رسم الخط اسلامی رسم الخط سے مختلف ہونے کی وجہ سے ان پر مقامی غیر اسلامی اثرات وسیع پیمانے پر دیکھے جارہے ہیں، جو اسلامیان عالم کی تاریخ وثقافت کے لئے ایک زہر ہلاہل سے کسی اعتبار سے کم نہیں ہیں، یہ اور اس قسم کے دیگر حقائق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل مسلمانان ارکان اور ان کی زبان کا رسم الخط بھی اسلام دشمن سازش کاروں کی سازش کا شکار ہو ہی چکا ہے۔

اس حوالے سے ہمارے بعض محققین اور صاحب نظر حضرات کا یہی دعوی ہے کہ روہنگیا مسلمان جس طرح دیگر بڑی بڑی سازش کے شکار ہو چکے ہیں، ٹھیک اسی طرح ان کی زبان کا رسم الخط بھی اسلام دشمنوں کا شکار ہو چکا ہے، لیکن نہ جانے کیوں راغب صاحب دانستہ طور پر ان سازش کاروں کی حمایت کر رہے ہیں؟۔

بہر حال یہ ایک قابل ذکر بات ہے کہ ماضی میں چاٹگام بشمول ارکان کی زبان عربی ہی میں لکھی جاتی تھی، اس حقیقت کو برصغیر کے معروف اور نامور مسلم مورخ محترم شیخ محمد اکرام نے اپنی گراں مایہ تصنیف ''آب کوثر'' میں واضح کر دیا ہے، چنان چہ آپ لکھتے ہیں کہ:

> ''غالباً گجرات، مالابار اور معبر کی طرح چٹاگانگ کے پاس (موجودہ مشرقی پاکستان میں) مسلمانوں کی بستیاں تھیں، چٹاگانگ کے گرد ونواح اور قریبی جزائر (سندیپ) میں بنگالی کی صورت رائج ہے، اس میں عربی اثرات خاص طور پر نمایاں ہیں، اس علاقے میں عربی رسم الخط کو بنگال کے باقی حصوں سے زیادہ اہمیت رہی ہے، یہاں قدیمی بنگالی کتابوں (مثلاً شاہ علاول کی تصانیف) کے مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں کئی عربی رسم الخط میں ہیں، یہ محض اتفاقی نہیں تھا کہ بنگالی کو حروف قرآن میں لکھنے کی جو تحریک زمانے میں شروع ہوئی تھی، اس کا مرکز چٹاگانگ تھا، یہ عربی اثرات یقیناً عرب تاجروں اور ملاحوں کی آمد ورفت کا نتیجہ تھے، اور اس ساحل پر عربوں کی مقامی نوآبادیاں قرین قیاس معلوم ہوتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ تاریخ ان کے متعلق خاموش ہے(۱) اس علاقے میں عربوں کی آمد کا سب سے پہلا سراغ برما کے علاقے اراکان کی مقامی تاریخ میں ملتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ایک راجا کے عہد حکومت میں جو ۷۸۱ء میں تخت نشین ہوا، عربوں کے کئی جہاز سمندر میں طغیانی کی وجہ سے رامری کے قریب ٹوٹ گئے، اور مسافروں کو اندرونی علاقے میں بسایا گیا، بعد میں اراکان کے ساحل پر اسلامی اثرات بڑھ گئے، چناں چہ کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے کہ تیرھویں صدی میں آسام سے ملایا تک کے ساحل پر جا بجا مسجد نما عمارتیں تھیں، جنہیں بدر مکان یا بدر مقام کہا جاتا ہے، ہاروے نے وضاحت کی ہے کہ ان عمارتوں کو نہ صرف مسلمان بلکہ

(۱) جناب اکرام صاحب! خاموش نہیں ہے بلکہ بے شمار تاریخ کی کتابیں اور دستاویزات موجود ہیں۔

چینی اور بدھ مت کے پیرو بھی احترام سے دیکھتے ہیں، ان کا انتساب بدر اولیاء یا بدرالدین اولیاء سے تھا، جن کا چٹا گانگ میں چلہ خانہ بتایا جاتا ہے، لیکن جو بہار میں دفن ہیں، اور ان کے ملاح اور کشتی بان خاص طور پر معتقد تھے'' (۱)

اسی طرح ارکانی مؤرخ جناب مرحوم اڈووکٹ خلیل الرحمن صاحب نے اپنی تصنیف ''تاریخ اسلام ارکان و برما'' میں حضرت علاول رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دیگر لوگوں کی تصانیف سے طول طویل اقتباسات درج کردیئے ہیں، جو عربی رسم الخط میں لکھی گئی تھیں، جن سے بات عیاں ہوجاتی ہے کہ سرزمین ارکان کے مسلمانوں کی زبان قدیم زمانے میں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

اسی طرح مشہور و معروف ارکانی مؤرخ اور سیاست دان و محرک جناب مرحوم ظہیر الدین بی اے علیگ نے اس موضوع کے حوالے سے کمال ہی کردیا ہے، انہوں نے ''زبان مشرقی بنگال و اراکان'' نامی ایک مستقل تصنیف لکھ کر منظر عام پر لائی ہے، جو ابھی میرے سامنے بھی ہے، جس میں بے شمار اقتباسات درج ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ چاٹگام اور یہاں کے شعرائے کرام اور انشاء پردازوں نے عربی رسم الخط میں بے شمار کتابیں تصنیف کی تھیں، حضرت علاول اور منشی لال محمد وغیرہ کی تصانیف کے اقتباسات کے علاوہ مقامی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے اور لکھے جانے کا طرز و طریقہ بھی مرحوم نے بڑے اچھے انداز میں اور بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے، جن سے بخوبی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

اہل علم و دانش اور باخبر حضرات سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام نوع انسانی کے والد بزرگوار اور پہلے انسان ہیں، جنہیں اللہ رب العلمین نے خلافت الارض کے لئے پیدا کیا، جنہوں نے ۹۳۰ سال کی عمر پائی تھی، سیدنا شیث علیہ السلام جب ان کے گھر میں پیدا ہوئے تو اس وقت سیدنا آدم علیہ السلام کی عمر ایک سو تیس سال کی تھی، قرآن کریم میں سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدائش کے بعد جنت میں ٹھہرانے کا ذکر ہے کہ:

{وقلنا یا آدم اسکن أنت و زوجک الجنة و کلا منها رغدا حیث شئتما و لا تقربا هذه

(۱) شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ص: ۵۲۔۵۳۔

الشجرة فتکونا من الظلمین} (البقرة: ۵۳)

ترجمہ: پھر ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ، مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا، ورنہ ظالموں میں شمار ہوں گے۔

اس سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر بحیثیت خلیفہ بھیجے جانے سے پہلے ان دونوں میاں بیوی کو بغرض امتحان جنت میں رکھا گیا تھا، تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش ہوجائے۔

ادھر اس جنت کی تعیین میں علمائے امت کا اختلاف ہے، حضرت امام ابوحنیفہ، ابوالقاسم بلخی، ابن قتیبہ اور ابوالقاسم اصفہانی رحمہم اللہ کا قول ہے کہ یہ کرۂ ارضی ہی میں ایک مقام تھا جہاں ان کو ٹھہرایا گیا تھا، مگر دیگر علماء اور مفسرین نے اسے آسمان پر بتایا ہے، البتہ موخر الذکر علماء میں سے بعض کا قول ہے کہ یہ جنت جنت الخلد سے الگ تھی، اور بعض نے اسے جنت الخلد ہی بتایا ہے، جو کچھ بھی ہو، آپ جنت میں تھے ہی، اور جہاں تک جنت میں ان کی زبان کا تعلق ہے کہ ظاہر ہے کہ ان کی ایک زبان بھی تھی، ارشاد نبوی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی ہی تھی، کما قال علیہ السلام:

{احبو العرب لثلاث، لانی عربی، و القرآن عربی، و لسان اهل الجنة عربی}

تو عربی ہی اہل جنت کی زبان ٹھہری۔

سیدنا آدم علیہ السلام کی ذریت میں سیدنا نوح علیہ السلام تاریخ انسانی کے پہلے رسول ہیں، بائیبل کا بیان ہے کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی عمر ابھی ۶۰۰/سال کی تھی کہ طوفان نوح شروع ہوا، چالیس دن چالیس رات تک آسمان سے پانی برستا اور سمندر کے چشموں سے اچھلتا رہا تھا، انہوں نے طوفان سے پہلے ایک کشتی بنائی تھی، جس کا طول ۳۰۰ ہاتھ، عرض ۵۰ ہاتھ، اور بلندی ۳۰ ہاتھ تھی، اور جس کے اندر تین طبقے تھے، اور ایک سو پچاس روز کے بعد پانی زمین سے کم ہونا شروع ہوا تو ۶۰۱ عمر نوحی سے دوسرے مہینے کی ۲۷/تاریخ کو سیدنا نوح علیہ السلام نے زمین پر قدم رکھا، آپ علیہ السلام اس طوفان کے بعد ۳۵۰/سال زندہ رہے۔ ویسے تاریخ انسانی سیدنا نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد باری ہے: **{و جعلنا ذریته هم الباقین}**

اور سیدنا نوح علیہ السلام کے تین فرزند تھے، سام، حام اور یافث، جن کی نسل تمام معمورۂ دنیا کی

آبادی اور رونق بن رہی ہے، البتہ آپ علیہ السلام کا ایک چوتھا بیٹا یام بھی تھا، جو عمل غیر صالح ہونے کی وجہ سے اس مذکورہ طوفان میں غرق آب ہوا تھا۔

پھر سام یا سم سیدنا نوح علیہ السلام کے بڑے فرزند کا نام ہے، سیدنا نوح علیہ السلام کی ۵۰۲ ر سال کی عمر تھی، جب ان کے ہاں یہ اولین فرزند پیدا ہوئے۔ اور سام ان تمام اقوام کے پدر اور جملہ السنہ کے معلم اول ہیں، جن کا نام یورپین مورخین نے ''ساموٹک'' رکھ دیا ہے۔ اب بھی سامی زبان کا وجود ایشیا اور افریقہ کے اندر برابر پایا جاتا ہے، فونی شین، ارمیک، اسیرین، انتھی اوپک زبانیں سامی زبان ہی سے نکلی ہیں، اور یہ تو مسلمات سے ہے کہ عربی اور عبرانی زبانیں تمام سامی السنۃ کے اندر زیادہ شاندار اور خزائن علمی سے مالا مال ہیں۔

مشہور قدیم مؤرخین اس امر کے معترف ہیں کہ سام کی اولاد کا اصلی وطن عرب ہے، قرآن مجید نے اس آیت:

{ لتنذر ام القری و من حولھا } (الانعام: ۹۲)

میں مکہ کو ام القری یعنی بستیوں کی اصل یا ماں بتایا ہے، اور قرآن کریم کا یہ ارشاد ان مذکورہ مورخین کی اس مورخانہ جدو جہد کی تصدیق فرماتا ہے، اور یہ بات تاریخ سے بھی ثابت ہوگئی ہے کہ قدیم ترین زمانے میں کچھ قومیں ریگستان عرب سے نکل کر اس کے گردونواح کی قابل کاشت اراضی پر آباد ہوئی تھیں، اس کا ثبوت اس طرح حاصل ہوا ہے کہ عرب ہی وہ لوگ ہیں جن میں سیمی ٹک کیرکٹر (یعنی سامی عادات واطوار) اپنی اصلی حالت میں پایا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ان کی سادہ زندگی ہمیشہ یکساں طریق پر چلی آئی ہے۔

مورخین کی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ عربوں کی زبان ہی ہمیشہ سے محفوظ چلی آئی ہے، البتہ عبرانی زبان بھی کسی قدیم زمانے میں محفوظ تھی، جس کی یادگار کے بطور اس وقت اہل علم دانش کے ہاتھ میں میشا کے کتبے یا سلوآم کا کتبہ باقی رہ گیا ہے۔

سلطنت یہود کا زوال اور اشدودیوں کے ساتھ یہودیوں کی مناکحت، بنی اسرائیل کی اسیری، بیت المقدس کی بربادی اور یہودیوں کا مختلف ملکوں میں منتشر ہوجانا ایسے قدرتی اسباب تھے کہ عبرانی زبان

اپنی اصلی حالت میں باقی نہ رہ سکی، اور ان اسباب سے اس قدر عظیم انقلاب آیا کہ آخر یہود کی اصلی زبان بجائے عبرانی زبان کے ارمیک بن گئی۔ اور جہاں عبرانی کا یہی حال ہے تو وہاں دیگر سامی زبانوں کا ذکر فضول ہے۔ اس بات سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ عربی ہی ایک ایسی زبان ہے جو اپنی صلی حالت میں باقی رہ گئی ہے، اور قرآن حکیم جو اللہ تعالی کی طرف سے انسانیت کے نام آخری اور ختمی پیغام ہے، اس کے ذریعے اللہ تعالی نے اس زبان کے ساتھ اس کے رسم الخط کو بھی کو دوام بخش دیا ہے۔

فونی شین زبان کی واقفیت اہل علم کو صرف ان کتبات سے ہوئی، جو چوتھی صدی قبل مسیح علیہ السلام میں دستیاب ہوئے ہیں، لیکن یہ زبان اس قدر حجاب ونسیان میں آچکی ہے کہ ان کتبات کے پڑھنے والوں کو بھی خود اس پر وثوق نہیں کہ جو پڑھا وہی ٹھیک ہے۔ ادھر آرمیک زبان کبھی تمام کنعانیوں کی زبان تھی، جہاں جہاں کنعانی قومیں عمدہ عمدہ چراگاہوں کی تلاش میں ارض کنعان سے چینی ترکستان تک پہنچتی رہیں، یہ زبان بھی وہاں گئی، مورخین کا خیال ہے کہ لفظ ارم جو قرآن کریم میں بکسر اول وفتح ثانی اور تورات میں دونوں فتح کے ساتھ مستعمل ہوا ہے، اسی قوم کی یادگار ہے، اور اب یہ زبان بھی نقاب نیستی کے پردے میں پنہاں ہے۔

سامر کی زبان پر غور کرنے والوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ عربی وعبرانی اور ارمیک زبانوں سے بنائی گئی ہے، اسی لئے اول تو وہ پہلے ہی سے کوئی مستقل زبان نہ تھی، دوسرے اب اس زبان کا تلفظ یا لغت بتانے سے کل دنیا گونگی ہے، سریک یا اڈیسن زبان اس عیسائی ارمینیا والوں کی زبان تھی، جن کا دارالسلطنت پانچوین یا چھٹی صدی مسیحی میں اڈیسہ تھا، مگر اس نوزائدہ بچہ کو زیادہ عمر نصیب نہ ہوئی تھی۔

غرض! عربی ہی ایک ایسی واحد اور وحید زبان رہ جاتی ہے جو سیدنا سام علیہ السلام کی تعلیم کردہ زبانوں میں سے زندہ وتوانا موجود ہے، اور شام، عراق، مصر، فلسطین، مراکو، تیونس غرض تمام عرب دنیا اس کے زیر نگین ہے۔ اور یہ زبانیں جو اپنے اندر مماثلت اور مشابہت رکھتی ہیں، بڑے اختصار کے ساتھ وہ یہ ہیں:

(۱) سہ حرفی مصادر کا پایا جانا،

(۲) اسم اور فعل کے قاعدوں میں مشابہت،

(۳) اسماء، ضمائر اور فعل کے درمیان باہمی تعلقات،

(۴) تراکیب نحوی میں مشابہت،

(۵) فعل لازم ومتعدی کے طریقے۔

اب جو کوئی شخص عربی میں مہارت رکھتا، نحو وصرف وعربی کو بخوبی جانتا اور عربی ادب کا دانا ہے، اسے بخوبی معلوم ہے کہ ان جملہ امور میں عربی زبان کیسی مکمل، مستقل اور ہمہ گیر ہے، اور یہی اوصاف ظاہر کرتے ہیں کہ عربی زبان ہی ان تمام زبانوں کی ماں ہے، جو طوفان نوح کے بعد کسی متمدن حصۂ عالم پر کبھی پائی گئی تھیں، جس طرح سیدنا سام علیہ السلام ان ممالک کی جملہ اقوام کے پدر بزرگوار ہیں۔

اب روہنگیا زبان کے رسم الخط کے حوالے سے میری اتنی گزارش ہے کہ وہ جس طرز تعمیر کا بھی ہو، مگر اس کا رشتہ اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت سے مکمل طور پر جڑا ہوا ہونا چاہئے، میں روہنگیا قوم کو دنیا کے دیگر مسلمانوں سے ایک علیحدہ قوم کہنے کے بجائے ان کا ایک آٹوٹ حصہ کہنا بجا سمجھتا ہوں، جس کی ایک اسلام سے جڑی ہوئی تہذیب وثقافت تو ہے ہی مگر ایک مانا پہنچانا رسم الخط نہیں ہے، کون نہیں جانتا ہے کہ اسلام کی ایک بین الاقوامی زبان بھی ہے اور رسم الخط بھی، اسی لئے روہنگیا رسم الخط اس اسلامی رسم الخط اور زبان سے کسی بھی معنی میں توڑا ہوا ہونے کے بجائے کلی طور پر جڑا ہوا ہونا چاہئے۔

ناظرین کرام آپ جانتے ہیں کہ روہنگیا رسم الخط کے حوالے سے ماضی قریب میں مختلف لوگوں کے مختلف انداز وفکر کے نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں، اور راقم سطور کے ناقص خیال میں جن حضرات نے اس حوالے سے کوششیں کیں، ایک حیثیت سے سب کی کوششیں قابل داد اور لائق صد تحسین ہیں، جن کا اجمال کچھ یوں ہے:

(۱) برمی رسم الخط کے چاہنے والے:

روہنگیا برادری کا ایک مختصر سا طبقہ جو برمی اسکولوں اور کالجوں سے مستفید ہے، اس کی چاہت یہی ہے کہ روہنگیا زبان کا رسم الخط برمی یا برمی زبان کے رسم الخط سے ملتا جلتا ہو، ایک ہی جملہ میں یہی طبقہ دانستہ یا نادانستہ یا کسی سازش کے لپیٹ میں آ کر اپنی ثقافتی، تہذیبی، ملی اور قومی اقدار کو برمی تہذیب و ثقافت سے جوڑنا چاہتا ہے، اور اس کا یہی بھی کہنا ہے کہ ہم برمی ہیں اور ارکان کا یہ علاقہ برما کا ایک

حصہ ہے اور ہمارا مستقبل برما کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اسی لئے ہمارا رسم الخط بھی برمی رسم الخط یا اس سے ملتا جلتا ہونا چاہئے۔

(۲) لاطینی رسم الخط کے فریفتے:

دوسرا وہ طبقہ جو لاطینی تہذیب وثقافت سے بری طرح متأثر ہے، چاہتا ہے کہ روہنگیا رسم الخط انگریزی یعنی لاطینی رسم الخط پر مبنی ہو، تاکہ اس کے مطابق عالمی تہذیب وثقافت سے روہنگیا مسلمانوں کے رشتے مضبوطی سے جڑ جائیں، اس کے زعم میں مغربی تہذیب وثقافت ہی عالمی تہذیب وثقافت ہے۔ اول تو بات یہی ہے کہ مغرب کے پاس تو کوئی بامعنی تہذیب وثقافت ہی نہ تھی، اور آج بھی جتنی اور جس قدر اس حوالے سے یہاں مفید چیز نظر آ رہی ہے وہ اسلام کی رہین منت ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر طویل گفتگو کی ضرورت ہے۔ پھر روہنگیا مسلمانوں کے اس طبقے کو اپنی زبان کے لئے لاطینی رسم الخط کے اپنانے میں چند فوائد بھی نظر آ رہے ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(الف) ایک عالمی رسم الخط سے روہنگیا رسم الخط کا راہ ورسم ہو جائے گا۔

(ب) آج کل کی دنیا گلوبلائزیشن کی دنیا ہے، لاطینی رسم الخط والوں کی ایک انتہائی جد جہد اور منظم کوشش یہ رہی ہے کہ دنیا کی ساری زبانیں لاطینی رسم الخط میں لکھی جائیں۔ تو اس صورت میں عالمی تہذیب وثقافت سے روہنگیا رسم الخط اپنا ناطہ جڑ کر خود روہنگیا زبان بھی عالمی زبانوں سے قربت حاصل کر لے گی، اور گلوبلائزیشن کے اس پروگرام میں مسلمانان ارکان بھی حصے دار ہو سکیں گے۔

(ج) جب ہمای زبان کا رسم الخط لاطینی رسم الخط ہوگا تو لاطینی زبان ورسم الخط والی آج کل کی مادی اعتبار سے طاقتور دنیا ہماری معاون ہو جائے گی، اس وقت روہنگیا زبان وادب کی ترقی کے لئے ایک راہ ہموار ہو جائے گی، جو ہم جیسی نادار اور پریشان حال قوم کے لئے ناگزیر ہے۔

(د) آج کل کس باخبر سے مخفی ہے کہ انٹرنیشنل اسٹنڈ یریٹ آرگنائزیشن (ISO) جیسی ایک عالمی تنظیم ہے، جو اپنے دیگر عالمی معیار کے کاموں کے علی الرغم دنیا کی زبانوں کے لئے ایک ایک سیریل نمبر مقرر کرتی ہے، ماضی میں اس کے یہاں روہنگیا زبان کا کوئی ایک خاص نمبر نہ تھا، بلکہ اس نے روہنگیا زبان کو چاٹگامی زبان کا ایک حصہ قرار دے رکھا تھا، تو چند سال پہلے ہمارے ایک دانشور نے

لاطینی رسم الخط میں روہنگیا زبان کا ایک خوب صورت ڈزائن ''روہنگیالش'' کے نام سے اس تنظیم کے سامنے پیش کیا تو اس نے اسے بہت پسند کیا، اور روہنگیا زبان کے لئے ایک علیحدہ نمبر بھی مقرر کردیا ہے، اب اس طبقے کی نظر میں روہنگیا زبان اور لاطینی میں اس کا رسم الخط عالمی زبانوں اور عالمی رسم الخطوط کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے، یوں اس کے مطابق جو روہنگیا قوم کی ایک بڑی کامیابی ہے، اور سننے میں آئی کہ روہنگیا زبان اگر لاطینی رسم الخط میں ہوگی تو اس کے لئے ممکنہ تعاون اور امداد بھی اس مذکورہ عالمی تنظیم کی طرف سے مل جائے گی، ہمارے اس طبقے کے خیال میں یہ ایک بڑا اسود مند امر ٹھہرا، جو ان کے زعم میں روہنگیا مسلمانوں کے لئے ایسے حالات میں ناگزیر امر ہے۔

(ھ) لاطینی رسم الخط میں روہنگیا زبان کے ہونے میں اور ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی دکھایا جارہا ہے کہ آج کا دور چونکہ کمپیوٹر کا دور ہے، تو روہنگیا زبان کے لئے کمپیوٹر میں ازسرنو کسی ڈزائن کی ضرورت نہیں ہوگی، کیوں کہ ظاہر ہے کہ کمپیوٹر کے تمام پروگرام ہی بنیادی طور پر لاطینی رسم الخط میں ہیں، اور روہنگیا زبان کے لئے ناگزیر حروف ورموز بھی اس میں موجود، تو ہمارے لئے اس حوالے سے کام آسان ہو گیا ہے، اس طبقے کا کہنا ہے کہ روہنگیا ایک غریب اور مفلوک الحال قوم ہے، اور دنیا کی غریب اور مسکین ترین قوموں کی صف میں بھی اس کا نمبر تقریبا اولین سطر میں ہے، تو ایسے حالات میں ہمارے لئے ایک بنے بنائے رسم الخط ہی مفید ہے، روہنگیا زبان کے لئے اگر لامحالہ ایک نیا رسم الخط اپنایا جائے گا تو سینکڑوں مشکلات ہمارے سامنے کھڑی ہو جائیں گی، ہمارے ایسے حالات میں ان مشکلات کے سمندر کو کامیابی سے پار کرنا ہماری بس کی بات نہیں ہے۔

(۳) بنگلا زبان اور رسم الخط پر قانعین:

(ا) آج کل ایک بھاری اکثریت جن میں چند علماء بھی ہیں اور دانشوران بھی، جن میں حضرت مولانا اڈووکیٹ شفیق احمد صاحب (مرحوم) قابل ذکر اور ناقابل فراموش ہیں، جن کی چاہت یہی ہے کہ روہنگیا زبان کا ایک علیحدہ رسم الخط یا کسی دیگر زبان سے ملتے جلتے رسم الخط کی تھوڑی ضرورت نہیں، بس بنگالی زبان و ادب ہی کافی ہے، اور یہ حضرات اپنے دعوے کے حق میں چند دلائل بھی پیش کرتے ہیں کہ:

(الف) نسلی، دینی، تہذیبی وتمدنی، اور رسم ورواج، جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے مسلمانان ارکان بنگالی قوم کا ایک اٹوٹ حصہ ہے، اور تو اور چند صدی پہلے کی بات ہے کہ زبان وادب کے حوالے سے پوری سرزمین بنگال جب اندھیاری میں ڈوبی ہوئی تھی، تو اس وقت سرزمین ارکان نے ہی بنگلا زبان و ادب کو سنبھالا اور سنوارا تھا، جس کے درجنوں دلائل موجود ہیں، اور جس کا اعتراف بنگالی مورخین اور اہل علم ودانش نے بھی کیا ہے، ویسے بنگلا زبان وادب جس طرح بنگالیوں کا قومی ورثہ ہے، ٹھیک اسی طرح روہانگ میں بسنے والے مسلمانوں کا بھی قومی ورثہ ہے، ماضی قریب میں بھی مسلمانان ارکان میں بنگلا زبان وادب کا چرچا تھا، اور حال میں بھی یہاں اکا دکا ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کو بنگلا زبان وادب کی مہارت حاصل ہے، اس لئے اگر ارکان کے مسلمان اپنے قومی ورثہ سے رشتہ رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے بنگلا زبان وادب کے بغیر دوسری کسی زبان اور رسم الخط کی ضرورت نہیں، بنگلا ہی ان کے لئے کافی ہے۔

(ب) ڈھاکہ، بریسال، کھلنا، سلہٹ، یا مغربی بنگال اور مشرقی بنگال کو رہنے دیجئے، صرف اور صرف چاٹگامی بنگالیوں کو لیجئے، کڑوروں چاٹگامی اگر بنگلا زبان وادب کو اپنا کر اور اس میں پوری مہارت حاصل کر کے اپنا کام کر سکتے ہیں، تو ارکانی مسلمان کیوں نہیں کر سکتے؟ اور چاٹگامی بنگالی اور ارکانی مسلمانوں میں زبان کے حوالے سے فرق ہے تو کتنا فرق ہے؟؟ آخر اتنا فرق بھی تو نہیں ہے، جتنا چاٹگامی اور دیگر مذکورہ علاقے والوں کے مابین ہے۔

(ج) کرۂ ارضی میں بنگالی ایک بڑی قوم ہے، مغربی اور مشرقی بنگال کو ملا کر کوئی تیس پینتیس کڑوروں پر مشتمل بنگالی قوم آباد ہے، اور تو اور ہندوستان یعنی برصغیر میں زبان کے اعتبار سے بنگالی سب سے بڑی قوم ہے، جس طرح بنگالی لوگ حالیہ ہندوستان میں ہیں اسی طرح بنگلا دیش میں بھی ہیں، ہندوستان میں بسنے والے بنگالی ہندوستانی ہیں اور بنگلا دیش میں بسنے والے بنگلا دیشی، ٹھیک اسی طرح ارکان میں بسنے والے ارکانی یا برمی بنگالی ہو کر رہنے میں کیا خرابی ہے؟ اور بنگلا زبان میں جس طرح:

☆ علاقۂ ڈھاکہ میں رہنے والوں کو (ڈھاکایا) کہا جاتا ہے،

☆ بریسال والوں کو (بریسایلا)

☆ کھلناوالوں کو(کھلنایا)

☆ چاٹگامیوں کو(چیٹا ینگیا)

☆ ٹھیک اسی طرح روہانگ جوجغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے بنگال کا ایک ملحق علاقہ ہے، یہاں بسنے والے بنگالیوں کو روہنگیا کیوں نہیں کہا جاسکتا؟ اگر سیاسی حد بندی اس میں مانع ہے تو مغربی بنگالیوں (جو ہندوستان میں آباد ہیں) کو بنگالی کہنے میں کیوں کوئی پریشانی نہیں ہوتی؟؟ غرض ان لوگوں کا مدعا یہی ہے کہ ارکان جس کا قدیم معروف نام روہانگ ہے، یہاں کے مسلمانوں نے ماضی قریب اور بعید میں بہت ساری سیاسی غلطیاں کیں، اگر اب بھی بنگلا زبان وادب اور رسم الخط کو اپنائے بغیر ایک علیحدہ رسم الخط یا اور کسی رسم الخط کو اپنا لیا گیا تو ان کا رہا سہا رشتہ بھی اپنے بھائیوں سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا، ماضی قریب وبعید میں اپنے ان بھائیوں نے ہماری ہر قسم کی مدد کی، اور مستقبل میں بھی ان سے تعاون اور امداد ونصرت کی توقع ہے، تو بنگلا کو چھوڑ کے کیوں ہم اپنے بھائیوں سے بچھڑنے کا سامان خود پیدا کریں؟ آخر اس میں ہمارا فائدہ تو نہیں، بلکہ نقصان ہی نقصان ہے۔

(د) ہمارے ان حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہمیں دیگر کسی بھی رسم الخط کی سرے سے ضرورت ہی نہیں، بنگلا زبان وادب ہی ہمارے لئے کافی ہے، ہم نسلی اعتبار سے بھی بنگالی اور زبان کے اعتبار سے بھی بنگالی ہیں، اور ہماری زبان بنگلا زبان کا ایک اٹوٹ شاخ ہے، جس طرح چاٹگامیوں، ڈھاکہ والوں، سلہٹیوں، اور بریسالیوں کی اپنی اپنی علاقائی بنگالی زبانیں ہیں، ٹھیک اسی طرح ہماری زبان کا معاملہ ہے، رہی بنگلا فصیح زبان جسے بنگلا میں ''شدو بھاشا'' کہا جاتا ہے، یہ تمام بنگلا باسیوں کا مشترکہ ورثہ ہے، ہر ایک کے اپنے اپنے علاقائی لہجے ہونے کے باوجود، ہر ایک کا یہی ماننا ہے کہ بنگلا کی فصیح زبان ہر ایک کی مشترکہ زبان ہے، جس میں کسی کا اختلاف اور دورائے نہیں، اس ضمن میں غور کیا جاسکتا ہے کہ اگر چاٹگام والے بنگلا کی فصیح زبان کو اپنے قومی ورثہ کے بطور اپنی زبان مان سکتے ہیں تو ارکان میں رہنے والے کیوں مان نہیں سکتے؟ ارکانیوں کی زبان اور چاٹگامیوں کی زبان میں کتنا فرق ہے؟ ویسے لب ولہجہ کا فرق تو خود ارکانیوں کی زبان میں بھی ہے، آیا اتنا ہی فرق کی بنا پر منگڈو اور بوسیدنگ والے اپنے اپنے علیحدہ رسم الخط پر زبانیں لکھا کریں گے؟ یہ تو ان ہونی چیز ہے۔

(۴) ایک جداگانہ رسم الخط کے متوالے:

پچھلے چند سالوں سے ہمارے ایک صاحب نے روہنگیا رسم الخط کے حوالے سے ایک انوکھے انداز کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے، ماشاء اللہ آپ کی قابلیت اور استعداد کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، مہارت کا ایک عالم ہے کہ انہوں نے اپنے مطابق ایک نئے رسم الخط ایجاد کر کے روہنگیا جیسی ایک مظلوم قوم کے سامنے اپنی انوکھی خدمت پیش کر دی ہے، اللہ تعالی ان کا بھلا کرے، ماضی میں ان کو ہم ایک اسلامی ذہنیت اور دینی افکار ونظریات کے عالم سمجھتے رہے تھے، قرآن وسنت سے معلوم نہیں کتنا، مگر حکیم سنائی اور سعدی شیرازی وغیرے سے ان کا رشتہ بہت گہرا ہے، بڑے فنکار اور ماہر ہیں، انہوں نے اپنی روشن خیالی اور نرالے فن کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک رسم الخط نما چیز سے کچھ لوگوں کو متعارف کرایا ہے، اور اس کے ذریعے ہم جیسے غریبوں اور مسکینوں کو قرآن وسنت کی بنیادی اور لازوال افکار ونظریات سے بچھڑ جانے کی ایک عجیب اور منفرد انداز میں دعوت دی ہے، ان کے بعض حواریوں نے (شاید ان کی ایماء پر ہو) ہمارے بعض نادانوں کے کان میں یہ صور پھونکا ہے کہ :

''روہنگیا اس کرۂ ارضی میں ایک علیحدہ قوم ہے، جس کی ایک علیحدہ زبان ہے، اب اس زبان کی بقا وازدھار کے لئے ایک علیحدہ رسم الخط ناگزیر ہے، جس کا دنیا کی کسی زبان کے رسم الخط سے الگ تلک ہونا ضروری ہے''۔

انہوں نے اپنے دعوی کے مطابق ایک رسم الخط کا اختراع کر کے روہنگیا مسلمانوں کے ایک چھوٹے اور منفعل سے طبقے کو اگر چہ ایک مدت کے لئے سہی مزید منفعل بلکہ بدحواس بنا دیا تھا۔ یوں بھی ہمارے لئے یہ ایک المیہ ہے کہ امام الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی کے مکتب فکر کے کسی ایک مدرسہ کے فارغ التحصیل کے ذہن رسا میں اپنی قومی زبان کے لئے قرآنی رسم الخط کے بجائے ایک جناتی رسم الخط کا تصور آ گیا ہو، جب کہ اس کے بالکل برعکس ہمارے وہ بعض مشاہیر جنہیں دانشوران کہا جاتا ہے، جن کی تعلیمی زندگی قال اللہ وقال الرسول کے زمزمے سے دور تھی، انہوں نے اپنی قومی زبان کو قرآنی رسم الخط میں لکھنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے۔ بہر حال ہمارے اس سوال کا جواب ابھی تک کہیں سے نہیں ملا کہ آیا ہمارے وہ موجد رسم الخط صاحب معذور تھے یا مجبور؟ اور یہی ضرور سچ ہے کہ

محترم بڑے پائے کے شہسوار تھے، زخم سے چور دم واپسیں لینے والے، اللہ معلوم آج کل دنگل سے دور کس جنگل میں اپنے تمام منفرد سروسامان لئے منتظر فردا ہیں؟ بچارے اتنے دنوں تک روہنگیا مسلمانوں کی مظلومیت ومعصومیت پر ترس رہے تھے، اب بالا بالا سنی جارہی ہے کہ آج کل ارکان میں آپ روہنگیا مسلمانوں سے بڑھ کر ظالم مگھوں کو زیادہ مظلوم پاتے ہیں تو مرغ بسمل جیسے تڑپ رہے ہیں، خدا جانے بات کہاں تک صحیح ہے۔ اورفتوی سازی کا عجیب وغریب سلیقہ ہے، اور انداز بھی بڑا عجیب ونرالا اور حیرت انگیز، لطف یہ ہے کہ ایک طویل مدت تک ارکان کے حوالے سے ان پر فرضیت جہاد کا فتوی صادر کرنا لازم تھا، آج عدم فرضیت جہاد پر فتوی صادر کرنا لازم ہوگیا ہے، زندگی میں فیصلے بدلنے کا عجیب انداز ہے اور انوکھی ادا، نظر ان کی اتنی عمیق اور اتنی دوررس ہے کہ ارکانی مسلمانوں کی مظلومیت اور معصومیت کی پوری داستان ہی ان کو آج الٹی اور بدلی نظر آرہی ہے۔ تو اب کیا کہا جائے اور شکایت کروں تو کس سے کروں، افسوس!

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوے کس درجے فقیہان حرم بے توفیق

پھر ان کے بعض حواریوں کی یہ بات: (روہنگیا اس کرۂ ارضی میں ایک علیحدہ قوم ہے، الخ) جس مدعا پر مبنی ہے، ہم اسے سرے سے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوسکتے، ہم کہہ چکے ہیں کہ دینی بنیاد پر ارکان کے مسلمانوں کو ہم دنیا کے دیگر ممالک اور خطے کے مسلمانوں کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھتے ہیں، اور سمجھتے ہی رہیں گے، جسے ہم یہاں اس عجالے میں بھی بار بار دھرا رہے ہیں۔ اور قرآن حکیم کا یہ اعلان:

{یا أیھا الناس انا خلقناکم من ذکر وأنثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا، ان أکرمکم عنداللہ أتقاکم ان اللہ علیم خبیر} الحجرات: ۱۳۔

ترجمہ: لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، بیشک اللہ تعالی علیم وخبیر ہے۔

دراصل اس آیت میں پوری نوع انسانی کو خطاب کرکے اس عظیم گمراہی کی اصلاح کی گئی ہے جو دنیا

میں ہمیشہ عالمگیر فساد کی موجب بنی رہی ہے، یعنی نسل، رنگ، زبان، وطن اور قومیت کا تعصب۔ قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے، جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا گیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور کسی اخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں۔ کہیں ان کی بنا ایک خاندان، قبیلے یا نسل میں پیدا ہونا ہے۔ اور کہیں ایک جغرافیائی خطے میں یا ایک خاص رنگ والی یا خاص ایک زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہونا۔ پھر ان بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے، وہ صرف اس حد تک محدود نہیں رہی کہ جنہیں اس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو کہ ان کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اس تمیز نے نفرت، عداوت، تحقیر وتذلیل اور ظلم ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اس کے لئے فلسفے گھڑے گئے، مذاہب ایجاد کئے گئے، قوانین بنائے گئے اور اخلاقی نما اصول وضع کئے گئے ہیں، قوموں اور سلطنتوں نے اس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے تو اس حوالے سے کمال کردیا کہ اسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق ٹھہرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا تھا، جس کی رو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھہرائے گئے، اور شودروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز کے ذریعے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے گئے، تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، یورپ کے لوگوں نے بر اعظم امریکہ میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو بدترین سلوک کیا، اور ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کر کے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا، اس کی تہ میں بھی یہ تصور کارفرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے حدود سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال، عزت وآبرو ان کے لئے مباح ہے، اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ ان کو جی بھر کے لوٹیں اور من پسند غلام بنائیں، اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالیں۔ مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں کے لئے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے، اس کی بدترین مثالیں پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں دیکھی گئی ہیں۔ خصوصیت کے

ساتھ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیت اور ناڈک نسلیت کی برتری کا تصور پچھلی جنگ عظیم دوم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے، انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو ایک آدمی بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے، جس کی اصلاح کے لئے قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی ہے۔

اور اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالی نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے تین نہایت اہم اور اصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) فرمایا ہے کہ تم سب کی اصل ایک ہے، ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے، اور آج تمہاری جتنی بھی نسلیں دنیا میں پائی جاتی ہیں وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں، جو ایک باپ اور ایک ماں سے شروع ہوئی تھی، اس سلسلۂ تخلیق میں کسی جگہ بھی اس تفرقے اور اس اونچ نیچ کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے، جس کے زعم باطل میں تم مبتلا ہو۔ ایک ہی خدا تمہارا خالق ہے، ایسا نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف خداؤں نے پیدا کیا ہو۔ ایک ہی مادۂ تخلیق سے تم بنے ہو، ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ انسان کسی ناپاک یا گھٹیا مادے سے بن گئے ہوں، ایک ہی طریقے سے تم پیدا ہوئے ہو، یہ بھی نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کے طریق پیدائش الگ الگ ہوں۔ اور ایک ہی ماں باپ کی تم اولاد ہو، یہ بھی نہیں ہوا ہے کہ ابتدائی انسانی جوڑے بہت سے رہے ہوں، جن سے دنیا کے مختلف خطوں کی آبادیاں الگ الگ پیدا ہوئی ہوں۔

(۲) دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ پوری روئے زمین پر سارے انسانوں کا ایک ہی خاندان تو نہیں ہو سکتا تھا نسل بڑھنے کے ساتھ ساتھ ناگزیر تھا کہ بے شمار خاندان بنیں، پھر خاندانوں سے قبائل اور قبائل سے اقوام وجود میں آ جائیں۔ اسی طرح زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ، خد وخال، زبانیں اور طرز بود و ماند بھی لامحالہ مختلف ہی ہو جانے تھے، اور ایک خطے کے رہنے والوں کو باہم قریب تر اور دور دراز خطوں کے رہنے والوں کو بعید تر ہی ہونا تھا۔ مگر اس فطری فرق و اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنیاد پر اونچ اور نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کمتر کے امتیازات قائم کئے جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں کو

ذلیل وخوار اور حقیر جانیں، ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تفوق جمائے، اور انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح حاصل ہو۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتب کیا وہ صرف یہ تھی کہ ان کے درمیان باہمی تعارف اور تعاون کی فطری صورت یہی تھی۔ اسی طریقے سے ایک خاندان، ایک برادری، ایک قبیلے، اور ایک قوم کے لوگ مشترک معاشرت بنا سکتے تھے اور زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن سکتے تھے۔ مگر یہ صرف شیطانی جہالت تھی کہ جس چیز کو اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے تعارف کا ذریعہ بنایا تھا، اسے تفاخر وتنافر کا ذریعہ بنالیا گیا، اور نوبت ظلم وعدوان تک پہنچادی گئی۔

(۳) تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے یا ہو سکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے، پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں، کیوں کہ ان کے پیدا کرنے والا ایک ہے، ان کا مادۂ پیدائش اور طریق پیدائش ایک ہی ہے، اور ان سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا ہے، علاوہ بریں کسی شخص کا کسی خاص ملک، قوم یا برادری میں پیدا ہونا ایک اتفاقی امر ہے، جس میں اس کے اپنے ارادے وانتخابات اور اس کی اپنی سعی وکوششوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہو۔ اصل چیز جس کی بنا پر ایک شخص کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا، برائیوں سے بچنے والا اور نیکی و پاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو۔ ایسا آدمی خواہ کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنی ذاتی خوبی کی بنا پر قابل قدر ہے۔ اور جس کا حال اس کے برعکس ہو، وہ بہر حال ایک کمتر درجے کا انسان ہے، چاہے وہ کالا ہو یا گورا، مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔

یہی حقائق جو قرآن کی ایک مختصر سی آیت میں بیان کیے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے مختلف خطبات اور ارشادات میں زیادہ کھول کر بیان فرمایا ہے، فتح مکہ کے موقع پر طواف کعبہ کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی، اس میں فرمایا:

{الحمد لله الذی اذهب عنکم عیبة الجاهلیة و تکبرها۔ یا ایها الناس، الناس رجلان، بر تقی کریم علی الله، و فاجر شقی هین علی الله۔ الناس کلکم بنو آدم، و خلق الله آدم من

تراب} (بیهقی فی شعب الایمان، و سنن ترمذی)

ترجمہ: شکر ہے اس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبر دور کر دیا۔ لوگو! تمام انسان بس دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار، جو اللہ کی نگاہ میں عزت والا ہے، دوسرا فاجر اور شقی، جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تقریر کی اور اس میں فرمایا:

{ یا أیها الناس، ألا ان ربکم واحد، لا فضل لعربی علی عجمی ، ولا لعجمی علی عربی، ولا لأسود علی أحمر، ولا لأحمر علی أسود الا با لتقوی، ان أکرمکم عند الله أتقاکم۔ ألا هل بلغت ؟قالوا بلی یا رسول الله، قال فلیبلغ الشاهد الغائب} (بیهقی)

ترجمہ: لوگو! خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر، اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر تقوی کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے، جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ! میں نے تمہیں بات پہنچا دی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: اچھا جو موجود ہے وہ ان لوگوں تک یہ بات پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔

ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ:

{کلکم بنو آدم و آدم من تراب و لینتهین قوم یفخرون بآبائهم أو لیکونن أهون علی الله من الجعلان} (بزار)

ترجمہ: تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، لوگ اپنے آباواجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں، ورنہ وہ اللہ کی نگاہ میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

{ ان الله لا یسئلکم عن احسابکم و لا عن أنسا بکم یوم القیامة ، ان أکرمکم عند الله

أتقاکم} (ابن جریر)

ترجمہ: اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب ونسب نہیں پوچھے گا۔ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے، جو سب سے زیادہ پرہیزگار رہو۔

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

{ان الله لا ینظر الی صورکم وأموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم وأعمالکم} (مسلم۔ ابن ماجه)

ترجمہ: اللہ تمہاری صورتیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔

یہ اسلامی تعلیمات صرف الفاظ کی حد تک محدود نہیں رہی ہیں، بلکہ اسلام نے ان کے مطابق اہل ایمان کی ایک عالم گیر برادری عملا قائم کر کے دکھا دی ہے، جس میں رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں، جس میں اونچ نیچ اور چھوت چھات اور تفریق وتعصب کا کوئی تصور نہیں، جس میں شریک ہونے والے تمام انسان، خواہ وہ کسی نسل وقوم اور ملک و وطن سے تعلق رکھتے ہوں، بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں، اور ہوئے بھی ہیں، اسلام کے مخالفین تک کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ انسانی مساوات اور وحدت کے اصول کو جس کامیابی کے ساتھ مسلم معاشرے میں عملی شکل دی گئی ہے، اس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی مذہب اور کسی نظام میں نہیں پائی جاتی، اور نہ کبھی پائی گئی ہے، صرف اور صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے روئے زمین کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی بے شمار نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک ہی امت بنا دیا ہے۔

اسی لئے ہم کہنا چاہتے ہیں کہ ارکان کے یہ روہنگیا مسلمان دنیا کے دیگر مسلمانوں کا ایک حصہ ہے، اور اسلام نے مسلمانوں کے مابین جو رشتہ جوڑ دیا ہے اسے ہم توڑنا نہیں چاہتے، بلکہ اسے مزید پائدار کرنا چاہتے ہیں، یوں ہم عربی رسم الخط کو اپنی قومی زبان کا رسم الخط بنا کر پوری مسلم امت کے ساتھ ہمارا رشتہ جڑے رکھنا چاہتے ہیں، اور زبان و رسم الخط کے حوالے سے جس پر امت کی وحدت کا مدار ہے، جیسے امت مسلمہ کی سب سے بڑی اور بین الاقوامی تنظیم کی قرارداد بتا رہی ہے، ویسے ہم عربی

زبان اور رسم الخط کے حوالے سے مسلم امۃ کی بین الاقوامی تنظیم منظمۃ التعاون الاسلامی کی قرارداد بتاریخ ۸/ ۴/ ۱۹۷۷ء کی بھرپور حمایت کرتے ہیں، جس کا نص یہ ہے:

{الحروف العربية: يؤكد المؤتمر على ضرورة الحفاظ على الحروف العربية لكتابة لغات الشعوب الاسلامية حتى لا يباعد بين هذه الشعوب وبين القرآن الكريم} توصيات المؤتمر، ص ۲۵۔

اور ایک دوسری قرارداد بھی ملاحظہ کیجئے:

{ولما كانت المحافظة على الحرف العربي بشكله ورسمه واجبا مقدسا، يجب أن تلتزم به الدول الاسلامية، مما يستوجب على الدول الاسلامية التي اعتمدت حرفا آخر غير الحرف العربي لكتابة لغاتها، وكذلك الدول التي تفكر في اتخاذ مثل هذه الخطوة، اعادة النظر في هذا الأمر} توصيات المؤتمر، ص ۹۹۔

(۵) عربی رسم الخط کے حامی مفکرین:

اللہ تعالی کا خاص کرم ہے کہ اس منتشر اور دل دوز حالات میں بھی روہنگیا مسلمانوں کا ایک نباض، رمز شناس، دور بین اور دردمند طبقہ بھی ہے، جس کا کہنا ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کی ایک علیحدہ زبان ہے اور ضرور ہے، جہاں تک اس کے رسم الخط کا تعلق ہے وہ عربی ہی ہونا ضروری ہے، ظاہر ہے کہ عربی رسم الخط ایک ایسا رسم الخط ہے، جس کا سر وعلن، پیچ وخم، اور رسم وراہ علمی، فکری اور روحانی اعتبار سے مکمل طور پر اسلام، قرآن وسنت اور مسلمانوں کی دینی روایات سے مربوط ہے، پوری اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کو اس راہ ورسم سے علیحدہ کر کے منتشر اور سراسیمہ کرنے کے لئے زوردار ایک عالمی سازش پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ چلی اور چل رہی ہے، جس کی سینکڑوں مثالیں ہیں، اور جس کی تفصیلات کے لئے ایک علیحدہ کوشش کی ضرورت ہے، یہ عجالہ اس کا متحمل نہیں۔ ماضی میں ایک سے زیادہ مسلم قوموں اور اسلامی ملکوں کی زبانیں اس عالمی سازش کی شکار ہوگئی ہیں، جن میں ترکی زبان سرفہرست ہے، ان سازش خوردہ اسلامی زبانوں کے علاوہ میرے علم کے مطابق تمام کے تمام مسلم ملکوں اور خطوں کی زبانیں جو بھی ہوں مگر ان کا رسم الخط عربی ہے، ہمارے ان مفکرین کا مطالبہ بلکہ مطالبہ سے

بڑھ کر حقیقت پر مبنی یہ نظریہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو اپنے ماضی سے، دین سے، قدیم مگر روشن تہذیب و ثقافت اور روایات سے رشتہ بحال رکھنا ہے تو ان کی زبان کا رسم الخط قرآنی رسم الخط ہونا ضروری ہے، اس لازوال اصول کے تناظر میں ویسے مسلمانان ارکان چونکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کا ایک حصہ ہیں، ان کی زبان کا رسم الخط بھی عربی ہونا لازم ہے، جو ظاہر ہے کہ ایک عالمی، خالص دینی، روحانی اور زندہ ثقافتی رسم الخط ہے، اگر مسلمانان ارکان دنیا بھر کے مسلمانوں کا حصہ بن کر رہنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ عربی رسم الخط میں ان کی زبان کو لکھا جائے، ورنہ معاذ اللہ ان کا دینی، روحانی اور ثقافتی رشتہ اسلام سے کٹ کر رہ جانے کا شدید اندیشہ ہے، بلکہ بعض مفکرین کے نزدیک اندیشہ سے بڑھ کر رشتہ کٹ جانا یقینی ہے، ویسے عربی رسم الخط کی طرف اس طبقہ کا رجحان دینی، ثقافتی، علمی اور فکری ہے، جو علمی، دینی اور روحانی اعتبار سے بھی بڑا معنی خیز ہے۔ اور:

(الف) ہمارے عربی رسم الخط کے حامی مفکرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہمیں یعنی ارکانی مسلمانوں کو اسلامی روایات واقدار سے ہر حالت میں وابستہ رہنا ہے، ہم مسلمانوں کو قرآنی زبان اور رسم الخط کا سیکھنا سکھانا ویسے بھی دینی اعتبار سے ضروری ہے، اور تو اور ہم اپنے بچوں کی تعلیمی شروعات ہی اسی سے کرتے ہیں، جو نہ صرف ہم ارکانی مسلمانوں کی ملی وقومی روایت ہے، بلکہ یہی روایت پوری امت مسلمہ کی مشترکہ روایت بھی ہے، اور ظاہر ہے کہ قرآنی رسم الخط اور قرآنی زبان کے سیکھے بغیر قرآن و سنت اور اسلامی لٹریچر سے استفادہ ممکنات میں سے نہیں ہے، اسی لئے ہم مسلمان اپنی اولاد کو شروع ہی میں اسلامی یعنی قرآنی رسم الخط کی تعلیم دیتے ہیں، ویسے ہماری قومی زبان کا رسم الخط بھی اگر قرآنی رسم الخط پر مبنی ہو تو ایک تیر سے دو نشانے (اہداف) حاصل ہو جائیں گے، یعنی قرآنی رسم الخط کے سیکھنے کے ساتھ ساتھ قومی رسم الخط بھی خود بخود حاصل ہو جائے گا، اور قرآنی رسم الخط کے سیکھنے کے بعد بطور خاص ہمارے بچوں کے لئے قومی زبان کا پڑھنا آسان بلکہ آسان تر ہو جائے گا، جس طرح پاکستان، افغانستان، ایران سمیت دنیا کی بیشتر مسلم قوموں اور اسلامی زبانوں کا حال ہے، البتہ اس ضمن میں یہ الگ بات ہے کہ زبان پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے ضرورت کی بنیاد پر چند ایک حروف اور رموز کا اضافہ ہوسکتا ہے، جس طرح اردو اور فارسی وغیرہ کی حالت ہے، اور میرے ناقص علم

کے مطابق دنیا بھر کی کسی بھی اسلامی زبان میں، جن کا رسم الخط عربی ہے، قرآنی حروف میں کمی نہیں کی گئی، شاید اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی ہو، یوں روہنگیا رسم الخط کے لئے بھی اس تعمیری انداز میں سوچا جاسکتا ہے، اسی سے کم سے کم ہمارے بچوں کو دو فائدے ہوں گے:

☆ قرآنی حروف جو ہماری تعلیم کے حوالے سے ہر اعتبار سے بنیاد ہیں، حاصل ہو جائیں گے۔ اور

☆ ان قرآنی حروف کے حصول کے ساتھ ساتھ، ہماری قومی زبان کے حروف بھی خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔

بخلاف اس کے ہمارے لئے دو زبان یعنی مذہبی زبان اور قومی زبان کے حصول کے لئے دو مختلف قسم اور دو متنوع طرز تعمیر کے حروف کا حصول لازم ہو جائے گا، جو ایک بڑا بوجھ ہونے کے علاوہ اس کی وجہ سے انگنت پیچیدگیوں اور مشکلات کا سامنا یقینی ہے، اس حوالے سے دور جانے کی ضرورت نہیں، سمجھنے کے لئے بنگلا زبان اور لٹریچر ہمارے سامنے ہے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے، جس کی تفصیلات پر جانا سر دست ممکن نہیں۔ بہرکیف عربی رسم الخط کے حامی ہمارے ان مفکرین کی اس تعمیری فکر پر ایک سرسری نظر ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ روہنگیا رسم الخط کا عربی میں ہونا کتنا اہم ہے۔ اگر کوئی کج فہم، موٹی عقل، اور ضدی مزاج کا انسان نہ ہو تو اس کو اس واضح اور تعمیری بات کے سمجھنے کے لئے بڑی امعان نظر اور خاص غور وفکر کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(ب) ادھر اور ایک نقطۂ نظر سے سوچا جائے تو ایک کھلی ہوئی بات حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ امت مسلمہ کے زوال واضمحلال کا بنیادی سبب ہی اسلامی تعلیمات سے روگردانی ہے، مسلمان ایک قوم ہے، عالمی قوم، ایک مسلمان جس ملک یا جس خطے میں ہو، اس کا جینا مرنا اس تصور پر مبنی ہونا چاہئے کہ وہ عالمی مسلم برادری کا ایک فرد ہے، اس حوالے سے شاعر مشرق کا کہنا ہے کہ:

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

مسلمان ایک عالمی قوم ہے، تو ایک عالمی قوم کے لئے ایک عالمی تہذیب وثقافت کے ساتھ پوری یک جہتی اور مکمل ہم آہنگی ایک لازمی امر ہے۔ اور رسم الخط کا جہاں تک تعلق ہے یہ ایک تہذیب اور

ایک ثقافت کے لئے سب سے بڑا اور بنیادی عنصر ہوتا ہے، تو ایک مسلم قوم اپنی اسلامی تہذیب و ثقافت اور دینی اقدار وروایات سے بچھڑنا چاہتی ہے تو اس کے لئے کافی ہے کہ اسلامی رسم الخط کو چھوڑ کر دوسرے کسی رسم الخط کو اپنا لے۔ زبان ورسم الخط کے حوالے سے اسلامی ثقافت اور دینی روایات کا کامل مدار وانحصار ہی قرآنی رسم الخط پر ہے۔ ادھر جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو اس عالمی مذہبی زبان اور عالمی قرآنی رسم الخط سے فارغ کر کے دوسرے رسم الخطوط کی طرف ابھار لانے کی ایک عالمی سازش بین الاقوامی سطح پر چلی اور اب بھی چل رہی ہے، اب کیا ہم سوچے سمجھے اور شعوری طور پر اس عالمی سازش کے شکار ہونے کے لئے تیار ہیں؟ کیا ہم ترکی کی طرح لاطینی اور ہمارے بنگلا باسیوں کی طرح بنگلا رسم الخط (جس کی بنیاد وآساس دیوناگری پر ہے) کو اپنا کر ہمیشہ کے لئے اسلامی رسم الخط سے ناطہ توڑنا چاہتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ میرا اتنا یقین ہے کہ مسلمانان ارکان کتنے ہی مظلوم اور بے کس وبے بس ہی سہی، اس عالمی سازش کے شکار کبھی نہیں ہوں گے، اللہ تعالی ہمیں اس بلا سے محفوظ رکھے، آمین یارب العالمین۔

(ج) ہمارے بعض حضرات کا دعوی ہے کہ ارکان میں جتنے بنگلا زبان میں طبع آزمائی کرنے والے شعراء اور انشاء پرداز تھے، ان کے سارے دواوین اور تمام تصانیف حالیہ بنگالی رسم الخط ہی میں تھیں، جب کہ ان حضرات کے دعوے کے برخلاف بہت ساری چیزیں بطور دستاویزات کے ایسی بھی پائی گئیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان شعراء اور انشاء پردازوں نے عربی رسم الخط میں طبع آزمائی کی اور جولانی قلم دکھائی تھی، اس سلسلے میں سرزمین ارکان کے عظیم شاعر حضرت شاہ علاول، قاضی دولت، سید سلطان سمیت دیگر شعراء وادباء کی تحریریں دریافت ہوگئی ہیں، اب مسلمانان ارکان اپنے تابناک ماضی اور اپنی روشن روایات سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا چاہیں تو یہ الگ بات ہے، اگر ان سے رشتہ بحال رکھنا چاہیں تو ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی روایات کی یاد تازہ رکھتے ہوئے عربی رسم الخط کو اپنا کر اپنی قومی وملی روایات کو زندگی بخش دیں۔

(د) یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ روہنگیا زبان میں عربی الفاظ کا بھرمار ہے، ان عربی الفاظ کو عربی رسم الخط میں لکھنے کے بجائے دیگر کسی رسم الخط میں لکھا جائے تو تلفظ کے ساتھ ساتھ ان کی اصلی شکل اور

ہیئت بھی بدل جانے یا کم سے کم غیر واضح ہوجانے کا شدید اندیشہ ہے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کسی عربی لفظ اور اس کے مطلب سے بخوبی واقف ہو، مگر یہ لفظ کسی دوسرے رسم الخط میں ہونے کی وجہ سے یا یوں کہو کہ اس لفظ کے تلفظ یا ادائیگی میں افراط وتفریط ہونے کی وجہ سے اس کو پتہ بھی نہیں چل رہا ہوگا کہ یہ وہی عربی لفظ ہے، جس کے معنی ومطلب سے وہ واقف ہے۔ پریشانی کا یہی عالم آج ہم بنگلا زبان میں دیکھ رہے ہیں، عوام تو خیر عوام، حد تو یہ ہے کہ بعض اہل علم و دانش بھی اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ بہرحال روہنگیا زبان کو عربی کے بغیر کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنے کی وجہ سے اور بھی انگنت پریشانیاں لاحق ہوسکتی ہیں۔

پھر بعض حلقوں یا کچھ لوگوں کی طرف سے یہ جو مطالبہ کیا جارہا ہے کہ روہنگیا زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کے لئے ماضی میں جن چند بزرگوں نے کوششیں کیں، اور حال میں بھی چند قابل صد احترام حضرات اور کچھ گروہیں اس حوالے سے جدوجہد کررہی ہیں، اور ہرایک حضرات اپنے اپنے طرز تعبیر کے کچھ قواعد اور رموز وغیرے سامنے لائے ہیں، ان کو یکجا کرکے غور وفکر کے ساتھ ان میں سے معقول اور کام کی چیزیں منتخب کی جائیں، ورنہ قوم کسے لے گی اور کسے چھوڑے گی؟ ایسا تو ممکن نہیں کہ سب کو لے گی یا سب کو چھوڑ دے گی۔ میرے خیال میں ان کا یہ مطالبہ بڑا وزن رکھتا ہے۔ لیکن ان کے اس مطالبہ پر عرض ہے کہ: کچھ کام دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں (شاید سارے کام بھی ہوں) کہ جن کے لئے موزون ومناسب وقت کی ضرورت ہوتی ہے، بعض ضروری اور مفید کام بھی وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے ناکامی اور نامرادی کے شکار ہوجاتے ہیں، اور وقت کا جہاں تک تعلق ہے، یہ ماضی، حال، اور مستقبل سبھی پر مبنی ہوسکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح ماضی اور حال کا کام مستقبل کے لئے ٹالا نہیں جاسکتا، ٹھیک اسی طرح مستقبل کا کام جلد بازی پر مبنی ایک منفعلانہ انداز میں حال میں کرنا وقت سے پہلے ہونے کی وجہ سے مفید نہیں ہوسکتا، بلکہ مضر ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ بطور خاص میرے خیال میں زبان ورسم الخط جیسے کاموں کو اپنی طبیعت پر چلنے دینا چاہئے، خواہ مخواہ وقت سے پہلے بزورقوت کرنے کی آرزو کچھ مفید ہونے کے برعکس مضر ہوسکتی ہے۔ غرض بنیادی طور پر رسم الخط عربی میں ہونا ہی کافی ہے، ہرایک کو اپنے مطابق کام کرنے دیجئے، اور ان کو اس کام میں تعاون بھی کیا

جائے۔ ایک موزون وقت انشاء اللہ آئے گا کہ ان تمام محسنین کی کوششیں بارآور ثابت ہوں گی، خلاصے نکل آئیں گے، ان میں سے چھلکے چھوڑے گودے لئے جائیں گے۔ میرے ناقص خیال میں سردست اس حوالے سے جلد بازی کی تھوڑی ضرورت نہیں ہے۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ اب تک قومی سطح پر اس بات کا فیصلہ تو نہیں ہوا ہے کہ روہنگیا زبان کو کس رسم الخط میں لکھا جائے گا۔ تو عربی رسم الخط کے حوالے سے سردست ضرورت اس بات کی ہے کہ:

<u>(٦) کچھ تجاویز:</u>

(۱) روہنگیا زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی جو تحریک ہماری برادری میں پائی جاتی ہے، اسے منصوبہ بندی کے ساتھ تیز سے تیز تر کیا جائے، اور یاد رہے کہ یہ دنیا ایک مسابقہ کی دنیا ہے، یہاں زندگی کے دوڑ میں جو آگے نکل جاتا پایا جاسکتا ہے، جیت اسی کی ہوتی ہے، حق وباطل کے اس مقابلے میں کبھی کبھار باطل کی جیت اس لئے بھی ہوجاتی ہے کہ مسابقت کے میدان میں باطل کا دوڑ زیادہ تیز تھا۔

(۲) اسلامی تعلیمات کی گہرائیوں سے واقف، نباض، دور اندیش اور مستعد افراد پر مشتمل ایک قومی سطح کی کمیٹی کی تشکیل دی جائے، جو متعلقہ امور کو بخوبی انجام دے سکے۔

(۳) عربی رسم الخط کے حامیوں پر مشتمل مناسب موقع ومحل میں ایک قومی سطح کی کانفرس بلائی جائے، جس میں متعلقہ مسائل پر غور وخوض اور مباحثہ کے بعد ایک منصوبہ بندی کے تحت طریقۂ کار اور لائحۂ عمل مرتب ہو۔

بہرحال بات کہاں سے چلی اور کہاں پہنچ چکی ہے، اب کہنا یہی ہے کہ نہ جانے مولانا راغب صاحب کے ذہن رسا میں عربی والی حقیقتیں کیوں نہیں آئیں؟ اور ایک عالم وفاضل ہوکر آپ نے عربی رسم الخط کو کیوں چھوڑا، اور روہنگیا مسلمانوں کے لئے ایک غیر معقول اور نامانوس حرف وضع کرنے پر تل گئے ہیں؟ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ایک ذہین آدمی ہیں، لیکن نہ جانے کس منحوس اور بدبخت کی نظر آپ پر لگ گئی تھی، آپ کی تقریباً ساری سرگرمیاں ناکامی ونامرادی وفضلیات سے عبارت ہوچکی ہیں۔

یہاں ایک بات بتاؤں تو کسی کو بری تو نہیں لگے گی؟ کہتے ں کہ انسان کی زندگی پر نام کا اثر پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ مولانا کا نام محمد حنیف ہے، جو حنف سے مشتق ہے، عربی میں اس کا معنی

ہٹنے، ٹیڑھا ہونے، جھکنے اور موڑنے کے ہیں، اور گستاخی معاف کہ سریانی میں اس کا معنی ''کافر'' اور عبرانی میں ''منافق'' ہے (۱) خدا را کوئی یہ نہ سمجھے کہ آخر الذکر دونوں الفاظ کو میں مولانا حنیف صاحب پر چسپاں کرنا چاہتا ہوں، میں ان کو ایک مسلمان، عالم و فاضل، پکے حنفی المسلک اور دیوبندی المشرب انسان جانتا ہوں، یہاں لفظ کی تحقیق پر دراصل یہ الفاظ آگئے ہیں، اس کے برعکس اور کوئی مقصد یہاں کار فرما نہیں، جب کہ ظاہر ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہمیں یہاں سریانی اور عبرانی سے وہ تعلق ہرگز نہیں جو عربی سے ہے۔

اسلام سے پیشتر اہل عرب اس لفظ ''حنیف'' سے بخوبی واقف تھے، ان کے نزدیک حنیف سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا لقب تھا، اسی لئے ان کے مذہب کے نام کو اسی نسبت سے ملت حنیف رکھا گیا تھا، یوں عرب کے جو نیک دل شرفاء تھے وہ اس وقت عرب میں پائے جانے والے تمام مذاہب یعنی یہودیت، نصرانیت بشمول بت پرستی کے تمام مفاسد سے گھبرا کر کسی صحیح مذہب کی جستجو میں نکلتے تھے، وہ بالآخر اسی آستانۂ حنیف پر آ کر اپنے دل کا اطمینان اور تسلی محسوس کرتے تھے۔

عربی زبان میں یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک اعتبار سے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف سے جھک کر یا مڑ کر یا ہٹ کر دوسری طرف چلا جائے، اگر کسی شخص کو یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر یا اچھے اعمال سے مڑ کر بری بات یا برے اعمال کو اختیار کر لیا تو لفظ حنیف کا معنی ایک منفی معنی ہو جائے گا، جب کہ اس کے برخلاف اگر یہ سمجھا جائے کہ بری بات اور برے اعمال کو ترک کر کے اس نے اچھی بات یا اچھے اعمال کو پسند کر لیا تو اس کا معنی وہی مفہوم ہوگا جو اہل عرب سمجھتے ہیں، یعنی متدین، خدا پرست اور خدا ترس انسان۔

اس بناء پر اس لفظ کے اچھے برے مفہوم کی تعیین اور موقعۂ استعمال حروف صلہ سے ہوگا، دراصل اس لفظ کا ابتدائی استعمال للہ یا للدین کی تخصیص کے ساتھ ہوتا تھا، جیسا کہ الحنیف للہ، جس کا معنی ہے خدا کی طرف جھکنے والا، لیکن بعد میں کثرت استعمال اور زبان زدگیٔ عام سے اس قید کی سرے سے

(۱) ملاحظہ ہو: مارگولیوتھ کی تصنیف: لائف آف محمد، ص:۱۱۶۔

ضرورت نہیں رہی، اور مطلق حنیف کو جھکنے والا سمجھا جانے لگا، چناں چہ قرآن حکیم میں اس لفظ کا دونوں طرح استعمال ہوا ہے، اس حوالے سے سورۃ الحج اور سورہ البینۃ ملاحظہ کیجئے۔

دراصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں تذکرہ شدہ ایک قوم ''صابی'' میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی، آپ علیہ السلام نے دلائل و اعمال سے ان صابیوں کے مذہب کی تردید کی تھی، باطل پرستیوں سے سخت تنفر کا اظہار کر کے خدائے برحق پر اپنے ایمان کامل کا برملا اعلان کیا تھا، آپ علیہ السلام نے بذاتِ خود یا بعد میں آپ پر ایمان لانے والوں نے اپنا لقب ''حنیف'' اختیار کیا تھا، یعنی باطل پرستیوں سے مڑ کر خدائے وحدہ لاشریک لہ پرستی کی طرف آنے والا، چناں چہ اس دعوی کی صحت قرآن کریم کی اس آیت سے پائی جاتی ہے:

'' قال یا قومی انی بری مما تشرکون ، انی وجھت وجھی للذی فطر السماوات والارض حنیفا وما انا من المشرکین (سورۃ الانعام)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ اعلان دین ابراہیمی کا پہلا واقعہ ہے، جس کی یہ عبارت ہے کہ ''میں ہر طرف سے منہ مڑ کر خالق ارض و سماء کی طرف منہ کرتا ہوں، اور اس کے بعد یہ کہنا کہ ''حنیف بن کر'' جس کا صاف و شفاف معنی و مطلب '' انی وجھت وجھی للذی فطر السماوات والارض '' ہے، قرآن کریم کے بہت سارے مقامات میں یہ لفظ آیا ہے، اور وہی مؤخر الذکر معنی مراد لیا گیا ہے، اور ان آیتوں سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ مذہب ابراہیمی کا نام تھا، اور انہی کی یادگار کے بطور ظہور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد باقی رہ گئی تھی، اور ظہور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہود و نصاری کہتے تھے کہ مذہب حق تو یہودیت یا نصرانیت ہے، ابھی یہ کون سا تیسرا مذہب ہے، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں سکھا رہے ہیں؟ تو قرآن کریم نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ:

''قل بل ملۃ ابراھیم حنیفا، وما کان من المشرکین''(البقرۃ)

اسی طرح سورہ آل عمران میں آیا ہے کہ:

''ما کان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا، ولکن کان حنیفامسلما، وما کان من

المشرکین''(آل عمران)

آغاز اسلام میں حق پسند نیک لوگوں کے نام''حنفاء'' کے لقب سے لئے جاتے تھے،اگر چہ وہ خود اپنے مذہب سے واقف نہیں تھے،تاہم حق کے متلاشی ضرور تھے،جن میں قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل،عثمان بن حویرث، امیہ بن صلت، زید بن عمرو بن نفیل قیس بن نشیہ اور عبداللہ بن جحش وغیرہ تھے، جو عربوں کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حق کی راہ ڈھونڈ ھتے ڈھونڈ ھتے ایک روایت کے مطابق عیسائی ہو گئے تھے۔

لفظ حنیف پر اتنی تفصیلی بات سے میرا مدعا یہی ہے کہ جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ عربی میں یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہے،تو ظاہر ہے کہ مولانا محمد حنیف صاحب ایک ذہین عالم ہیں، بالطبع ان سے عربی رسم الخط کی حمایت کی امید تھی، اور امید کی جا سکتی تھی،لیکن انہوں نے غیر متوقع طور پر ایک رسم الخط نما چیز سامنے لا کر ہماری امیدوں پر نہ صرف پانی پھیر دیا بلکہ مسلمانان ارکان کو ایک بڑے فتنے میں ڈال دیا ہے، اب فیصلہ ناظرین و قارئین کرام کے ہاتھ میں ہے، آیا اس رسم الخط کے حوالے سے مولانا نے بھلائی سے برائی کی طرف مڑنے اور جھکنے کو پسند کیا یا برائی سے بھلائی طرف؟

ادھر طرفہ دیکھئے کہ مولانا حنیف صاحب کے برعکس ماسٹر محمد سلطان نلبنوی اور ان کے رفقائے کار تھے،جنہوں نے روہنگیا زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کو ضروری سمجھا،اور اس حوالے سے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے،انہوں نے روہنگیا مسلمانوں کی زبان کو اسلام اور ماضی سے جڑنے کی بساط بھر کوشش کی، بہت ساری ضروری کتابیں اور رسائل کا ترجمہ کروایا، جن میں امام نووی کی'' اربعین'' قابل ذکر ہے، جو''والڈ ایسوسی ایشن فار مسلم یوتھ''(WAMY) کے مالی تعاون سے چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے، اس سلسلے میں ہمارے قابل قدر عالم دین حضرت مولانا ولایت حسین صاحب ارکانی اور ان جیسے دیگر علمائے کرام اور دانشوران عظام بھی شکر و سپاس کے مستحق ہیں، جنہوں نے ماسٹر سلطان احمد نلبنوی کی طرح اس حوالے سے نمایاں خدمات انجام دیں، اور جو اپنے دینی و ثقافتی فریضے سے عہدہ برآ ہوئے تھے۔

بہر حال جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ مولانا محمد حنیف راغب صاحب حجاز مقدس

سے ۱۹۸۴ء میں بنگلا دیش پہنچے، اور سافرانگ ٹیکناف کے مقام پر''دار التربیۃ الاسلامیہ'' کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔راقم سطور کے خیال میں یہ ان کے لئے ایک اچھا اور برمحل کام تھا،لیکن سال دو سال گزرتے نہ گزرتے آپ نے اسے چھوڑ چھاڑ کر میدان سیاست و قیادت کی راہ لی، میرے خیال میں یہ ضرورت تھی کہ مولانا دار التربیہ الاسلامیہ میں بیٹھ کر افرادی قوت کی تیاری میں مگن رہتے، جو آئندہ جا کر کام کے لئے پتے کی ہوتی،لیکن افسوس ہے کہ آپ نے بڑے جذباتی انداز میں اور وقت سے پہلے کسی بھی بنیادی تیاری کے بغیر''اتحاد المجاہدین'' نامی تنظیم کا اعلان کر دیا، مولانا حافظ محمد صدیق صاحب اس اتحاد المجاہدین کی تاسیس اور ان کے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

> بہر حال اسی مقصد کے تحت حرکۃ الجہاد الاسلامی العالمی کے مرکزی امیر محترم مولانا قاری سیف اللہ اختر ۱۹۸۷ء کے اوائل میں بنگلا دیش گئے اور اس کے بعد مولانا عبدالصمد سیال گئے، صلاح و مشورہ اور اتفاق رائے سے مولانا محمد حنیف راغب کو ممکنہ متوقع جماعت کے امیر بنانے کا فیصلہ ہو گیا اور مولانا بھی تیار ہو گئے۔
>
> مولانا موصوف کو ایک وقت دیا گیا کہ آپ وقت کے اندر اندر پاکستان تشریف لے آئیں،لیکن مولانا وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکے، اس لئے حرکۃ الجہاد الاسلامی العالمی کے قائدین نے مشورہ کے بعد حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان (برما) کے نام سے ایک جماعت کی تشکیل کر دی، جس کے امیر مولانا عبدالقدوس صاحب کو چنا گیا۔
>
> مولانا عبدالقدوس مجاہد کو امیر چنے جانے کی وجہ سے مولانا حنیف اور مولانا عبد القدوس کے درمیان کشیدگی شروع ہو گئی تھی، فاصلہ بڑھتا رہا، بالآخر انہوں نے تنظیم المجاہدین کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی جسے بعد میں اتحاد المجاہدین کا نام دیا گیا۔غالبا ۱۹۸۸ء میں اس کی بنیاد پڑی''۔

اتحاد المجاہدین کے اعلان کے بعد مولانا راغب صاحب قدرے حساس اور فعال دیکھے گئے،لیکن آپ کے ساتھ کام کرنے والے لوگوں میں مستعد، قابل اور برمحل رجال کی بڑی شدت سے کمی دیکھی گئی تھی، جس کا خمیازہ نہ صرف آپ کو بلکہ آپ کی تنظیم کی شکل میں علمائے ارکان کو بھی بھگتنا پڑا۔

مولانا راغب صاحب نے اعلان کیا تھا کہ مذکورہ ان کی تنظیم کے وہ امیر نہیں بلکہ آپ نائب کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، جب کہ امارت عظمی ارکان کے اس زمانے کے چار معتبر علماء دین کے ہاتھ میں ہے، جنہیں آپ یا آپ کے حواریوں نے مشائخ اربعہ کا نام دیا تھا۔

مولانا نے شونا فارہ کوکس بازار کے مقام پر ایک معسکر کی بنیاد بھی رکھی تھی، جس میں جہادی تربیتی پروگرام بھی ہوا کرتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ اس معسکر کے قیام کے چند مہینے گزرتے نہ گزرتے اس پر محترم نور الاسلام صاحب کی قیادت میں چلنے والی تنظیم ''ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے چند لوگوں نے حملہ کر دیا، اور اتحاد المجاہدین کے سارے سروسامان اٹھا کر لے گئے، اس میں ایک قابل ذکر بات یہی ہے کہ جہاں تک بعد میں معلوم ہوا تھا کہ مذکورہ حملہ محترم نور الاسلام صاحب کے انجانے میں ہوا تھا، دراں حالیکہ آپ سعودی عرب کے دورے پر تھے، ان کی لاعلمی اور غیر موجودگی میں رشید باموںگ شیل گھاٹوی اور محمد ایوب خائندہ فاروی کی سرکردگی میں اتحاالمجاہدین کے معسکر پر حملہ کیا گیا تھا، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ نور الاسلام صاحب نے اس دورے سے واپسی کے فورا بعد اتحاد کے جملہ سروسامان واپس کر دیئے اور بذات خود چند احباب اور رفقائے کار سمیت اتحاد کے معسکر کی زیارت کی، جہاں انہوں نے مولانا راغب کی موجودگی میں ایک معذرتی تقریر بھی کی تھی۔

اس کے چند مہینے گزرتے نہ گزرتے اتحاد المجاہدین کے تقریبا سارے مجاہدین مولانا راغب صاحب سے بگڑ کر روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) میں شامل ہو گئے، دراں حالیکہ مؤخر الذکر اس تنظیم کی قیادت درج ذیل حضرات کر رہے تھے:

۱۔ الحاج سلیم احمد صاحب خیر فاروی، منگڈوی۔
۲۔ مولانا محمد کبیر صاحب خواندنگی، بوسیدنگی۔
۳۔ مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب لمبابیلوی، بوسیدسیدنگی۔
۴۔ الحاج جناب محمد اسلام صاحب اکیابی۔
۵۔ الحاج جناب انعام اللہ صاحب کیلادنگی، منگڈوی۔

بعد میں ارایل او والوں نے اتحاد المجاہدین کے سارے سروسامان پر مکمل قبضہ کر کے اس کے تمام

مجاہدین کو نکال باہر کر دیا، تاہم یہ ایک الگ بات ہے کہ ارایل او کے تقریبا تمام لوگوں نے برمی فوجی حکام کے سامنے ہتھیار ڈال دیا تھا۔

مولانا محمد حنیف صاحب اس مذکورہ حادثہ کے بعد بڑے پریشان حال مارے مارے پھرتے رہے تھے، اس دوران آپ کو ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ نے بعض الزامات کے تحت گرفتار کر لیا تھا، اس گرفتاری میں مولانا کے ساتھ جناب محمد اقبال صاحب بانگلونوی، منگڈوی بھی تھے، جو اب ولایات متحدہ امریکہ میں مقیم ہیں، لیکن چند دن کے بعد بعض علمائے ارکان و بنگلادیش (جن میں حضرت مولانا محمد سلطان ذوق ندوی صاحب ناقابل فراموش ہیں) کی کوشش اور سفارش پر مولانا راغب اور ان کے مذکورہ ساتھی کو رہائی ملی تھی۔

پھر اگلے چند سال کے بعد حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان سے مل کر مولانا راغب صاحب نے اور ایک تنظیم ''جنود الاسلام'' کی بھی بنیاد ڈالی تھی، لیکن آپ وہیں بھی نہیں رہ سکے، اور اس جنود الاسلام سے بھی علیحدگی کے ساتھ آپ کی جہادی زندگی کا کم سے کم اب تک کے لئے خاتمہ ہو گیا ہے، اللہ تعالی آپ کی زندگی میں برکت دے۔

اس کے بعد ارکان کے مسائل کے حوالے سے مولانا راغب صاحب نے دو مختصر سے رسالے لکھے، جن پر تبصرہ کسی دوسرے موقع پر انشاء اللہ ضرور کیا جائے گا۔

مولانا راغب صاحب کے اس کے بعد کے حالات پر مشتمل مولانا حافظ محمد صدیق صاحب کے مندرجہ اقتباس سے کچھ باتیں ملاحظہ کیجئے کہ:

> ''اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ مولانا موصوف ارکان کے ایک ممتاز عالم دین، صاحب بصیرت فرد، ذہانت و فطانت کے مالک شخص، سیاسی و حرکی انسان، ماہر مدرس و معلم اور معقولات پر عبور رکھنے والے فاضل ہیں، یہ جب ۲۰۰۵ء کے لگ بھگ سعودی عرب کے دورے پر گئے تو وہاں کے طلباء اور نام نہاد علماء کو قریب سے دیکھا، جو سلفی، نام نہاد اہل حدیث اور غیر مقلد بن گئے تھے۔
>
> یہ لوگ صبح و شام امام اعظم ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ، دیوبندی علماء واکابرین، ارکان

برما اور ہند و پاک کے فضلاء کو بے حد برا بھلا کہتے ہیں، تقلید کو حرام قرار دیتے ہیں، دیوبندی علماء اور عوام کو مشرک کہتے ہیں، فقہ کو نجس قرار دیتے ہیں، رفع یدین، آمین بالجہر اور امام کے پیچھے قرآت سورۂ فاتحہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، مغرب کی آذان کے فورا بعد دو رکعت نفل نماز کو لابدی قرار دیتے ہیں، جمعہ کے دن عربی خطبے کے دوران دو رکعت نفل کو دین کا حصہ قرار دیتے ہیں، حنفی نماز وتر (تین رکعتیں) کو خلاف شرع کہتے ہیں، دیوبندی اور تبلیغی جماعت کو اہل سنت والجماعت سے خارج قرار دیتے ہیں، اور امریکہ واسرائیل اور یہود ونصاری کو چھوڑ کر حنفی علماء، دیوبندی اکابرین اور مقلدین کے خلاف جہاد کو فرض قرار دیتے ہیں۔

یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ اظہار حقیقت ہے، کیوں کہ راقم الحروف ۱۹۹۹ء میں چار ماہ اور ۲۰۱۲ء میں ایک ماہ حجاز مقدس میں رہ چکا ہے، چوں کہ یہ لوگ علم دین سے عاری، فقہ فی الدین کے کور، اور قرآن وحدیث سے ناواقف ہیں، اس لئے مذکورہ بالا غلط نظریات وافکار کے حامل وقائل دوسروں کو کافر، مشرک کہہ رہے ہیں۔

بہر حال مولانا راغب نے جب یہ گمراہی دیکھی تو اردو میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام ''اظہار حقیقت'' ہے، صفحات ۱۶۰؍ ہیں، سن تالیف ربیع الثانی ۱۴۱۶ھ۔ مئی؍ ۲۰۰۵ء ہے، اس کتاب میں مؤلف نے دلائل وبراہین اور نصوص سے مذکورہ بالا غلط افکار کی تردید کی، اور حنفیت، دیوبندیت اور تقلید شخصی کو ثابت کیا۔ چوں کہ فریق مخالف کے پاس اس کا جواب نہ تھا، اس لئے انہوں نے سعودی حکومت کے پاس مولانا کے خلاف ناروا شکایتیں کیں اور غلط الزامات عائد کئے، جس پر سعودی حکومت نے ۲۰۰۵ء میں مولانا کو گرفتار کیا اور جیل میں ڈال دیا تھا۔

اس وقت فروری ۲۰۱۲ء تک مولانا جیل میں رہے، اور فروری ۲۰۱۲ء میں رہا ہو کر بنگلا دیش چلے گئے، اور اب (مئی ۲۰۱۲ء) جامعہ دارالسنہ نہلا کاکس بازار، بنگلا دیش کے استاد حدیث ہیں، اس طویل اسیری کی زند میں مولانا کے ساتھ کیا

کچھ ہوا، اور مولانا کے اہل وعیال پر کیا بیتا وہ صاحب البیت ہی بتا سکتے ہیں''۔

مولانا محمد حنیف راغبؔ صاحب جامعہ اسلامیہ دارالسنہ نہلا میں حدیث کے مدرس تھے، شنید ہے کہ آپ آج کل وہاں بھی نہیں ہیں، علالت کی حالت میں صاحب فراش ہیں، اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دے، آمین یارب العالمین۔

مولانا محمد کبیر صاحب خواندنگی مرحوم

مولانا محمد کبیر بن حضرت مولانا راغب اللہ صاحب مجددی نقشبندی بن حضرت مولانا رحمت اللہ کی پیدائش ۱۹۳۶ء میں مشرقی بوسیدنگ کی معروف بستی خواندنگ میں ہوئی، پیدائش کے متعلق خود مولانا محمد کبیر کا ایک دل چسپ بیان ہے کہ:

> ''خاندانی ریکارڈ کے مطابق میری ولادت ۳؍فروری/ ۱۹۳۶ء میں ہوئی، میرے والد حضرت مولانا راغب اللہ صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ آپ میری ولادت سے قبل کسی ضروری کام کے لئے بوسیدنگ گئے ہوئے تھے، آپ کے ساتھ ماسٹر عبد الکریم صاحب نلبنیاوی، منگڈوی بھی تھے، واپسی پر ان دونوں کو ایک جنگلی شیر نے روکا تو ماسٹر عبد الکریم صاحب نے آپ (میرے والد) سے کہا کہ ہوسکتا ہے کہ آپ کے گھر میں ایک شیر جیسا بچہ پیدا ہوگا، چناں چہ آپ گھر پہنچے تو میری ولادت کا مژدہ سنے تو بڑے خوش ہوئے، یوں مرحوم ماسٹر عبد الکریم صاحب کی فراست بھری پیش گوئی بھی صحیح اور برمحل نکلی تھی''۔

آپ کے والد حضرت مولانا راغب اللہ صاحب سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجدیہ کے مجاز بیعت تھے، انہوں نے اپنے والد حضرت مولانا رحمۃ اللہ صاحب کے ہاتھ میں بیعت کی اور خلافت مع اجازت بیعت سے سرفراز ہوئے، مولانا راغب اللہ صاحب نے اپنے والد کی طرح اپنے علاقے میں سلوک و طریقت کے حوالے سے خدمات انجام دیں، تاہم بڑی کوشش کے باوجود حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کے شیخ کا پتہ نہیں چل سکا۔

مولانا محمد کبیر کے والد حضرت مولانا راغب اللہ صاحب ایک جلیل القدر عالم دین اور درویش صفت انسان تھے، آپ کو قرآن کریم کی تعلیم دینے اور مسلم بچوں کو دین سکھانے سے گویا عشق تھا، علاوہ ازیں آپ ایک سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے علاقے بھر میں معروف تھے۔

مولانا محمد کبیر کی والدہ نصوحہ خاتون بنت محمد امین رواسوگری بن سعید احمد رواسوگری بن عبد السلام رواسوگری دابری چنگی بڑی عابدہ اور نیک صفات خاتون تھی، تو ظاہر ہے کہ مولانا کا دادہالی خاندان اور

علماء والا خاندان ہے، جب کہ نانہالی خاندان ایک حکمران اور زمیندار خاندان۔

مولانا محمد کبیر کی ابتدائی تعلیم اپنے بزرگ والد کے مبارک ہاتھ میں ہوئی، قرآن کریم کا ناظرہ، عربی، فارسی اور اردو زبانوں کی ابتدائی ریڈرز آپ نے اپنے والد سے پڑھیں، پھر ۱۹۴۷ء میں مدرسہ عالیہ خواندنگ میں داخلہ لیا، یہاں حضرت مولانا اسد اللہ اور حضرت مولانا مقبول احمد جیسے کامیاب اساتذہ سے پڑھے، اس کے بعد مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ گئے، جہاں حضرت مولانا محمد صاحب اور حضرت مولانا سکندر صاحب وغیرہ سے خوب خوب استفادہ کیا، اس کے بعد حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب ندوی جو آپ کے والد صاحب کے دوست تھے نے آپ کو مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ بلالیا، یہاں آپ نے دو سال میں چھٹی اور ساتویں جماعت کی کتابیں پڑھ لیں۔

اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے مشرقی پاکستان گئے اور ۱۹۵۲ء میں گارنگیہ، ساتکانیہ کی معروف درس گاہ میں آٹھویں جماعت کی کتابیں پڑھیں، اس کے اگلے سال سے مدرسہ حکیمیہ عالیہ چنوتی میں پڑھتے رہے، اور یہاں سے عالمیت کا امتحان پاس کیا، پھر اس کے بعد ۱۹۵۴ء میں مدرسہ عالیہ چندن پورا چاٹگام میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے مخصوص طور پر حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب، حضرت مولانا عبد الحی صاحب، حضرت مولانا مفتی عمیم الاحسان مجددی برکتی اور حضرت مولانا شیخ عبد الرحمن صاحب کاشغری جیسے وقت کے عظماء سے تعلیم حاصل کی، اور یہاں سے آپ نے ۱۹۵۶ء میں فضیلت اور ۱۹۵۷ء میں کاملیت کا امتحان پاس کر کے سند فراغت حاصل کی۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۵۸ء میں آپ وطن لوٹے، اور مارچ ۱۹۵۸ء میں ہی اپنے والد گرامی کے حکم سے برما کے دار الحکومت رنگون گئے، تاہم والد صاحب نے ایک سال بعد ۱۹۵۹ء میں آپ کو واپس بلا لیا، لیکن آپ اپنی بستی میں چند دن سے زیادہ مدت نہیں رہ پائے اور ارکان کے دار الحکومت اکیاب کو چلے گئے، جہاں آپ نے المدرسۃ الاسلامیہ قصائی فارہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب وغیرہ کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دیں۔

۱۹۶۰ء میں آپ دوبارہ رنگون گئے، اور ایک نجی تجارت شروع کی، یہاں آپ نے تجارتی میدان میں بڑا نام کمایا۔ آٹھ سال ایسے میں گزر گئے، پھر ۱۹۶۸ء کا سال آپ کے لئے پریشانی کا سال

ثابت ہوا، کیوں کہ اسی سال آپ کے والد صاحب اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے تھے۔

والد کے انتقال کی خبر ملتے ہی آپ نے وطن کی راہ لی، وطن پہنچے تو تھے لیکن ہمیشہ سہمے ہوئے اور اداس سے رہتے تھے، ایسی پریشانی اور اداسی کی حالت میں ایک سال گزر گیا، یعنی آپ کے مطابق آپ کے والد کے انتقال نے آپ کو نڈھال بنا دیا تھا۔

۴؍جنوری؍۱۹۶۹ء میں آپ کی شادی ہاجرہ خاتون بنت ابوالباصر چوہدری تمنگ چنگی سے ہوئی، لیکن شادی کے چند مہینے بعد آپ نے پھر سے رنگون کی راہ لی تھی۔

ادھر تعلیم سے فراغت کے بعد آپ پہلی مرتبہ رنگون پہنچے تو آپ کی ملاقات وہاں کے معروف عالم دین حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب مظاہری سے ہوئی، آپ نے حضرت سے مختلف علمی، فکری، ثقافتی اور سیاسی موضوعات پر گفتگو کی، مولانا محمد کبیر کے بیان سے معلوم ہوا کہ آپ مولانا مظاہری کی بعض آراء سے بالکل متفق نہیں ہو پائے تھے، البتہ یہ الگ بات ہے کہ جہاں تک اندازہ ہوا کہ ان دونوں کے مزاج، افتادِ طبع اور خیالات ہی مختلف تھے، مولانا ابراہیم صاحب مظاہریؒ ایک جلیل القدر عالم دین، داعی، منجھے ہوئے صحافی اور سیاسی بزرگ تھے، جب کہ مولانا محمد کبیر صاحب ایک عالم ہونے کے علاوہ ایک انقلابی ذہن کا انسان تھے، فکری اور سیاسی اعتبار سے آپ کا میلانِ طبع ایک تعمیری انقلاب کی طرف تھا، اور یہ بھی ایک غور طلب بات ہے کہ مولانا محمد کبیر کا جس علاقہ سے تعلق ہے وہاں کے مسلمانوں کے حالات بالعموم برمی مسلمانوں کے حالات سے مختلف تھے، اور جس پریشانی اور مصائب کی دنیا مولانا محمد کبیر صاحب نے دیکھی تھی، اس کا مولانا مظاہری صاحب کو کب سامنا کرنا پڑا تھا؟۔

مولانا محمد کبیر کے بیان کے مطابق مولانا محمد ابراہیم مظاہری سے اس طویل گفتگو کے دوران آپ کے ذہن میں یہ بات جاگزین ہو چکی تھی کہ اگر ملک میں روہنگیا مسلمانوں کے مفاد کے حوالے سے کام کرنا ہو تو برمی زبان پر قدرت حاصل کرنا از حد ضروری ہے، اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آپ نے رنگون ہی میں ایک نائٹ اسکول میں داخلہ لیا اور چند مہینے کی محنت سے آپ نے برمی زبان پر خاصی مہارت حاصل کر لی، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت محمد جعفر حبیب رنگون میں زیر تعلیم تھے، اور ”روہنگیا یوتھ فیڈریشن“ کی قیادت کر رہے تھے۔

مولانا محمد کبیر نے ”روہنگیا یوتھ فیڈریشن“ میں شمولیت اختیار کی، اور بعد میں آپ کو اسی تنظیم کے مرکزی سکریٹری برائے امور تنظیم بھی چن لیا گیا تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ بدنام زمانہ جنرل نیون نے روہنگیا مسلمانوں کی آمد و رفت پر سخت سے سخت ترین پابندی لگا دی تھی، تو آپ نے ۱۹۶۶ء میں سابق برمی وزیر معدنیات جناب ایم اے رشید صاحب کی زیر سرپرستی روہنگیا مسلمانوں کی طرف سے سپریم کورٹ آف رنگون میں ایک مقدمہ دائر کیا، دراں حالیکہ بدنام زمانہ سابق برمی صدر ڈاکٹر مونگ مونگ چیف جسٹس آف سپریم کورٹ تھے، آپ کے دائر کردہ اس مقدمہ کے خلاف بڑی حد تک سازش کی گئی، اور آخر کار مقدمہ ہی خارج کر دیا گیا، اب آپ نے بھانپ لیا کہ روہنگیا مسلمانوں کی مکمل استیصال کے لئے یہاں سازش پایۂ تکمیل کو پہنچنے والی ہے، اور اب اس کے خلاف مسلح جد و جہد کے علاوہ اور کوئی بھی چارہ نہیں ہے۔

۱۹۷۲ء میں تھائی لینڈ کے دار الحکومت بنکاک میں سابق برمی وزیر اعظم مسٹر اونو کی زیر قیادت پیپل ڈیموکریٹک پارٹی (PDP) نامی تنظیم کی بنیاد پڑی تو مولانا محمد کبیر کی توجہ اس طرف گئی، اس وقت آئے دن اگرچہ بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے آپ کو پریشان کر رکھا تھا، تاہم تلاش معاش کے بطور ذاتی تجارت کو فروغ دینے میں کوئی بھی کسر آپ نے نہیں چھوڑی، لیکن پیپل ڈیموکریٹک پارٹی کا اعلان ہوا تو آپ کے دوست جناب مایو رشید احمد (بامونگ) نے اصرار شروع کر دیا کہ آپ بھی ان کے ساتھ تھائی لینڈ جائیں اور نت نئی اعلان شدہ تنظیم میں شامل ہو کر اپنی قومی خدمات کی کوئی راہ تلاش کریں، تو اس احساس نے کہ ملک میں روہنگیا مسلمانوں کے حالات ابتر سے ابتر ہو چکے ہیں، اور اس قوم کو اپنے ہی وطن میں بے وطن بنا کر سماجی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی غرض ہر اعتبار سے مفلوج اور اپاہج بنا دیا گیا ہے، یعنی اس احساس ہی نے آپ کو اونو کی پارٹی میں شامل ہو کر کام کرنے پر مجبور کیا تھا، یوں ۴؍فروری؍۱۹۷۲ء میں آپ نے اپنے چھ ساتھی:

۱۔ رشید احمد بامونگ معروف بہ مایو رشید شیل گھاٹوی۔

۲۔ عبدالرحمن۔

۳۔ عبدالصمد۔

۴۔ عنایت اللہ۔

۵۔ خلیل الرحمن۔

۶۔ محبوب الرحمن۔

کی شمولیت کے ساتھ تھائی لینڈ کی راہ لی، اور پیپل ڈیموکریٹک پارٹی میں شامل ہوکر انقلابی کام انجام دیئے، یہاں آپ نے پیپل ڈیموکریٹک پارٹی کے سکریٹری اور سپہ سالار اوٹو ٹینگ سے ملاقات بھی کی تھی۔

لیکن مولانا محمد کبیر اور ان کے ساتھیوں کی پیپل ڈیموکریٹک پارٹی میں ایسی مخلصانہ شمولیت کے باوجود یہاں والوں کو ان حضرات کی شمولیت پسند نہیں آئی، ویسے اگلے چند مہینے آپ اور آپ کے تمام ساتھی بڑی الجھن میں مبتلا رہے تھے، بالآخر آپ اور آپ کے ساتھیوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کرلیا کہ ایسے حالات میں ہمیں ارکان پہنچے مسلم انقلابیوں سے مل کر قومی وملی خدمات انجام دینا ہی ضروری ہے، ویسے انہوں نے پیپل ڈیموکریٹک پارٹی سے علیحدگی اختیار کرلی اور ۱۹؍جولائی؍۱۹۷۲ء میں علیحدہ علیحدہ شکل میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے ارکان کے دارالحکومت اکیاب میں پہنچے، پھر یہیں سے جنوبی بوسیدنگ کے معروف قصبہ یونگ چنگ میں پہنچ گئے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ محمد جعفر ثانی کی قیادت میں ''ارکان آزاد فوج'' بڑی خوش اسلوبی سے ارکان میں فریضۂ جہاد انجام دے رہی تھی، چناں چہ مولانا محمد کبیر نے ۱۶؍جولائی؍۱۹۷۲ء میں محمد جعفر ثانی سے ملاقات کی اور بات بننے پر آپ ارکان آزاد فوج میں شامل ہوگئے۔

ستمبر؍۱۹۷۲ء میں محمد جعفر ثانی نے بنگلا دیش کے دورہ کے لئے ایک وفد کی تشکیل دی، اور رشید احمد باموںگ کی زیر قیادت اس وفد نے بنگلا دیش کا دورہ کیا، جس میں مولانا محمد کبیر بھی شامل تھے، اس وفد نے بنگلا دیشی اعلی حکام سے سرزمین ارکان اور یہاں کے بے بس اور مظلوم مسلمانوں کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی، ویسے حکومت بنگلا دیش نے اس وفد کو تعاون کی امید دلائی تھی، آپ نے اس وفد میں شامل ہوکر وہ خدمات انجام دیں جو ایک نڈر، جری اور مبصر سیاست دان سے توقع کی جاسکتی تھی، آپ کی سیاسی بصیرت، فکری اور انقلابی زیرکی نے بنگلا دیشی حکام کو سکتہ میں ڈال دیا تھا۔

اس وفد کی بنگلا دیش سے واپسی کے فورا بعد پارٹی کی جانب سے آپ کو تنگ بازار والے علاقہ

جات کا ذمے دار بنایا گیا تھا، یہاں آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے تنظیمی خدمات انجام دیں۔

۱۹۷۳ء میں روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کی تاسیس ہوئی، جس میں آپ مجلس تاسیسی کے ممبر ہونے کے ساتھ مجلس عاملہ کا رکن بھی چن لئے گئے، بعد میں آپ کو اس تنظیم کے سپہ سالار بھی بنایا گیا، لیکن بعض وجوہات کی بناء پر آپ نے ۱۹۷۹ء میں اس تنظیم سے علیحدگی اختیار کرلی، اور بنگلا دیش میں نجی تجارت سے دلچسپی لی، جس میں آپ کو قدرے کامیابی بھی ملی تھی۔

۱۹۸۸ء میں جناب سلیم احمد کی زیر قیادت روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی بنیاد پڑی تو اس میں درحقیقت مولانا محمد کبیر ہی روح رواں تھے، لیکن اس مؤخر الذکر پارٹی کو میدان عمل میں استقرار ہی نصیب نہیں ہوا تھا، جس کی قدرے تفصیلات راقم کی تصنیف ''سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں'' دیکھی جاسکتی ہیں۔ غرض اس تنظیم کے اختتام کے ساتھ مولانا کی سیاسی اور انقلابی زندگی کا بھی خاتمہ ہوگیا، جس کے بعد آپ نے چند سال گوشۂ عزلت میں کاٹے، اس دوران حجاز مقدس بھی گئے اور کچھ تجارت سے دلچسپی لینے کی بھی کوشش کی، لیکن صحیح طور پر کامیاب نہیں ہوسکے۔ بعد میں بنگلا دیش واپس آئے، اور نائکان سری، کوکس بازار کے مقام پر ایک ذاتی مکان بنایا، اور اگلے چند سال کے بعد غالبا ۲۰۱۰ء میں انتقال کیا، اور نائکان سری میں دفن ہوئے۔

مولانا کے تین بچے ہیں، محبوبہ جو ایک ڈاکٹر بنی، باقی ایک صاحب زادہ محبوب اور ایک صاحب زادی بھی ہیں، لیکن ان کے حالات معلوم نہیں، بس اتنی سی بات معلوم ہوسکی کہ سب حیات سے ہیں، اللہ تعالی ان کی عمر دراز کرے۔

مولانا محمد کبیر صاحب ایک ذہین ترین اور انقلابی ذہنیت کے حامل انسان تھے اور بلند پایہ کے عالم بھی، آپ مشہور مستشرق جرجی زیدان سے کافی متأثر تھے اور وسیع الاطلاع اور ذکی الحس بھی۔

سیاسی اور فکری حوالے سے مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب لمبا بیلی بوسیدنگی سے مولانا محمد کبیر شاید کبھی ہم آہنگ ہوسکے ہوں گے، اور ہوتے بھی کیسے؟ ان دونوں شخصیات کے مابین فکریات اور سیاسیات کے حوالے سے بعد المشرقین تھا، اللہ تعالی مولانا محمد کبیر کی بال بال مغفرت کرے۔

مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی

مولانا سیف اللہ بن حضرت مولانا عبدالغفار بن حافظ سید علی کی پیدائش جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی گدوسرا میں ہوئی، آپ کے دادیہال کا تعلق گدوسرا جب کہ نانیہال کا تعلق شاہ بیل، چکریاکوس بازار، بنگلا دیش سے ہے۔

مولانا کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالغفار صاحب ایک جید عالم دین مایۂ ناز خوش نویس اور ایک باشعور بزرگ تھے، اور والدہ مرحومہ بھی ایک نیک سیرت اور علماء وطلباء پسند خاتون تھیں۔

مولانا کی ولادت چکریاکوس بازار میں ۱۹۵۲ء میں ہوئی، نانیہال میں آپ کی ولادت کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ آپ کی والدہ کو کسی ناقابل بیان وجہ کی بنیاد پر میکے میں بند رکھا گیا تھا، جہاں آپ کی ولادت ہوئی، اور آپ کی عمر ابھی پانچ سال کی تھی کہ آپ اپنی والدہ کے ساتھ گدوسرا آگئے تھے۔

آپ نے اپنی والدہ سے قرآن کریم کا ناظرہ پڑھا، کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ کی ناظرہ خوانی بڑی اچھی تھی، ویسے آپ کی ناظرہ خوانی بھی بڑی اچھی ہو پائی۔اس کے بعد درسیات کی مبادیات کی کتابیں اپنے قابل فخر والد گرامی سے پڑھیں، ان مبادیات کی تعلیم میں آپ کے بڑے بھائی مولانا نور محمد صاحب بھی آپ کے شریک تھے، دونوں بھائیوں نے اپنے والد گرامی سے میزان منشعب جیسی کتابیں پڑھیں، کچھ بڑے ہوئے تو علاقے کی معروف دینی درس گاہ مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں ۱۹۵۹ء داخلہ لیا، جہاں آپ نے جماعت چہارم تک تعلیم پائی، یہاں آپ کے اساتذہ یہ ہیں:

۱۔حضرت مولانا سلطان احمد صاحب فقیرہ فارویؒ۔

۲۔حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب باغگونوی، منگڈویؒ۔

۳۔حضرت مولانا نور احمد صاحب گدوسراویؒ۔

۴۔حضرت مولانا منیر اللہ صاحب گدوسراویؒ۔

۵۔حضرت مولانا قاری محمد قاسم صاحب باغگونوی، منگڈویؒ۔

۶۔حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب سنبنویؒ۔

۷۔حضرت مولانا بشیر الدین صاحب نور اللہ فارویؒ۔

۸۔حضرت مولانا مظہر الاسلام صاحب گدوسراویؒ۔

۹۔حضرت مولانا نور محمد صاحب قادربیلویؒ۔

۱۰۔حضرت مولانا کلیم اللہ صاحب شاعرہ فارویؒ۔

۱۱۔حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب باغگونوی، منگڈویؒ۔

۱۲۔حضرت مولانا حافظ محمد صاحب قادربیلویؒ۔

۱۳۔حضرت مولانا فیض الحق صاحب رحمانی کیلادنگیؒ۔

۱۴۔حضرت مولانا نجم الدین صاحب نلبنویؒ۔

۱۵۔جناب ماسٹر اظہار حسین صاحب نور اللہ فاروی مرحوم۔

آپ نے ۱۹۶۷ء میں جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے جماعت سیوم، دوم، اور اولی اور فنونات کی تعلیم حاصل کی، جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں آپ کے اساتذۂ کرام جن سے آپ نے استفادہ کیا یہ تھے:

۱۔خطیب اعظم حضرت مولانا صدیق احمد صاحب چکریاویؒ۔

۲۔حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب چنوتویؒ۔

۳۔حضرت مولانا محمد دانش صاحب ساتکانویؒ۔

۴۔حضرت مولانا حسین احمد صاحب ساتکانویؒ۔

۵۔حضرت مولانا عبدالمنان صاحب فٹکچرویؒ۔

۶۔حضرت مولانا محمد یوسف صاحب انوارویؒ۔

۷۔حضرت مولانا حاجی محمد یونس صاحب ہاٹہزارویؒ۔

۸۔حضرت مولانا امیر حسین صاحب معروف بہ میر سننؒ انواروی۔

۹۔حضرت مولانا علی احمد صاحب معروف بہ بوعلی صاحب حضورؒ۔

۱۰۔حضرت مولانا احمد صاحب معروف بہ امام صاحب حضور مہرویؒ۔

۱۱۔حضرت مولانا انور العظیم صاحب انوارویؒ۔

۱۲۔حضرت مولانا نورالاسلام صاحبؒ (قدیم) جیروی۔

۱۳۔حضرت مولانا نورالاسلام صاحبؒ (جدید) فٹکچروی۔

۱۴۔حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب مہیش خالوی۔

۱۵۔حضرت مولانا مظفراحمد صاحب مہیش خالویؒ۔

۱۶۔حضرت مولانا مفتی عبدالرحمن صاحبؒ ہاٹہزاروی۔

مولانا سیف اللہ صاحب ابھی جماعت اولی کے طالب علم تھے کہ مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلا دیش) میں حریت کے حوالے سے انقلاب شروع ہوگیا، اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ بند ہوگیا تو آپ نے دورۂ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جامعہ اسلامیہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں داخلہ لیا، یہاں ایک سال ۱۹۷۲ء میں پڑھ کر امتیازی نمبرات کے ساتھ سند فراغت حاصل کی۔ یہاں آپ نے دورۂ حدیث کی کتابیں جن بڑے بڑے نامور حضرات علمائے کرام سے پڑھیں وہ یہ تھے:

۱۔بخاری شریف: حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب گوہروی سے۔

۲۔مسلم شریف: حضرت مولانا مفتی احمد الحق صاحب سے۔

۳۔ابوداؤد شریف: حضرت مولانا حامد حسین صاحب سے۔

۴۔ترمذی شریف: حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب سے۔

۵۔نسائی شریف: حضرت مولانا ابوالحسین صاحب سے۔

۶۔مؤطا امام مالک: حضرت مولانا نذیر احمد صاحب سے۔

۷۔مؤطا امام محمد: حضرت مولانا مفتی احمد شفیع صاحب سے۔

مولانا سیف اللہ صاحب ایک ذہین وفطین طالب علم تھے، آپ کے ساتھیوں کے مطابق آپ جہاں بھی پڑھتے تھے جملہ اساتذہ سے قریبی تعلقات رکھتے اور پڑھائی میں بھی نہایت انہاک اور درک بینی سے کام لیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے اساتذۂ کرام آپ کو بڑی شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔

فراغت کے معا بعد آپ اپنے وطن واپس گئے، اور مدرسہ عالیہ شقدار فارہ منگڈو میں مدرس ہونے

کے ساتھ ناظم برائے امور تعلیمات مقرر ہوئے، ابھی ذیل میں ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے کہ جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ ارکان کے یہ قابل قدر عالم دین قومی وملی خدمات کے ساتھ ساتھ تعلیمی وتدریسی خدمات کے ساتھ کس قدر انہاک رکھتے تھے:

۱۔ ۱۹۷۳ء ۔۱۹۷۶ء ۔مدرسہ عالیہ شقدار فارہ میں ناظم برائے امور تعلیم۔

۲۔۱۹۷۶ء ۔۱۹۷۸ء۔ مدرسہ امداد العلوم شجاع فارہ میں ناظم برائے امور تعلیم۔

۳۔۱۹۷۸ء۔۱۹۷۹ء۔ مدرسہ خدام الاسلام جیمنگ خالی میں صدر المدرسین۔

۴۔۱۹۷۹ء ۔۱۹۸۳ء۔ جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں ناظم برائے امور تعلیم۔

۵۔ ۱۹۸۳ء ۔ ۱۹۸۴ء۔ جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں مدرس۔

۶۔ ۱۹۸۴ء ۔۱۹۸۶ء۔ جامعہ عالیہ شقدار فارہ میں مدرس وصدر المدرسین۔

۷۔۱۹۸۹ء۔۱۹۹۰ء۔ مدرسہ اعزاز العلوم گدوسرا میں خادم اور صدر المدرسین۔

مولانا سیف اللہ صاحب نے ۱۹۹۰ء کے دوران مدرسہ اعزاز العلوم گدوسرا کی طرف سے ملائشیا کا دورہ کیا، جہاں آپ نے اس مدرسہ کے لئے چندہ فراہمی کے ساتھ قومی وملی خدمات کے بطور وہاں کے چیدہ علمائے عظام، وزراء اور بعض بڑے بڑے اعیان سے ملاقاتیں کیں، جن میں ریاست کلنتان کے وزیر اعظم حضرت مولانا نیک عزیز صاحبؒ ناقابل فراموش ہیں۔

مولانا سیف اللہ صاحب مدتوں تک جمعیت علمائے اسلام منگڈو کے مرکزی سکریٹری جنرل کے عہدہ پر فائز رہے، اس علماء تنظیم کے سائے تلے آپ نے انگنت دینی وملی اور قومی ووطنی خدمات انجام دیں، مولانا ایک صاحب بصیرت عالم دین ہیں، یوں آپ نے مذکورہ علماء تنظیم کے زیر سائے کچھ ایسی خدمات بھی انجام دیں جو عام علمائے کرام اور دانشوران کے بس کی بات نہیں تھیں، اس حوالے سے آپ نہایت اچھے الفاظ سے سراہئے گئے تھے۔

مولانا سیف اللہ صاحب جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کے مدرس ومنتظم اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے مدرس تھے، اس دوران ۱۹۸۲ء کی بات تھی کہ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی بنیاد پڑ رہی تھی، جس میں آپ نے بھرپور حصہ لیا تھا، یوں اس تنظیم کے مؤسسین میں آپ کے نام گرامی بھی

شامل ہے۔ پھر اس مؤخر الذکر تنظیم نے جماعت اسلامی کے ساتھ رشتہ جوڑا تو آپ نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔

۲۷/ ۱۲/ ۱۹۹۲ء میں چاٹگام کے معروف ہوٹل یو یئٹڈ میں روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کا ایک اعلی سطحی اجلاس منعقد ہوا تو مولانا سیف اللہ صاحب کو مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب نے اس میں شرکت کی دعوت دی، جس میں آپ شریک ہوئے تھے، جس میں دیگر حضرات لیڈران کے ساتھ راقم بھی شریک تھا، اور جس کی تفصیلات اس زیر نظر کتاب میں اپنی جگہ پر موجود ہیں، اس اجلاس میں مولانا سیف اللہ صاحب کی اولوالعزمی، سیاسی بصیرت اور دور بینی، فکری دقیقہ سنجی بڑی حد تک نظر آئی، آپ نے یہاں اپنی لائق اور قابل قدر آراء سے مجلس اور تنظیم کو کافی حد تک فائدہ پہنچایا، اس جلسہ اور بعد میں آپ کی دیگر سرگرمی اور کردار سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ آپ ایک ذی استعداد عالم ہونے کے ساتھ ایک صاحب بصیرت سیاسی اور فکری رہنماء بھی ہیں۔

اس مذکورہ اجلاس میں مولانا سیف اللہ صاحب کو روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی مرکزی مجلس عاملہ میں شامل کرلیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۳ء میں آپ نے مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کی ہم راہ مؤخر الذکر اس تنظیم کی جانب سے سعودی عرب کا سفر کیا، جہاں آپ نے کافی سرگرمیاں دکھائی تھیں، لیکن افسوس ہے کہ آپ اس سفر سے آج تک واپس نہیں آئے، یا نہ آسکے، یہاں اس کی تفصیلات کو جانا مناسب نہیں، اور تادم تحریر سعودی عرب کے معروف شہر جدہ میں مع اہلیہ مقیم ہیں، راقم سطور سے مولانا کے دیرینہ کے تعلقات تھے اور اب بھی ہیں، اور وہاں سعودی عرب میں راقم جتنے سال رہا، آپ کے قریب ہی رہا تھا، آپ بڑے نیک اور مخلص انسان ہیں، ۱۹۹۴ء سے لے کر اب تک وہاں کے مختلف دینی مدارس میں پڑھاتے رہے ہیں، راقم کی جتنی بھی دینی، فکری اور سیاسی سرگرمیاں وہیں تھیں، آپ نے اس کے ساتھ دینے میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوی، اور بہر صورت آپ اپنے نیک اور مخلصانہ مشوروں سے اسے محظوظ کرتے رہے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ کسی بھی خطرات سے آگاہ کرتے رہے تھے۔ اب اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے آپ کی حیات میں برکت عطا کرے، آمین، یارب العالمین۔

الحاج سلیم احمد صاحب خیر فاروی مرحوم

الحاج سلیم احمد صاحب خیر فاروی بن ماسٹر نور الزمان شمالی منگڈو کی مردم خیز بستی خیر فارہ میں ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد صاحب ایک پرائمری اسکول کے استاد ہونے کے علاوہ ایک دین دار، عالم دوست، نہایت سخی اور ہر دل عزیز بزرگ تھے، اور آپ کے بیان کے مطابق آپ کی والدہ ماجدہ بھی نہایت پرہیزگار اور خدا ترس خاتون تھی۔

سلیم احمد صاحب نے ابتدائی تعلیم بستی کے مکتب اور سرکاری پرائمری اسکول میں پائی، چوتھی جماعت کی تعلیم پاکر منگڈو ہائی اسکول میں داخلہ لیا، یہاں سے آپ نے ساتھویں کی تعلیم مکمل کی، اس کے بعد آپ برما کے دارالحکومت رنگون گئے، جہاں ایک روایت کے مطابق آپ نے اپنے اگلے تعلیمی مراحل کو مزید آگے بڑھایا تھا۔

۱۹۶۰ء کے دوران رنگون ہی میں آپ نے پولیس کی ملازمت اختیار کی، پہلے پہلے غیر کمیشن پھر کمیشن افسر بنے، ویسے آپ نے چار سالوں تک پولیس میں نوکری کی، اس کے بعد بعض پریشانیوں کی وجہ سے پولیس سے مستعفی ہوگئے، اس کے مابعد وطن واپس آگئے اور اگلے چند دن وطن میں گزار کر مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلا دیش) کی طرف ہجرت کی۔

مشرقی پاکستان پہنچنے کے بعد آپ نے الحاج نبیہ حسین صاحب شاہی فریر دیپ والے کی صاحب زادی (ہمشیرۂ الحاج بدیع الرحمن اور شفیع الرحمن وغیرہ) سے نکاح کیا، اللہ تعالی نے اس نکاح میں کافی برکت دی، ان کے بطن سے دو صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں پیدا ہوئیں، جو تادم تحریر الحمد للہ حیات سے ہیں، اللہ تعالی ان ساروں کی حیات دراز کرے، آمین۔

سلیم احمد صاحب کا صاحب زادہ سیف الدین (منا) ماضی میں میرے قدرے قریبی ساتھی رہ چکا تھا، بڑا ذہین وفطین، نہایت حساس تھا، شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبال کے فریفتہ تھا، اس کے والد صاحب جناب سلیم احمد کو اس پر کافی اعتماد اور بھروسہ تھا، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور شاید اب بھی ہو کہ آج تک وہ کسی بھی قومی کام کا نظر نہیں آرہا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کی ہدایت کا فیصلہ کرے۔

الحاج سلیم احمد صاحب روہنگیا اندی پینڈنٹ فورس (RIF) کے فعال کارکن رہ چکے تھے، کہتے ہیں

کہ اندرون وطن میں اس تنظیم کے زیر سائے آپ نے قابل قدر اور نا قابل فراموش خدمات انجام دی تھیں، آپ ریف کے سر برآوردہ رکن جناب سرفراز احمد بن ماسٹر ولی احمد صاحب شجاع فاروی مرحوم کے قریبی دوستوں میں سے تھے، ساتھ ہی ساتھ قائد تحریک حضرت محمد جعفر حبیب کے بڑے چہیتے ساتھیوں میں سے بھی۔

۱۹۷۳ء میں روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کی تشکیل ہوئی تو آپ اس تنظیم کے اعلی رکن قرار پائے، بعد میں رکن عاملہ بھی بنے، جس میں آپ نے قابل قدر خدمات انجام دی تھیں، اس حوالے سے آج بھی ہمارے بعض سیاسی اور انقلابی حلقوں میں آپ سراہے جاتے ہیں، جس کی بڑی تفصیلات ہیں۔

۱۹۸۶ء اور اس سے پہلے روہنگیا فدائین محاذ (RPF) میں محمد جعفر حبیب اور جناب شبیر حسین فوئما لوی کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو سلیم احمد صاحب نے بعض سیاسی اور انقلابی وجوہات کی بنیاد پر شبیر حسین صاحب کا ساتھ دیا، بایں ہمہ حضرت محمد جعفر حبیب سے بھی آپ نے دوستی اور راہ ورسم کو بحال رکھا تھا، چناں چہ ۱۹۸۷ء میں حضرت محمد جعفر حبیب کا چاٹگام میڈیکل ہسپتال میں انتقال ہو گیا تو حضرت کی نعش مبارک کو سلیم احمد صاحب کی رہائش گاہ لایا گیا، اور آپ کی پہلی نماز جنازہ بھی وہیں ہوئی تھی۔

۱۹۸۸ء کے دوران سلیم احمد صاحب کی سرکردگی اور قیادت میں روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کا قیام چاٹگام میں ہوا، جس میں آپ صدر منتخب ہوئے، اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ آپ کا عہدۂ صدارت بلا کسی بھی چوں وچرا کے آپ کے انتقال تک بحال رہا تھا۔

جناب سلیم احمد صاحب کو میں ۱۹۸۶ء سے دیکھتا رہا تھا، جتنا بھی دیکھا کہ بہت قریب سے دیکھا تھا، آپ کی رہائش گاہ گویا ہماری پناہ گاہ تھی، جبھی ملاقات کرتا تھا آپ نہایت شفقت سے پیش آتے تھے، بہر حال آپ نے اپنی عمر مستعار میں حجاز مقدس کی زیارت کی سعادت چند مرتبہ حاصل کی، ۲۰۰۴ء کے دوران میں حجاز مقدس میں تھا، آپ وہاں پہنچے اور چند مہینے وہیں گزارے، رہ رہ کر وہیں بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، جہاں تک اندازہ کیا گیا کہ اس زمانے میں آپ بڑے اداس، سہمے ہوئے بہت ہی پریشان حال تھے، سیاسی وفکری اعتبار سے بھی اور اقتصادی ومعاشی اعتبار سے بھی،

وہیں چند مہینے گزار کر بنگلا دیش چلے آئے تھے۔

جناب سلیم احمد صاحب نہایت علم اور عالم دوست انسان تھے، مخصوص طور پر وطن کے علماء، صلحاء اور طلباء سے محبت اور شفقت کا برتاؤ کیا کرتے تھے، آپ مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے بڑے مداح تھے اور قدردان بھی، اور وطن کے حوالے سے مولانا محترم کی ذات، شخصیت اور ان کی لیاقت و صلاحیت پر خاصے پر امید تھے، آپ کا تقریبا یقین تھا کہ مولانا وطن کے حوالے سے ضرور کچھ کر پائیں گے، اور جو بھی کریں گے تاریخ ساز کریں گے، ویسے بھی جہاں تک میں نے دیکھا کہ وطن عزیز کے حوالے سے دونوں شخصیات کے خیالات وآراء تقریبا ایک جیسی تھیں، اور فکری اعتبار سے بھی دونوں قریب قریب، ہم آہنگ اور ہم نوا تھے۔

روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) میں مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب اور جناب سلیم احمد صاحب کے علی الرغم اور ایک نمایاں شخصیت بھی تھی، وہ تھے مولانا محمد کبیر خواندگی صاحب، جن کو بھی اس تنظیم میں ایک حیثیت سے روح رواں بھی سمجھا جاتا تھا، تنظیم کے بعض امور کے حوالے سے مولانا حسین احمد اور مولانا محمد کبیر کے مابین اختلافات رونما ہوا کرتے، جو کبھی کبھار شدت بھی اختیار کر جاتے تھے، ان اختلافات کے دوران اکثر دیکھا اور اندازہ کیا گیا تھا کہ جناب سلیم احمد صاحب مولانا حسین احمد صاحب کے ہم نوا اور ہم خیال ہوا کرتے تھے، جس کی وجہ سے مولانا محمد کبیر صاحب کبھی کبھار جناب سلیم احمد صاحب پر برہم بھی ہو جایا کرتے تھے۔

مؤخر الذکر تنظیم سے مولانا محمد کبیر صاحب کی مکمل علیحدگی کے بعد مولانا حسین احمد اور جناب سلیم احمد صاحب نے ۱۹۹۱ء کے دوران اس تنظیم کو از سر نو احیاء کرنے کی کوشش کی، جس کی بعض ضروری روداد زیر نظر کاوش میں بھی دیکھی جا سکتی ہے، اس احیاء اور تجدید کے دوران جناب سلیم احمد صاحب نے بڑا کردار ادا کیا تھا۔

سلیم احمد صاحب بڑے ذہین اور فکر رسا کے مالک انسان تھے، عالمی سیاسیات پر عموما اور ہماری قومی سیاسیات پر خصوصا آپ کی نظر گہری اور دور رس تھی، اور امت مسلمہ کے حالات زار پر عموما اور ہمارے قومی وملی حالات پر خصوصا ہمیشہ تڑپتے رہتے تھے، کہنے میں تو بظاہر ایک دانشور اور تجارت

خیال کے انسان تھے،لیکن دینی حمیت اور ایمانی غیرت کے حوالے سے آپ کی تڑپ کبھی کبھار دیکھی جانے کی قابل تھی۔

غرض سلیم احمد صاحب مولانا حسین احمد صاحب کے بڑے خیر خواہ انسان تھے، آپ کی اس خیرخواہانہ صفات سے مجھے بھی بہت کچھ ملا، نہایت کریمانہ اور مشفقانہ اخلاق کے مالک ایک قومی لیڈر تھے، آپ کی زندگی کے آخری ایام جہاں تک اندازہ کیا گیا کہ بڑی عسرت سے گزرے، ان ایام میں غیروں کے ساتھ ساتھ اپنوں کے بھی تیر سہے تھے، اور زخم سے چور ہوکر بالآخر قوم کے اس نڈر، بہادر، انقلابی اور سیاست دان نے سرزمین چاٹگام میں داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ع

افسردل افسردہ کند انجمنے را۔

الحاج محمد اقبال صاحب باغکونوی،،منگڈوی

الحاج محمد اقبال بن محمد اسحاق صاحب ۱۹۵۰ء میں جنوبی منگڈو کی معروف بستی باغکونہ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد محمد اسحاق صاحب درزی ایک دین دار، خداترس اور ہر دل عزیز بزرگ تھے۔

اقبال صاحب نے اپنی بستی کے مکتب میں ناظرۂ قرآن کریم کے علاوہ دینیات کی کچھ بنیادی تعلیم پائی، پھر بستی کے سرکاری پرائمری اسکول سے چوتھی جماعت کی تعلیم پاکر منگڈو ہائی اسکول میں داخلہ لیا، یہاں سے آپ نے ہائی اسکول فائنل (مساوی آج کل کی دسویں جماعت) کا امتحان پاس کیا تھا۔

منگڈو کے دوران تعلیم آپ روہنگیا انڈی پنڈنٹ فورس (RIF) کے فعال کا کن رہے، کہتے ہیں کہ آپ مذکورہ تنظیم کے زیرسائے کام کرنے والی طلبہ تنظیم کے سرگرم کارکن تھے، آپ نے ۱۹۶۸ء کے دوران منگڈو ٹاؤن شپ کے مسلم طلبہ کو طلبہ تنظیم میں جمع کرنا شروع کیا تھا۔

۱۹۷۲ء میں روہنگیا یوتھ فرنٹ (RYF) کے مرکزی لیڈروں میں اقبال صاحب بھی تھے، جس کے زیرسائے آپ نے مختلف قومی خدمات بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیں، روہنگیا نوجوانان اور جوانوں کے اندر آپ نے قومی وملی شعور واحساس کو جگایا، سوئے ہوؤں کو بیدار کیا اور بیدار ہونے والوں کو منزل کی راہ دکھائی تھی۔

۱۹۷۵ء میں ارکان بنگلا دیش کے سرحدی علاقے میں روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کی ازسرنو تجدید ہوئی تو اقبال صاحب نے بشمول اپنے ساتھیوں کے اس میں شامل ہوکر عسکری تربیت حاصل کی، اس کے بعد جہادی فریضہ انجام دینا شروع کردیا، یہاں آپ نے اپنوں کے مابین اخوت اور بھائی چارگی اور قومی وملی فریضے ادا کرنے کی راہ پر قربانیاں دینے کے جذبے کو فروغ دیا، جس کی وجہ سے نہ صرف روہنگیا فدائین محاذ (RPF) بلکہ بہت سے ممبروں کا کافی فائدہ بھی ہوا، ماشاءاللہ آپ کافی ذہین اور فکر رسا کے مالک انسان ہیں، ملت وقوم کی راہ پر خود بھی قربان گئے اور دوسروں کو بھی قربانی اور جانفشانی کی طرف بلایا، آپ دل دینے اور دل لینے کے حوالے سے کافی مہارت رکھنے والا انسان ہیں۔

۱۹۸۸ء کے دوران روہنگیا فدائین محاذ میں اختلافات رونما ہوئے تو آپ دل برداشتہ ہو گئے تھے، بالآخر آپ نے اپنی ذاتی معاشی مشکلات کو کچھ سہارا دینے کے لئے سعودی عرب کی راہ لی، لیکن

وہاں بھی آپ کو ملت وقوم کی فکر نے چین سے رہنے نہیں دیا، اور معاشی کام کو چھوڑ کر وہاں بھی قومی وملی راہوں پر دوڑتے رہے تھے۔

۱۹۸۲ء میں روہنگیا سالیڈریٹی آرگنائزیشن (RSO) بنی تو آپ اس میں باضابطہ طور پر شامل ہو گئے، اور ۱۹۸۵ء میں اس تنظیم کی چاہت پر بنگلا دیش واپس آئے، اور اس تنظیم کے سرگرم میدانی رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے تھے۔

۱۹۸۶ء کے دوران مولانا سیف الاسلام صاحب شرف الدین بیلوی ار ایس او کے امیر تھے، اقبال صاحب اور آپ کے بعض ہم خیالوں نے امیر صاحب اور مجلس عاملہ کے بعض امور سے اختلاف کیا، اور آگے چل کر اس اختلاف نے باہمی رسہ کشی کی شکل اختیار کرلی، آخر کار بات کسی بھی طرح نہیں بنی تو آپ نے اس تنظیم سے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔

سن ۱۹۸۸ء کے دوران مولانا محمد حنیف راغبؔ صاحب فرنگی کی قیادت والی تنظیم "اتحاد المجاہدین ارکان" سامنے آئی تو آپ اس میں شامل ہوگئے، یہاں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا، اس دوران آپ کو جناب نور الاسلام صاحب کے عتاب کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔

اتحاد المجاہدین کی ناکامی اور مکمل تباہی کے بعد آپ نے ۱۹۹۰ء میں ارکان مجاہدین فرنٹ (AMF) نامی ایک تنظیم کی بنیاد رکھی، جس میں آپ کے چھوٹے بھائی محمد ایوب صاحب جنرل سکریٹری رہے تھے، اقبال صاحب نے اس کے صدر کی حیثیت سے پاکستان کا دورہ بھی کیا، لیکن بعد میں اس تنظیم کو بھی بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

۱۹۹۷ء میں اقبال صاحب روہنگیا سالیڈریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے ڈاکٹر محمد یونس گروپ میں دوبارہ شامل ہوگئے، جہاں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا، اس حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے ارایس او کی جانب سے ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کے لئے راہ ہموار کی تھی، جس کی وجہ سے مؤخر الذکر تاریخی تنظیم کا قیام عمل میں آیا تھا۔

آخر کار ۱۹۹۸ء کے اواخر میں ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) بہتوں کی بہت ساری کوششوں کے نتیجے میں اعلان ہوگیا، تو آپ اس کے قائمہ کمیٹی (NSC) کے ممبر کے علاوہ انتخابات

کے نتیجے میں ہونے والی مجلس عاملہ کے رکن بھی منتخب ہوئے تھے۔

مؤخر الذکر تنظیم میں بعد میں اختلافات رونما ہوئے تو آپ اس کے صدر مسٹر نور الاسلام صاحب کے حامی رہے، آپ نے اپنوں کے مابین ہونے والے اختلافات کو مٹانے کی راہ پر بے حد کوششیں کیں، مجاہدین کو متحدہ پلٹ فارم پر لانے کے لئے صدر محترم نور الاسلام صاحب اور راقم سطور کے ساتھ روہنگیا سالیڈریٹی آرگنائزیشن (RSO) والے معسکر کا خطرناک دورہ کیا، اس حوالے سے یاد رہے کہ اس وقت صدر صاحب کے ہم خیال ہونے کی وجہ سے اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا رہا تھا کہ خدا نہ کرے کہ ہم تینوں کی شہادت ہوجائے، ہمارے ساتھ اقبال صاحب کی اس جانبازی اور جان سپاری کو کبھی بھی بھلایا نہیں جاسکتا، لیکن اللہ تعالی کو کچھ اور منظور تھا کہ بڑی کوشش اور جدو جہد کے باوجود ان بگڑے ہوئے مجاہدین کو اپنایا نہیں جاسکا، اور ہم تینوں کو اس دنگل سے افسوس کے ساتھ واپس آنا پڑا تھا۔

بہرحال ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) سے بگڑے ہوؤں کو اپنانے اور قوم کی امیدوں کو شرمندۂ تعبیر کرنے کی راہ میں اقبال صاحب کی اس وقت کی کوششیں یاد رکھی جانے کی قابل ہیں، اس وقت قیادات کے مابین پائے جانے والے اختلافات اور مجاہدین کے درمیان ہونے والے افتراق کو مٹانے کے لئے اقبال صاحب نے بڑی قابل تعریف جدوجہد کی، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر دے۔

۲۰۰۱ء کے بعد اقبال صاحب بڑے شکستہ خاطر ہو چکے تھے، حتی کہ عرصۂ دراز تک گم نامی کی زندگی اختیار کرتے ہوئے ڈھاکہ جا چھپے تھے، اس کے بعد راقم سطور نے بھی ۲۰۰۳ء میں سعودی عرب کی راہ لی، بعد میں یہ بات سننے میں آئی کہ اقبال صاحب ولایات متحدہ امریکہ چلے گئے ہیں۔

۲۰۱۱ء کے بعد یہ بات سننے میں آئی تھی کہ اقبال صاحب امریکہ میں پھر دوبارہ سرگرم عمل ہو چکے ہیں، اور ڈاکٹر وقار الدین (ڈائرکٹر جنرل آف ارکان روہنگیا یونین) سے مل کر قومی کام کر رہے ہیں۔ غالبا ۲۰۱۴ء میں ہو کہ راقم کے ساتھ اقبال صاحب کے چند مرتبہ ٹیلفونک رابطے ہوئے تھے، آپ نے تمنا ظاہر کی تھی کہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی نیت سے سعودی عرب آئیں گے، لیکن بعد میں یہ بھی نہیں ہوسکا، دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ کی تمنا پوری کرے، آمین۔

محترم اقبال صاحب مولانا حسین احمد صاحب کے قریبی ساتھیوں اور کسی قدر دوستوں میں شمار تھے، ۱۹۸۵ء کے بعد دونوں کے مابین بہت قریبی تعلقات ہو چکے تھے، یہ دوستی ۲۰۰۳ء تک بدستور بحال رہی، اس کے بعد مولانا سعودی عرب کے اور اقبال صاحب امریکہ کے ہو گئے، اور جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آج کل ان دونوں کے مابین رابطہ بھی نہیں ہے۔

محترم اقبال صاحب کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب کی یہ ایک رائے بھی ہے کہ آپ قوم وملت کی خاطر اتنے فدا نہیں ہیں کہ جتنے بظاہر نظر آتے ہیں، مولانا کی نظر میں آپ کی وفاداری بقدر استواری تک محدود ہے۔ تاہم یہ مولانا کی رائے ہے، لیکن میری نظر میں اقبال صاحب کی قوم وملت کی خاطر قربانی اور جانفشانی کبھی بھی بھلائی جانے کی قابل نہیں ہے، اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دے۔ آمین یارب العالمین۔

جناب ممتاز جمیل صاحب وکیل فاروی مرحوم

جناب ممتاز جمیل بن ہڈ ماسٹر جمیل احمد صاحب کی پیدائش ایک روایت کے مطابق شمالی منگڈو کی مردم خیز بستی خیر فارہ میں ۱۹۴۸ء میں ہوئی، جب کہ دوسری ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کی پیدائش وکیل فارہ منگڈو میں ہوئی۔

آپ کے والد گرامی جناب مرحوم ماسٹر جمیل احمد صاحب نہایت خوش اخلاق انسان تھے، منگڈو ہائی اسکول کے ہڈ ماسٹر رہ چکے تھے، اور ممتاز صاحب کے بیان کے مطابق آپ کی والدہ مرحومہ نہایت نیک اور طلبائے دینی مدارس سے شفقت رکھنے والی خاتون تھی۔

ممتاز صاحب کی ابتدائی دینی تعلیم بستی کے مکتب میں ہوئی، سرکاری اسکول سے چوتھی جماعت کی تعلیم پا کر منگڈو ہائی اسکول میں داخلہ لیا، یہاں سے مٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کرتے ہوئے رنگون یونیورسیٹی میں داخلہ لیا، جہاں سے پہلے بی اے پھر ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں، اور اس کے معابعد وطن واپس آ گئے تھے۔

وطن واپس آ کر آپ نے حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب گرجنڈ یاوی (مہتمم مدرسہ عالیہ شقدار فارہ) کی بڑی صاحب زادی سے شادی کی، آپ کی اہلیہ نہایت خدا ترس، عالم اور علم دوست اور پاکیزہ اخلاق کی خاتون تھی، اللہ تعالی اس کو جنت میں جگہ عطا کرے۔

ممتاز صاحب وطن میں چند سال سرکاری ملازم رہے تھے، اس کے بعد بنگلا دیش آ گئے۔ آپ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) اور ارکان ہسٹریکل سوسائٹی (AHS) سے مرتے دم تک وابستہ رہے تھے، ان دونوں تنظیموں میں آپ کی گراں قدر خدمات تھیں، بطور خاص روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) سے وابستہ رہ کر آپ نے جو فکری اور قلمی خدمات انجام دیں، انہیں قوم کی تاریخ کبھی بھی بھلا نہیں سکتی، ۱۹۷۸ء سے لے کر ۲۰۰۷ء تک جتنی بھی انگریزی تحریریں اس مؤخر الذکر تنظیم سے نکلیں، تقریبا ساری کی ساری آپ کے قلم سے تھیں، اس دوران انصاف کے علاوہ میرر اور بوائس نامی پرچے آپ کی ادارت میں نکلتے رہے تھے، ممتاز صاحب کو جاننے والے کہتے تھے کہ "ممتاز صاحب کے قلم سے نکلنے والے مضامین بڑے قابل قدر اور وزنی ہوتے ہیں"۔

جناب ممتاز جمیل صاحب ڈاکٹر محمد یونس کے علاوہ جناب اقبال صاحب بانگونوی اور حضرت مولانا دین محمد صاحب مرحوم سابق صدر روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کے قریبی دوستوں میں تھے، اور جہاں تک میں جانتا ہوں کہ آپ حضرت مولانا حسین احمد صاحب ابوالفضل لمبا بیلی کے بہت ہی دلی دوستوں اور ایک دوسرے کو نہایت چاہنے والوں میں تھے، ممتاز صاحب کے انتقال کے بعد ایک روز مکہ مکرمہ میں مجھ سے مولانا فرمانے لگے کہ ''اب چاٹگام جانے تک کو دل نہیں کر رہا ہے، کیوں کہ وہاں اب نہ سلیم احمد صاحب خیر فاروی ہیں اور نہ بھائی ممتاز جمیل صاحب حیات سے ہیں'' مولانا حسین احمد صاحب جبھی کسی سفر سے واپس آتے تھے، آپ کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ ساتھ لایا کرتے تھے، اور ممتاز صاحب بھی بار بار اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے، اس حوالے سے مولانا حسین احمد صاحب نے راقم سے کہا کہ:

> ''جناب ممتاز جمیل صاحب میرے بہت ہی عزیز دوستوں میں سے ایک تھے، میں جبھی سفر سے واپس آتا ان کے لئے کوئی نہ کوئی ایک ہدیہ کی چیز لانا نہیں بھولتا تھا، اور بات یہ ہے کہ ہدیہ یوں تو دوسروں کے لئے بھی لاتا تھا، لیکن ممتاز صاحب کا ہدیہ میرے خاص عزیزوں کے ساتھ چسپاں کر کے لایا جاتا تھا''۔

جناب ممتاز جمیل صاحب میرے بڑے محسن، مشفق اور دل سے چاہنے والے انسان تھے، زندگی میں میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا اور پایا، اور جو بھی پایا بہت خوب پایا تھا، ۱۹۹۵ء کے بعد آپ کے انتقال تک آئے دن آپ سے میری ملاقات ہوتی رہتی تھی، جبھی ملاقات ہوتی آپ بہت ہی شفقت سے پیش آتے تھے، حتی کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ آپ میرے ایک بڑے بھائی جیسے ہو چکے تھے، گویا آپ میرے اور میں آپ کے گھر یا خاندان کا ممبر بن چکا تھا، نہایت خوش اخلاق، نستعلیقی کیفیت کے افتادِ طبع والا ایک سیاسی، صحافی، منصف مزاج کے مبصر و معتدل خیالات کے انسان تھے، دل پھٹ جائے تو جائے لیکن آپ کی زبان سے کسی کے خلاف حرف شکایت نہیں نکلتا تھا۔ ممتاز صاحب نے ۲۰۰۷ء میں چاٹگام میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور چاٹگام کے ریلوے اسٹیشن والی قبرستان میں مدفون ہیں۔

جناب ماسٹر عزیز احمد صاحب زادی فرانگی، بوسیدنگی مرحوم

محترم ماسٹر عزیز احمد بن حضرت علامہ اصحاب الدین صاحب کی ولادت ۱۹۳۸ء میں شمالی بوسیدنگ کی بستی زادی فرانگ میں ہوئی، آپ کے والد حضرت علامہ اصحاب الدین صاحب ایک عظیم المرتبت عالم دین ہونے کی حیثیت سے اپنے زمانے میں علاقہ بھر میں معروف اور مشہور تھے، جن کا مختصر تذکرہ راقم کی تصنیف ''تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے'' کی زینت ہے۔

محترم عزیز احمد صاحب کی بسم اللہ خوانی اپنے بزرگ ترین والد صاحب کے ہاتھ میں ہوئی، اس کے بعد بستی کے مکتب میں پڑھے، ساتھ ہی فندو فرانگ کے سرکاری پرائمری اسکول میں برمیز اور انگریزی کی تعلیم بھی شروع کر دی، آپ کے پرائمری کے اساتذہ میں ماسٹر عزیز الرحمن صاحب بڑے قابل قدر استاد تھے۔ پرائمری کے بعد ۱۹۵۵ء میں آپ نے بوسیدنگ ہائی اسکول میں داخلہ لیا، اور ۱۹۵۹ء میں ہائی اسکول فائنل کیا۔

اس کے بعد آپ نے رنگون کا سفر کیا، جہاں آپ نے ایک ملٹری شفاخانہ میں نوکری کی، پھر ۱۹۶۱ء میں وطن واپس آئے اور دوبارہ اسکول میں داخلہ لے کر ۱۹۶۲ء میں مٹرک کا امتحان امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔

مٹرک پاس کرنے کے بعد بوسیدنگ ہائی اسکول میں پرائمری کے استاد مقرر ہوئے، یہاں آپ نے ۱۹۶۴ء تک تعلیم دی، پھر ۱۹۶۵ء میں بوسیدنگ ٹاؤن کے '' سیپرا'' نامی اسکول میں منتقل ہوئے، جہاں آپ نے ۱۹۶۸ء تک تعلیم دی تھی، اس کے اگلے دو سال لاوادنگ اسکول میں بھی تعلیم دی تھی۔

۱۹۷۸ء میں آپ نے مہاجرین کے ساتھ بنگلا دیش کو ہجرت کی، تقریباً نو مہینے تک ہجرت کی زندگی گزار کر وطن واپس لوٹے تھے، ماسٹر صاحب نے اپنی اس ہجرت کے دوران بنگلا دیش میں مقیم مہاجرین کی بساط بھر خدمت کی تھی، آں جناب کی مؤثر قیادت کی وجہ سے روہنگیا مظلوم مہاجرین کا بہت ہی فائدہ ہوا تھا۔

ماسٹر صاحب شروع ہی سے روہنگیا انڈیپینڈنٹ فورس (RIF) کے سینئر ممبر تھے، اس وقت وطن عزیز کے اندر زیر زمین کام کرنے والی اس تنظیم کے زیر سائے آپ نے قوم وملت کی بڑی بڑی

خدمات انجام دی تھیں، روہنگیا انڈی پنڈنٹ فورسس نے ۱۹۷۲ء کے بعد روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کی شکل اختیار کرلی تو آپ نے اندرون وطن میں رہتے ہوئے اس زیر زمین کام کرنے والی روہنگیا تنظیم کا بھرپور تعاون کیا، اور خفیہ طور پر اس تنظیم کے اجلاس اور مختلف پروگراموں میں بھرپور شرکت بھی کی تھی۔

ماسٹر صاحب طالب علمی کے زمانے سے وطن کے حوالے سے کی جانے والی سیاست میں حصہ لیتے رہے، ارکانی مسلمانوں کی عزت و وقار اور ان مسلمانوں کے سیاسی استحکام کے لئے کوششیں کرتے رہے، اس حوالے سے آپ چند مرتبہ جیل بھی گئے، مختلف مصیبتیں بھی جھیلے، ویسے اس حوالے سے آپ کی خدمات اور قربانیاں بڑی قابل قدر ہیں۔

آخرکار ۱۹۸۴ء میں آپ کے لئے وطن کی زمین تنگ کردی گئی تو آپ نے ہجرت کی اور بنگلا دیش ہوتے ہوئے حجاز مقدس پہنچے، اور یہاں بھی مختلف قومی کاموں میں حصہ لیتے ہوئے ۲۰۱۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

جس طرح عرض کی گئی ہے کہ ماسٹر صاحب سعودی عرب میں بیٹھے ہوئے نہیں تھے، ایک طرف تعلیم وتعلم کے ذریعے ہماری نئی نسل کو قومی و ملی خدمات کے لئے تیار کر رہے تو دوسری طرف روہنگیا مسلمانوں میں فلاح وبہبود کے حوالے سے کام کرنے والوں کا بھرپور تعاون کرتے رہے تھے، آپ کی ہمیشہ یہی آرزو رہی تھی کہ ارکانی مسلمانوں کی خدمات کے لئے ایک جامع، اصولی اور فعال تنظیم ابھر کر سامنے آئے، اور اس سلسلے میں آپ نے بذات خود بہتوں کوششیں کی تھیں، لیکن آپ کو ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا تھا۔

سیاست، قیادت اور انقلاب کے متعلق کبھی مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب سے ماسٹر صاحب کی امید وابستہ رہی تھی، کہ مولانا روہنگیا مسلمانوں کی خدمات کے حوالے سے کوئی اچھے اور بارآور کام کریں گے، لیکن بعد میں آپ کے بیان کے مطابق آپ کی امیدیں درہم برہم ہوگئی تھیں، ویسے آپ کو مولانا کے متعلق خاصا پریشان بھی دیکھا گیا تھا۔

ارکان روہنگیا یونین (ARU) کی تشکیل ہوئی تو آپ نے اس فورم کا مفکرانہ، مبصرانہ جائزہ لیا، اور

آپ کے بیان کے مطابق آپ کو اس میں فتور ہی فتور نظر آرہا تھا، یوں اس فورم پر آپ نے جو تنقیدی نظر ڈالی تھی، میرے خیال میں وہ بڑے قابل قدر تھی۔

ماسٹر صاحب نے مولانا سلیم اللہ عبدالرحمن صاحب مرنگلوی صدر روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن برائے حقوق (RSOR) سے بھی اپنی آخری حیات میں امید وابستہ کرلی تھی، لیکن جہاں تک میں نے دیکھا کہ بعد میں آں جناب پر بھی آپ اپنی مایوسی کا اظہار کررہے تھے۔

ماسٹر صاحب بڑے ذہین اور تیز وطرار انسان تھے، ساتھ ہی ساتھ فصیح اللسان اور جادو بیان بھی، آپ کا ہر ایک بیان برجستہ، مرتب اور دلائل سے پر ہوا کرتا تھا، کہنے میں یوں تو آپ برمیز اور انگریزی دان دانشور تھے، لیکن آپ کے طرز زندگی اور انداز کلام میں عالموں کی شان نظر آتی تھی، آپ ہر حال میں نستعلیقی کیفیت کے انسان نظر آتے تھے، خاصی وضع داری کے ساتھ وضع قطع بھی دیکھے جانے کا قابل تھا، ارکان اور برما کی سیاست میں آپ بڑے درک رکھتے تھے، اور اس میں کسی قسم کے شبہ اور شک کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ ایک مبصر اور ایک منجھے ہوئے سیاست دان تھے، اور وطن عزیز کے مسائل ومشکلات پر گہری نظر رکھنے والا ایک انقلابی ذہنیت کا انسان بھی۔

ظاہر ہے کہ ماسٹر صاحب ایک جلیل القدر عالم دین کا صاحب زادہ تھے، یوں طبعی طور پر علماء اور طلبائے دینی مدارس سے خاصی محبت اور شفقت رکھتے تھے، میں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں آپ کو بہت ہی قریب سے دیکھا، آپ کے دوست، احباب اور ہم راز تقریبا سارے کے سارے علمائے کرام تھے، حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہریؒ (سابق مہتمم جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ) اور حضرت مولانا ابوسعید صاحب ہولی مرنگی (سابق ناظم جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ) ماسٹر صاحب کے بہت ہی قریبی دوستوں اور ہم رازوں میں تھے، ماشاءاللہ آپ کو علمائے کرام سے ان ہی کی زبان میں باتیں کرنے کی کافی لیاقت، استعداد اور ملکہ حاصل تھا، اللہ تعالی آپ کی زندگی کو قبول کرے۔

سعودی عرب میں تقریبا بارہ تیرہ سالوں تک مجھے آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، میں جبھی آپ سے ملاقات کو پہنچتا آپ کے چہرے میں روشنی سی آجاتی تھی، مجھے بڑے پرتپاک استقبال

کرتے، اور باتوں باتوں میں اپنا دل کھول کر رکھ دیتے تھے، ویسے تو آپ کی بہت ساری باتیں مجھے اب بھی یاد ہیں، طوالت کا خوف تو ہے لیکن پھر بھی چند باتیں یہاں حاضر خدمت ہیں:

۱۔ روہنگیا مسلمانوں کی شادیوں کے مواقع پر جو بعض رسومات دیکھی جاتی ہیں، وہ صرف اور صرف ان مسلمانوں کی قومی تہذیب سے متعلق ہیں، ان کا دینیات سے کوئی بھی تعلق نہیں۔

۲۔ شادیوں کے مواقع پر جو گڑھا دیا جاتا تھا (آج کل یہ رسم ہمارے یہاں متروک ہے) اس کا تعلق کسی بدعات وخرافات سے نہیں، بلکہ وہ بھی صرف روہنگیا قومی تہذیب سے متعلق تھا۔

۳۔ ہمارے یہاں جو فاتحہ خوانی ہوتی تھی اور وہ بھی صرف کھانے پینے کے موقع پر، وہ اس لئے کی جاتی تھی کہ اس زمانے میں چوں کہ ہماری اکثریت علم دین سے محروم تھی، لوگ دین سے بے گانے تھے، اس لئے مولوی حضرات کم سے کم کھانے کے مواقع پر ہی سہی اللہ تعالی کا نام لئے کچھ مختصر سورتیں اور دعائیں بلند آواز سے پڑھتے تھے، تاکہ تدریجا لوگ کچھ دینی امور سے مانوس ہوسکیں، حضرات مولویوں کا یہ فلسفہ اور حکمت اس وقت کے لحاظ سے بڑی بیش قیمت تھی، اور میں نے دیکھا کہ معاشرہ میں اس کا فائدہ بھی بہت ہوا تھا۔

۴۔ تہذیب ایک قوم کی بقاء کی ضامن ہوتی ہے، اس لئے روہنگیا مسلمانوں کو اپنی قومی تہذیب کی بقاء کے لئے کوشش کرنا بے حد ضروری ہے۔

۵۔ شادی کے مواقع پر خواتین اور لڑکیاں جو قومی راگنیاں الاپتی ہیں، ان میں روہنگیا قوم کے ماضی کی داستانیں ہوا کرتی ہیں، اپنے ماضی اور تاریخ کی طرف اشارات ہوتے ہیں، اس لئے میرے نزدیک ان کی بقاء کی بے حد ضرورت ہے۔

اللہ تعالی ماسٹر صاحب کی مغفرت کرے اور آپ کی تمام قومی اور ملی کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔

جناب احسان اللہ صاحب فوئمالوی مرحوم

جناب احسان اللہ صاحب کی پیدائش جنوبی مشرقی بوسیڈنگ کے معروف ومشہور قصبہ فوئمالی میں ۱۹۴۹ء میں ہوئی، کچھ ابتدائی دینی تعلیم اپنی بستی کے مکتب میں ہوئی، سرکاری پرائمری اسکول سے چوتھی جماعت پاس کرکے بوسیڈنگ ہائی اسکول میں داخلہ لیا، اور یہاں سے ہائی اسکول فائنل کیا، جو اس زمانے میں مٹرک کا مساوی ہوتا تھا۔

آپ کو بعض قریب سے جاننے والوں کے مطابق احسان صاحب کا مزاج دوران تعلیم بھی کچھ انقلابی سا تھا، برمی بدنام زمانہ جنرل نیون کے دور حکومت میں آپ کمیونزم اور سوشل ازم سے شدید متأثر ہوئے، بعد میں زیر زمین کام کرنے والی اس وقت کی غیر مسلم تنظیم برما کیونسٹ پارٹی (BCP) سے وابستہ ہوگئے تھے، ویسے آپ کے دل ودماغ میں کمیونزم کے خیالات جاگزین ہوگئے، جو زندگی بھر رہے، بارہا کوششوں کے باوجود اس سے آپ کو علیحدہ نہیں کیا جاسکا تھا۔

بعد میں احسان صاحب ترک وطن کرکے مع اہل وعیال بنگلا دیش آئے اور بمقام رنگیا خالی ٹیکناف مقیم ہوگئے، یہاں آپ نے ایک مختصر سا مکان بنایا اور بقیہ ساری زندگی یہیں گزاردی تھی۔

اس کے بعد آپ سرزمین ارکان کی معروف زیر زمین کام کرنے والی تنظیم روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) میں شامل ہوگئے تھے، لیکن یہاں آپ کے بعض خیالات نے خود اس مؤخر الذکر تنظیم والوں کو پریشان کردیا تھا، اور کبھی بھی اس تنظیم کے ارباب بست وکشاد اور نمایاں کارکنوں سے آپ قریب نہیں ہوسکے تھے، سب سے بڑی مصیبت یہی تھی کہ عنفوان شباب سے آپ کے دماغ میں جو کمیونزم کے خیالات گھر کرچکے تھے، اسے آپ جہاں بھی جاتے ساتھ لے کر جاتے تھے، فرد کے سامنے ہو یا اجتماع میں، ہرکجا آپ اپنے کمیونزم اور سوشل ازم والے خیالات سے لوگوں کو متأثر کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے، جو کبھی کبھار لوگوں کے لئے آفت جان اور مصیبت بن جاتی تھی۔

بایں ہمہ احسان صاحب بڑے صابر وشاکر اور کافی آن بان کے انسان تھے، آپ کی چال بڑی دھیمی اور باوقار ہوتی تھی، جسے دیکھ کر مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب (جو احسان صاحب سے بسا اوقات مذاق کیا کرتے تھے) ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ”احسان صاحب کی چال سے لگتا ہے کہ وہ ایک

مدبر انسان ہیں، اور گفتگو بھی اسی مدبرانہ انداز میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں' اس حوالے سے ایک بات یاد آگئی ہے کہ:

''ایک دن کا واقعہ تھا کہ ہم چندلوگ بشمول جناب احسان اللہ صاحب مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے ساتھ بودرہاٹ، چاٹگام میں پائی جانے والی ریسٹورنٹ (مدینہ ریسٹورنٹ) میں ظہرانہ کے لئے گئے تھے، کھانا منگوایا گیا، ہم سب پیٹ بھر کے کھا کے فارغ ہوگئے، لیکن احسان صاحب کھانا ختم کرنے کا نام بھی نہیں لے رہے تھے، آپ نے کھانا اتنا کھایا کہ ریسٹورنٹ کے خدام لڑکے بھی مزید در مزید کھانے لاتے لاتے تنگ سے ہوگئے اور ریسٹورنٹ کے تقریبا سارے لوگ آپ کی طرف ترچھی نظر سے دیکھ رہے تھے، اب مولانا نے اپنی زبان کھولی اور کہا کہ ''احسان صاحب خدارا آج تک کے لئے ختم کیجئے! سارے لوگ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، خداموں کی حرکات وسکنات زبان حال بن کر کہہ رہی ہے کہ یہ کیسا انسان ہے کہ ہم کھانے لاتے لاتے تنگ ہو چکے ہیں، لیکن اس کو خبر تک نہیں اور کھانے پر کھانے بے تھکے نگلتا انڈیلتا جارہا ہے'' لیکن احسان صاحب پھر بھی چھوڑنے والے نہ تھے، اور مزید اتنے کھائے کہ ہم سب شرما کے رہ گئے تھے''۔

احسان صاحب سے میری شناسائی تقریبا ۱۹۸۶ء سے تھی، آپ مجھے اکیلے پاتے ہی اپنے پرانے رٹے ہوئے گیت یعنی کمیونزم اور سوشل ازم والی نظریاتی داستان سرائی شروع کردیتے تھے، بہر حال اور جو کچھ بھی ہو میں آپ کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور جو کچھ فرمائے جاتے تھے میں بڑے صبر سے سنتا رہتا تھا، اور شاید کبھی آپ کو یہ بھی یقین سا ہوجاتا تھا کہ آپ نے جو کچھ بھی کہا وہ میرے ذہن نے قبول بھی کرلیا ہو۔ ایسے میں نہ جانے مولانا حسین احمد صاحب کو اس بات کا کیسا پتہ چل گیا کہ احسان صاحب مجھے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کررہے ہیں، ویسے ایک دن مولانا محترم میری موجودگی میں احسان صاحب سے کہنے لگے کہ جناب! طاہر کے سامنے آپ جو باتیں پیش کرتے ہیں آیا وہ سنتا بھی ہے؟ احسان صاحب کی طرف سے جواب ہاں میں آیا تو مولانا کہنے لگے تھے کہ وہ سنتا

تو شاید ہے لیکن میں جہاں تک جانتا ہوں کہ اس کے کان میں آپ کی بات سے جوں تک نہیں رینگتی، اور آپ کی ادھر سے سنتا اور ادھر سے نکال دیتا ہے، اس کی مسلسل صبر سے آپ یہ نہ سمجھا کریں کہ اسے آپ کی بات سے کوئی اثر بھی ہوتا ہو، کیوں کہ یہ ندوی لوگ ہیں، جن کے پاس ایک عظیم نصب العین اور بڑے مقاصد ہوا کرتے ہیں۔

میرے علم کے مطابق احسان صاحب سے مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کی شناسائی ۱۹۸۴ء سے بھی پہلے ہوئی تھی، جو بعد میں دوستی میں تبدیل ہوگئی، اور تقریبا ۱۹۸۵ء سے لے کر ۲۰۰۳ء تک ان دونوں کے مابین بڑی قربت رہی تھی۔

روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) میں بھی احسان صاحب چند مہینے کام کرتے رہے تھے، اس دوران آپ کے مولانا حسین احمد صاحب سے بہت ہی قریبی تعلقات ہوگئے تھے، لیکن جہاں تک میرا اندازہ ہے کہ احسان صاحب مولانا محترم کے افکار وخیالات اور علم ونظر سے متاثر نہیں ہوسکے تھے، وہ اس لئے ہے کہ احسان صاحب کے دل ودماغ میں جو کمیونزم اور سوشل ازم کے افکار وخیالات رس بس چکے تھے، وہ ان کے دل ودماغ سے نکلنے والے ہی کب تھے؟ جب کہ مولانا تو ایک خالص دینی اور اسلامی تعلیمات کے خوگر اور دین وایمان پر کاربند انسان ہیں، یوں ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان بعد المشرقین ہے، جو آپس میں ایک دوسرے کی ضد بھی۔

احسان صاحب یوں تو برمیز اور انگریزی کے تعلیم یافتہ دانشور تھے، نہ جانے کیسے کہ بنگلا دیش آکر آپ نے قدرے قلیل بنگلا زبان بھی سیکھ لی تھی، بنگلا میں آپ اپنی قوم کے حوالے سے کچھ لکھتے اور ہمیں دکھاتے اور کچھ پڑھ سناتے بھی تھے، آپ کی بڑی آرزو تھی کہ ان کی یہ چیزیں چھپ کر منظر عام پر آجائیں، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ آپ کی یہ آرزو آخر کار پوری نہیں ہوسکی۔

احسان صاحب دل کے اچھے انسان تھے، آپ کو قوم سے بڑی ہمدردی تھی، آپ سے راقم سطور کی قربت ۱۹۸۶ء سے لے کر ۲۰۰۰ء تک مسلسل برقرار تھی، نہ جانے کس وجہ سے کہ آپ اس کے بعد تقریبا ہمارے سیاسی اور انقلابی افق سے غائب ہوگئے، بعد میں یہ خبر پاکر آسمان سر پر ٹوٹ پڑا کہ آپ اس دنیا میں نہیں اور رنگیا خالی میں مدفون ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آٹھواں باب

(مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے خطبات اور چند مقالات)

ایک مختصر خطاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصلاۃ و السلام علی الصادق الامین ، الرسول محمد علیه الصلاۃ و السلام ، وعلی آله و صحبه ،ومن اتبع رضوانه سبل السلام الی یوم الدین ، و لا عدوان الا علی الظالمین، امابعد۔

ملتِ مرحوم اورارکان وبرما کے مسلمانو!

توحید ورسالتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامو!

حاملینِ قرآن وسنتِ محمدیؐ کے علم بردارو!

ہزارسالوں سے اسلام کا جھنڈا بلندرکھنے والے قال اللہ وقال الرسولؐ کی درسگاہوں کے رجالِ کارو!

ہزار ظلم وستم اورعدوان وتعدی کے بیچ اللہ پرتوکل، اللہ کا تقوی، اللہ کی اطاعت و بندگی، اللہ کے رسولؐ کی محبت اورسنت کی اتباع کی عشق وشیفتگی کونہ چھوڑنے والے فداکارو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،،

اسلام خطۂ ارکان اورعلاقۂ برما میں پہلی صدی ہجری میں پہنچا، یوں یہاں اسلام کی دعوت، اسلام کی رسالت، اسلام کے انوار و برکات، اسلام کی ضیا پاشی و فیضان کی تاریخ تیرہ صدیوں سے زیادہ

عرصے پر مشتمل ہے، یہاں ارکان میں صدیوں تک مسلمانوں نے حکومت کی، یوں یہاں کی تاریخ صدیوں پر محیط اسلام کی ایک لازوال تاریخ ہے۔

ہماری یہ قوم صدیوں پر پھیلی ہوئی اسلام کی تاریخ پر، اسلام کے جھنڈا بلندرکھنے کی فکر پر، قرآن و حدیث کی اشاعت ونشر کرنے والی محنت پر، دعوت وتبلیغ دین اسلام کو عام کرنے کی جہدِ مسلسل پر، اللہ وراس کے رسولؐ کی رضا جوئی کی محنت وکوشش پر ایک اسلامی زندگی گزارنے والی قوم ہے۔

ہماری قوم کی حکمرانی اورتحت وطاؤس کی تاریخ بڑی شاندار ہے، لیکن آج سے بہت سالوں پہلے، بلکہ صدیوں پہلے ہم نے اپنے تاج وتحت کوکھودیا ہے، ہم کم سے کم سوسال پہلے سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوے ہیں، ہم مقہور ہیں، مظلومی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

تاریخ کے صفحات کوآپ حضرات پڑھیں گے اورضرور پڑھیں گے، مورخین نے جن میں ہمارے ملک کے بھی ہیں اور پردیسی بھی، مسلمان بھی ہیں اورغیر مسلم بھی، ہمارے متعلق، ارکان، برما اور جنوبِ شرق ایشیا کی تاریخ کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے، آپ ان سے مختصر ومطول معلومات حاصل کریں گے، جو بہت مفید ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ پر کلی طور پر صحیح ہے، بلکہ تاریخ اسلامی، اصولِ دین، شریعتِ اسلامی کا فیصلہ ہے کہ جس دیس پر، جس خطۂ زمین پر، کرۂ ارضی کے جس کسی ٹکڑے پر معمولی سے معمولی مدت اور کچھ زمانے کے لئے ہی سہی ایک مرتبہ اسلامی حکومت قائم ہوئی ہو، پھر وہاں کے مسلمان اس اسلامی حکومت وسطوت کوکھوکر مقہور اورمظلوم ہو چکے ہوں تو عام مسلمانوں پر فرض علی سبیل الکفایۃ ہے کہ اسی سرزمین اور وہاں کے مسلمانوں کو دوبارہ مظلومیت ومقہوریت والی دکھ اور دردبھری داستان سے نکال کرحاکمانہ زندگی کی طرف واپس لائیں، وہاں عدل وانصاف کا بول بالا کریں، وہاں امن ومساوات کے ماحول وفضا قائم کریں، وہاں قرآنِ کریم کی زمزمہ سنجی کے ساتھ سنت محمدیؐ کے چرچے کوعام کریں ،اوراسلام کی سطوت وبالادستی کے لئے پرزورکوشش، محنت اورجدوجہد کیا کریں۔

میں تاریخ کے طول طویل ادوار کی داستان سرائی یہاں نہیں کرنا چاہتا ہوں، بس کہنا یہی ہے کہ یہاں برطانوی استعمار پھراس سامراجی طاقت وقوت کے چنگل سے آزاد ہونے تک کا ایک دور ہے،

اس کے بعد برطانیہ سے آزادی سے لے کر آج تک کا اور ایک دوسرا دور بھی ، آپ برطانوی سامراجیوں سے برما اور جنوبِ شرق ایشیا کے دیگر مما لک کی آزادی کی ستر اسی سالہ تاریخ پر سرسری نظر ڈالیں گے تو عیاں طور پر دیکھیں گے کہ ہم نے برما کی آزادی کے دوران یہاں پائی جانے والی نسلی گروہوں، مختلف قوموں، متنوع مذاہب کے پیروکاروں اور دیگر طرح طرح کے ادیان کی تعلیمات پر یقین رکھنے والوں کے ساتھ برطانوی سامراجیوں کے خلاف اس وقت رونما ہونے والی اور چل چلائی جانے والی تحریکِ آزادی اور سیاسی انقلاب میں بھرپور حصہ لیا ، اور ایک تبدیلی، ایک تغییر اور ایک انقلاب لانے کی پرزور محنت اور کوششیں کی تھیں ، جی ہاں ان تمام کوششوں میں ارکان اور برما کے مسلمانوں کی جدوجہد کسی بھی معنی میں کم نہیں تھی ، بلکہ ان کوششوں میں ہم پیش پیش رہ چکے تھے۔

یہاں اس علاقے کے بچے بچے اور ہر کس و ناکس جانتے ہیں، اور جاننے والی بات بھی ہے کہ برما کی تحریکِ آزادی کے لیڈر اونگ سان کے قافلۂ تحریک آزادی میں جن چند بڑے بڑوں کے نام گرامی پائے جاتے ہیں ، ان میں قائدانہ کردار ادا کرنے والے لوگوں میں ایک بڑا نام سیا جی (ماسٹر جی) عبدالرزاق کا بھی ہے، اس زمانے میں یہاں کے سیاست دان اور محرک لیڈران جن میں اونگ سان اور نیون بھی تھے، انہیں ایک سیاسی گوڈ فادر یعنی ہندی زبان میں سیاسی گرو اور ہماری زبان میں سیاست وقیادت کے استاد کے بطور سمجھتے اور جانتے تھے۔

برما کی آزادی کے بعد جو پہلی برمیز وزارتیں تشکیل پائی تھیں، ان میں مختلف قوموں کے وزراء کے ساتھ ہمارے بھی تین مسلم وزراء شامل تھے، وہ نہ صرف مسلمان تھے بلکہ دین دار اور پرہیز گار بھی تھے، اور صرف اتنے ہی نہیں بلکہ وضع قطع کے لحاظ سے ان کے احوال پر ایسا کہا جا سکتا ہے کہ وہ واقعی مسلمانوں کی نمائندگی کے لائق تھے۔

آزادی کے بعد اگلے دس بارہ سالوں تک جمہوری نظامِ حکومت کے ماتحت ملک کو چل چلایا گیا تھا، اس کے بعد افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایک زبردست سیاسی سازش ہوئی ، اونو اور نیون نے ایک پراسرار سیاسی سرگوشی اور کاناپوسی کر کے جمہوری نظامِ حکومت کو ہٹا کر فوج کو برسرِ اقتدار لایا۔ اس حوالے سے میرے پاس ایک باوثوق روایت جو پہنچی ہے ، جسے میں کلی طور پر تصدیق کرتا

ہوں ، اس کے مطابق دراصل ملک میں پائی جانے والی تمام اقلیات کے خلاف اونو کی ایک سیاسی چال بلکہ اونو اور نیون کی ملی بھگت میں سازش کی گئی تھی کہ جمہوری نظامِ حکومت کو ہٹا کر ملک پر فوج کو مسلط کر دیا گیا تھا، تاکہ برما کے پہلے دستورِ آساسی کے مرقومہ ومتذکرہ حقوق والے دفعات سے یہ کہہ کر مکھرا جا سکے کہ اب ملک میں جمہوری نظامِ حکومت نہیں رہا کہ دستور کے ان دفعات پر عمل در آمد کیا جا سکے، جس میں کہا گیا تھا کہ برما میں جتنی قومیں، جتنی نسلی گروہیں اور جتنے مذاہب کے پیروکار ہیں ان سب کو مساویانہ طور پر بنیادی حقوق دیا جائے گا ، یاد رہے کہ اسی دستور میں یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ فیڈرل یونین آف برما کے تحت ساری قوموں اور تمام نسلی گروہوں کو مساویانہ بنیادی ، انسانی اور سیاسی حقوق ملیں گے۔

آزادی کے آٹھ دس سال گزرتے نہ گزرتے ان بد باطن برمی لیڈروں کے دلوں میں ایک ناپاک خیال پیدا ہو چکا تھا ، کہ اب ان کے مطابق برطانوی استعمار کے خلاف کیا جانے والا انقلابی دور ختم ہو چکا ہے، برطانوی حکومت یہاں سے چلی گئی ، اب اقتدار پر ہم برمیوں کا قبضہ ہے، ہم برمن ہیں، جو یہاں کی واحد بڑی مقتدر قوم ہے، ویسے برما کے پہلے دستور میں یہاں کی چھوٹی چھوٹی قوموں اور نسلی گروہوں کو جو مساوی حقوق دینے کا وعدہ کیا گیا تھا یہ ایک سیاسی غلطی تھی ، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں سے جس کسی بھی قوم اور نسلی گروہ کو جتنے بھی کم حقوق دے کر پھسلا یا/دھوکہ دیا جا سکے، اور ان سے جان چھڑائی جا سکے، اس میں ہی عافیت ہے۔ ایسی بد باطنی ، نالائقی اور ناپاکی پر مشتمل فکر وخیال ان برمی لیڈروں کے اندر پیدا ہو چکا تو (اس وقت کے برمی وزیر اعظم) مسٹر اونو نے (اس وقت کے آرمی چیف آف اسٹاف) نیون کو سکھلا دیا کہ تم ہماری جمہوری حکومت کو برطرف کر کے اقتدار پر قبضہ کر لو۔

تو ظاہر ہے کہ اس وقت جمہوری نظام حکومت کو برطرف کر کے برمی فوج کا اقتدار پر مکمل طور پر قبضہ دراصل یہ ان بد باطن لیڈروں کی کاناپوسی اور ملی بھگت کا نتیجہ تھا، جو ان بد باطنوں کی ایک سیاسی چال اور ناپاک وناروا ساز باز تھا، اور کاناپوسی کے ذریعے ایک سیاسی اتفاق (اتحاد) کا مظاہرہ تھا۔

بہر حال برما میں ابھی جمہوریت کے دس بارہ سال گزرتے نہ گزرتے اونو کی جمہوری حکومت کو ہٹا

دیا گیا، اور اقتدار پر فوج نے قبضہ کرلیا تو نیون کی قیادت میں فوجی حکومت کی ابتدا ہوئی، جسے انقلابی حکومت کا نام دیا گیا تھا، مذکورہ یہ جو روایت ایک باوثوق ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے، اور جس پر ہمارا یقین ہے، آج آپ حضرات کے سامنے پیش کیا ہوں۔

یوں اس زمانے سے لے کر آج تک پوری منصوبہ بندی کے ساتھ بڑے ضابطے سے برما کی تمام اقلیات پر عموماً اور ہم مسلمانوں پر خصوصاً برمی عنصریت پرست وعصبیت پسند قوم وحکومت کی طرف سے پے در پے مظالم ہوتے رہے ہیں، ان ہونے والے مظالم کے حوالے سے ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ ہمارے علی الرغم برما کی دیگر وہ اقلیات جن کا مذہب، دھرم وکرم، اخلاق وثقافت برمیوں سے ملتا جلتا یا ان کے درمیان قریبی رشتے وتعلقات ہیں، ان پر ہماری بہ نسبت مظالم کم ہوئے، اور مذکورہ ساری چیزوں میں ان برمیوں کے ساتھ ہماری عدم یگانگت کی وجہ سے ہم پر مظالم کی شدت زیادہ ہوئی۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ رنگ ونسل، مذہب وعقیدہ، زبان وادب، اخلاق وکردار، تمدن اور ثقافت وغیرہ کے حوالے سے ہمارے مابین زمین وآسمان کی تفاوت ہے۔ اور اس پر کچھ اور بتاؤں تو بات یہی ہے کہ ہم مسلمان ہونے اور ہمارا دین اسلام ہونے کی وجہ سے ہم پر مظالم کی چکی بڑی شدت کے ساتھ چل چلائی گئی اور اب بھی جارہی ہے۔

ان مذکورہ باتوں پر مستزاد یہی ہے کہ ارکانی تاریخ میں ماضی میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے کہ کم سے کم پانچ صدیوں تک یہ ایک آزاد اور خودمختار ملک رہ چکا تھا، جس میں کبھی مسلمان اور کبھی مگھ لوگ حاکم اعلی ہوا کرتے تھے، یہاں جب کبھی مسلمان حاکم اعلی ہوتا تو اس کا نائب ر دوسرے تیسرے درجے کے حکام اعلی مگھ ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح جب کبھی حاکم اعلی مگھ ہوتا تو اس کا نائب ر دوسرے تیسرے درجے کے حکام اعلی مسلمان ہوا کرتے تھے، یعنی یہاں اس دور میں مسلمان اور مگھوں کی متحدہ ومشترکہ حکمرانی رہ چکی تھی۔ (یاد رہے کہ ارکان کی ان دو بڑی قوموں میں سے ہمارے برعکس مگھوں کے ساتھ برمیوں کی خاصی قریبی رشتے اور یگانگت ہے)

(۱) اور اس لئے بھی ہم پر مظالم زیادہ ہوئے کہ ہمارا یہ علاقہ جو کبھی ایک آزاد ملک رہ چکا تھا، جس کے متعلق برمیوں کو اس بات کا شدید اندیشہ ہے بلکہ ان کو غم کھایا جارہا تھا اور ہے کہ کہیں یہاں کے یہ

مسلمان اور مگھ باہم متحد نہ ہوجائیں، اور ان دونوں قوموں کی ملی بھگت میں یہاں کے تمام باشندے دوبارہ مکمل آزادی کا خواب نہ دیکھ پائیں۔

(۲) اور اس لئے بھی ہم مسلمانوں پر مظالم زیادہ ہوئے کہ ہمارا علاقہ ایک مکمل آزاد مسلم ملک سے ملا ہوا ہے، جو برطانیہ سے آزادی کے بعد یہ کبھی مشرقی پاکستان تھا اور اب بنگلہ دیش ہے، یوں بنگلہ دیش کے ساتھ جڑی ہوئی ہماری سرحد کا ہونا ان برمیوں کے لئے باعثِ خطرہ ہے۔

(۳) اور اس لئے بھی ہم پر مظالم زیادہ ہوئے کہ ہم مسلمان سیاست کے حوالے سے بڑے غافل تھے، یوں ان ظالموں کو ہم پر ظلم وعدوان کی مسلسل چکی چلانے کا موقع زیادہ ہوا ہے۔

(۴) اور اس لئے بھی ہم پر مظالم زیادہ ہوئے کہ ہماری مذہبی قیادتیں، قرآن وحدیث کے ترجمانان، میدان دعوت وتبلیغ کے حوالے سے فکر اور محنت کرنے والے حضرات سیاسی شد بد رکھنے کو ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے، صرف یہی نہیں بلکہ سیاسی شد بد رکھنے والوں کو تند وتیز نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ اور ان تمام حقائق پر مستزاد:

☆ ہم اپنی سیاسی عاقبت سے ناواقف اور نابلد تھے۔

☆ ہم پر مسلسل ہونے یا کئے جانے والے مظالم کا سلسلہ کہاں جاکر ٹھہرے گا اس کا ہمیں کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔

☆ علاوہ ازیں ہمیں خواب غفلت اور سیاسی جہالت میں رکھ کر اور اس پر مستزاد ہم پر طرح طرح کے مظالم ڈھاتے ہوئے اب ظالم ظلم وعدوان کی زبان سے یہ کہتے نہیں تھکتے کہ:

☆ روہنگیا یہاں کے نہیں ہیں بلکہ کہیں باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔

☆ یہ لوگ پردیسی ہیں، دخلاء، کلا (کالے رنگ کے بنگالی یا ہندی مسلمان) ہیں۔

☆ یہ گندے ہیں، ان کے جسموں سے بدبو آتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ طرح طرح کے الزامات واتہامات تراش تراش کے ہمیں اپنے ہی وطن میں خانہ بدوش اور اس سے بے دخل بلکہ ملک بدر کرنے کی ناپاک کوششیں کی گئیں اور اب بھی کی جارہی ہیں، جن کی وجہ سے اب ہم کرۂ ارضی کے بیشتر ملکوں میں منتشر ہیں، ہم یورپ اور امریکہ تک پہنچے ہوئے ہیں، جنوب

شرق ایشیا کے شاید ایسا کوئی ملک ہو کہ جہاں ہماری برادری کے لوگ نہیں پائے جاتے ہوں، بنگلہ دیش، پاکستان سمیت خلیجی ممالک میں ہماری برادری کے لوگ بے یار و مددگار، بے بس، لاوارث، مہاجرت اور مسافرت کی زندگی گزار رہے ہیں، مگر یاد رکھو! کہ خزاں سے ملحق بہار بھی رہتی ہے، رات کے ساتھ دن بھی رہتا ہے، ظلم و عدوان کے تہ بتہ عدل و انصاف کی دعوت و پیغام بھی رہتا ہے۔

بایں ہمہ یاد رہے کہ ماضی میں ہمارے تمام لوگ خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے نہیں تھے، اگر چہ سوئے ہوؤں کی تعداد زیادہ تھی، تاہم ان میں کچھ جاگنے والے بھی ضرور تھے، اگر چہ غفلت کے مارے ہوؤں کی تعداد زیادہ تھی، لیکن ان میں چست و چالاک و ہشیار اور بیدار بھی بہت سوں تھے، ماضی میں ہمارے ان جاگے ہوئے ہشیاروں نے سامراجیوں اور سازش کاروں کے خلاف سیاسی تحریک شروع کر رکھی تھی، اور اب ان کے لائق اخلاف اور خوشہ چینان ان کے پیچھے پیچھے حالیہ بالادستی، جاگیرداری اور عنصریت پسندی کے خلاف انقلابی کاروبار (کاروائی) جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ماضی بعید سے کسی قدر صرفِ نظر ہمارے بزرگوں کی معروف پہلی سیاسی و انقلابی تنظیم روہنگیا انڈی پینڈٹ فورسس (RIF) تھی، بعد میں اس کی بدلی ہوئی شکل روہنگیا پیٹریاٹک فرنٹ/ روہنگیا فدائین محاذ (RPF) وجود میں آئی، جس کی قیادت محمد جعفر حبیب رحمۃ اللہ علیہ کر رہے تھے، بعد میں یہ تنظیم تقسیم کی شکار ہو کر اس میں سے پہلی ارکان مسلم آرگنائزیشن (AMO) پھر اس کی بدلی ہوئی شکل روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) منظر عام پر آئی، اور اگلے چند سال گزرتے نہ گزرتے موخر الذکر تنظیم بھی انتشار و اضمحلال کی شکار ہو گئی اور اس میں سے ایک ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے نام سے تنظیم وجود میں آئی، بعد میں روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن میں جس طرح تقسیم در تقسیم ہوتی رہی تھی، اسی طرح ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ بھی اس جان لیوا مصیبت سے اپنے دامن کو بچانے میں بری طرح ناکام رہی تھی۔

اب اللہ تعالی کی ذات سے ہماری یہی تمنا و امید ہے کہ ہمارے ان حضراتِ بزرگانِ قوم و ملت میں سے جنہوں نے ہمارے ماضی قریب و بعید کے انقلابی قافلے میں شرکت کی، وقت لگائے، بھوکے پیاسے رہے، اس راہِ دعوت و عزیمت میں تکلیفیں اٹھائیں، طرح طرح کے غم و ستم کھائے، بھانت

بھانت کے مظالم سہے، ان میں سے جو دنیا سے رخصت ہوئے انہیں شہدائے بدر و حنین کے ساتھ حشر کریں، اور جو ابھی بھی برسرِ عمل و پیکار ہیں، من قریب و من بعید، جسے جتنی بھی صلاحیت ہے، اس کے مطابق فکر میں لگے ہوئے ہیں، اور جسے جتنے اخلاص، توکل اور تقوی ہے اس کے مطابق کام کر رہے ہیں، انہیں مزید توفیق عنایت فرمائیں۔

ایک طرف دشمن نے ہمیں خانہ بدوش کرنے، نیست و نابود کرنے، تاریخ کے اوراق سے کالعدم نہیں بلکہ معدوم سراسر کرنے کی کوشش کی، تو دوسری طرف ہمارے رجال کار، سیاسی، دینی اور انقلابی قائدین نے ہمارے وجود کو ہمارے ملک میں استوار کرنے، قائم و دائم رکھنے، مستمر کرنے اور مستقیم کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں، اب اس حق و باطل کی کشمکش میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ہمارے حالات کیا ہیں؟؟ یہ بھی ذرا سن لیجئے!

☆دشمن نے ہمیں مارنا چاہا تو ہم مرے بھی ہیں مارے بھی،

☆ہمیں ختم کرنا چاہا تو ہم قدرے ختم بھی ہوئے اور زندہ بھی،

☆ہمیں ملک بدر کرنا چاہا تو ہم ملک بدر بھی ہوئے اور ملک والے بھی،

☆ہمارے وجود کو دنیا کی تاریخ سے مٹانا چاہا تو ہم قدرے مٹے بھی ہیں اور باقی بھی ہوئے،

☆ابھی ہم اندرون وطن میں بھی ہیں اور خارج از وطن بھی، دنیا کے گوشے گوشے میں ملائین کی تعداد میں رہائش پذیر ہیں،

☆پچاس سال پہلے ہمارے انقلاب کی ابتدا میں ہمارے مستعد اور باصلاحت قائدین اگر سو تھے اب ہزار پائے جاتے ہیں،

☆آج سے پچاس سال پہلے ہم میں ڈاکٹریٹ (PHD) کی ڈگریاں والے پانچ تھے تو اب پچاس سے زائد ہو گئے،

☆آج سے پچاس سال پہلے ماجستر (MA) کے سند یافتے پچاس تھے تو اب کئی ہزار ملتے ہیں،

☆اس زمانے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں قوم کے مستقبل، دینی، دعوتی، اجتماعی، سماجی، اور ثقافتی تاریخ کو سنبھالنے اور سدھارنے اور سیاسی شد بد رکھنے والے علماء پانچ سو تھے آج دس ہزار سے

کہیں زیادہ۔

☆ دنیائے اسلام ہمارے نام سنتی تو پہنچانتی نہ تھی، جانتی نہ تھی ارکان اور روہنگیا کہاں ہیں؟ برما دنیا کے کس خطۂ زمین میں ہے؟ ارکان کتنے مربع میل کا علاقہ ہے؟ وہاں کے خط وخال اور نشیب وفراز کیا ہے؟ غرض یہ اور ان جیسی باتوں کو بڑی بڑی کتابیں لکھ لکھ کر، پنڈتوں کو مجالس میں حاضر کر کرکے، شاعروں کے لئے انجمنیں سجا سجا کر، قوالوں کے لئے محفلیں آراستہ کرکر کے سمجھائے جاتے تو بھی لوگ سمجھتے نہیں تھے، یا سمجھنے سے قاصر تھے، لیکن:

☆ آج ہماری آوازیں اقوام متحدہ (UNO) کے مراکز تک پہنچ گئی ہیں،

☆ سلامتی کونسل میں آئے روز ہمارے متعلق جلسے منعقد ہوتے رہتے ہیں،

☆ دنیا میں جتنے مسلم سربراہانِ مملکت ہیں، ان میں سے کوئی ایسے نہیں کہ جس کو ہماری پریشان حالی کی خبر نہ ہو، وہ ہماری حالت زار سے واقف نہ ہو،

☆ اور خود ہمارے اندر سے درجنوں ایسے بھی لوگ پیدا ہوئے، جو اقوام متحدہ کی اسمبلیوں میں داخل ہو کر دست گریباں ہو سکتے ہیں، ہماری قومی تاریخ کو من وعن بیان کرنے پر قادر ہیں، ہماری قومی ثقافت ودعوت، ہمارے سیاسی خط وخال اور دینی ساکھ ووقار کے متعلق بڑی خوبی سے حقائق پیش کر نے کی قدرت رکھتے ہیں۔

☆ علاوہ ازیں عالم اسلام کی جو مسلم برادری اور قائدین ہیں وہ ہمارے مستقبل کو ماضی قریب سے ملانے اور ہمیں اپنے شاندار ماضی کو واپس دلانے کی فکر میں آئے دن سامنے کی طرف گام زن ہیں۔ ویسے یہ اور ان جیسے نقطہ ہائے نظر سے سوچا جائے تو ظاہر ہے کہ ہماری ترقی ہوئی ہے۔

ابھی بات ہے ہمارے اتحاد واتفاق کی، ہماری بکھری ہوئی طاقتوں، منتشر محنتوں اور کوششوں کو یک جا کرنے کی، کم سے کم اگر ہم اپنے دین وایمان، اپنا تقوی واخلاص، اپنی امانت شعاری ودیانت داری، اپنی کوششوں اور کاوشوں کو ایک متعین سمت سفر کی طرف متوجہ کر سکیں گے تو انشاء اللہ امید ہے کہ ہم بہت ہی قریبی مدت میں اپنا کھویا ہوا شاندار ماضی واپس لانے کے تہہ بتہہ قرآن وحدیث کے مزاج، وقار وساکھ، عظمت وکبریائی کو بحال کر سکیں گے، اور توقع ہے کہ دنیائے اسلام میں ایک باوقار

قوم کی حیثیت سے ہماری پہنچان ہوگی، ہم برما سے علیحدہ ہو سکیں گے تو الحمد للہ، اگر برما کے ساتھ رہنا بھی پڑے تو بھی ہم فیڈرل یونین آف برما میں وہاں کی دیگر اقوام کے ساتھ ان کا شانہ بشانہ ایک مستقل، زندہ، آباد اور آزاد قوم کی حیثیت سے زندگی گزار سکیں گے، ہم اسلامی دعوت وفکر کے کام بخوبی انجام دے سکیں گے، ہمارے مدارس پر رونق ہوں گے، ہماری مساجد آباد ہوں گی، ہمارے دیس میں صدائے غیب اور آذانِ سحر گونجنے لگے گی۔

آپ حضرات سے آج کی یہ میری اس نوعیت کی پہلی ملاقات ہے، اللہ تعالی ہمیں بات کو سوچ سوچ کر کہنے اور کام کو سمجھ سمجھ کر کرنے کی توفیق عنایت کرے، اور جو لوگ انتشار وخلفشار والی فکر وخیال کے شکار ہیں، انہیں تنظیم میں شامل، اور نئی ترتیب میں داخل ہو کر مستقل طور پر کام کرنے کی توفیق سے نوازے، وصلی اللہ تعالی علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

اواخر جولائی/۲۰۲۱ء

دوسرا ایک مختصر خطاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میرے عزیز محترم مولوی محمد یونس ارکانی صاحب!

امید ہے کہ خیر و عافیت سے ہوں گے، اور دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ کو بخیر و عافیت سے رکھے۔

آپ کی عمر تو کافی ہو چکی ہے، غالبا پچپن، ساٹھ یا اس سے بھی آگے، اگر مجھے کہنے کی آزادی دی جاتی ہے تو عرض ہے کہ میں یہ اور اس جیسے کاموں کو فتنہ پردازی سمجھتا ہوں، افسوس ہے کہ آپ کبھی کبھار میرے یہاں ایسی ایسی خبریں بھیجتے ہیں کہ جن کا جواب دینا کبھی مناسب سمجھتا ہوں اور کبھی انہیں غیر ضروری سمجھتے ہوئے جواب دینا غیر مناسب سمجھ کر خاموشی اختیار کر لیتا ہوں، آج میں بعد ظہر چائے پینے کے دوران آپ کا بھیجا ہوا مراسلۂ صوتیہ ایک بار سنا، پھر اس کے معا بعد دوبارہ بھی سنا، یوں اکیس بائس منٹ کا ایک لا حاصل، بے مقصد، بے مراد، بے علم اور بے معرفت بیان کو دوبار سن کر چالیس یا بیالیس منٹ کا ضائع کر دینا میرے لئے بڑی تکلیف دہ ثابت ہوا ہے، پھر بھی اس صوتیہ مراسلے کے حوالے سے چند مختصر کلمات آپ کا گوش گزار کرنا چاہتا ہوں، اس امید پر کہ آپ ان مختصر رووس الاقلام کو کچھ سمجھنے، ان کلمات کو باہم تطبیق دینے، ان پر حتی المقدور عمل پیرا ہونے، اندفاع کرنے یا غیرتِ ملی کو جنبش و حرکت دینے کو ضروری سمجھیں گے، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر دیں۔

ہم نے علم کو نام و نمود کے لئے، بطور ایک عالم نمایاں ہونے کے لئے، بلا وجہ قوم کے سامنے مبلغ دین وملت ہونے کے لئے نہیں سیکھا، خواہ مخواہ مبلغ اسلام اور مبلغ علوم و معرفت کا جذبہ نہ بچپن میں تھا او رنہ عنفوانِ شباب میں، ویسے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میری اس عمر میں اس قسم کے جذبہ کا ہونا کیسا ممکن ہے، تاہم امت کی ضرورت کے پیش نظر کسی خاص دینی و علمی بنیاد پر کسی مہمات پر اٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ ماضی میں بھی تھا اور الحمد للہ اب بھی ہے، جسے آپ حضرات نے ماضی میں بھی دیکھا اور خدا کرے تو مستقبل میں بھی دیکھیں گے۔

یہاں کتنے لوگ کس نوعیت کی فتوی بازی کرتے، اس حوالے سے کتنی باتیں بناتے ہیں یہ سب آپ کی نظروں کے سامنے ہیں، افسوس ہے کہ اس قسم کے سارے لوگ " ادعیاء العلم لیسو علی علم، وعلی قسط من العلم، وعلی حرف من العلم، وعلی طرف من العلم" ہیں، یعنی انہیں علم کا ایک حرف بھی نہیں آتا، علم کا ایک طرف بھی نہیں جانتا، یہ لوگ علم کے ایک کلمہ تک سے سراسر محروم ہیں، اور نہ علم کا کوئی شعور و بصیرت ان کے پاس ہے، ایسے لوگوں کی بعض باتیں میرے کان بھی پڑتی ہیں۔ اب کیا میرے لئے ممکن یا گنجائش ہے کہ ان سب کو پکڑ پکڑ کر اصلاح کروں؟ علاوہ اس کے کہ آیا میں بھی کتنے علوم کا حاوی ہوں، یہ بھی الگ ایک سوال ہے، اس لئے بھی بعض حالات میں چپ رہنا مناسب سمجھتا ہوں۔

چوں کہ آپ ایک علمی نسل کا انسان ہیں، اور آپ بذاتِ خود دعوت علم و عمل اور تبلیغ علم و دین کے ساتھ وابستہ رہنے کے مدعی ہیں، شاید آپ اس لئے ایک مخصوص جگہ کے مراسلۂ صوتیہ کو میرے یہاں بھیجنے کو ضروری سمجھے ہوں گے، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ آپ کو مجھ پر خاصے اعتماد ہے، اگر بات ایسی ہے تو الحمد للہ، اگر اس کے برعکس مجھے بھڑ کانے یا دنگل میں کشتی بانی کا غرض ہے تو انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میرا مزاج دنگل میں کشتی بانی کا تھا اور نہ اب بھی ہے، کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ:

"من تعلم علما لیماری به العلماء، ولیواری به السفهاء، ولیعرف به وجوه الناس الیه، الجم بلجام من النار"

مفہوم یہ ہے کوئی بھی آدمی عالموں کے ساتھ بیٹھے بیٹھائے باتوں کا بتنگڑ بنانے، ان کو پکڑ دھکڑ کرنے، ان کے ساتھ حرب و ضرب اور مناظرہ بازی کرنے، ان میں سے کسی کو غالب اور کسی کو مغلوب کرنے، یا عوام الناس کی نظریں اپنی طرف متوجہ کرنے کی نیت سے علم سیکھا تو اسے جہنم میں جلی ہوئی گرما گرم رسیوں سے گھسیٹا جائے گا۔

دوسری طرف مشکوۃ شریف میں ایک حدیث مروی ہے کہ:

"من تعلم علما ممن یبتغی به وجه اللّٰه، لا یتعلمه الا لیصیب به عرضا من الدنیا لم یجد عرف الجنة، فان ریحها لتوجد من مسیرة خمسین او سبعین سنة" (روایت دو قسم کی ہے)

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر علم اللہ تعالی کی خوش نودی اور رضا مندی کے لئے سیکھا جائے، اور اگر سیکھے

ہوئےعلم کے ذریعے بندوگان خدا کی خوش نودی،شہوت نفس کی غلامی،لوگوں کے مابین فتنہ وفساد کی فکر مقصود ہوتو وہ جنت کی خوشبو تک سے بھی محروم ہو جائے گا۔اس لئے میرا مزاج طالب علمی کے زمانے سے ایسا نہیں تھا،تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس بڑھاپے کے عالم میں ویسا کیسے ہوسکتا ہے۔

جس کا رسالۂ صوتیہ آپ نے میرے یہاں بھیجا ہے، وہ ایک مجہول الھویہ ہے، میں نہیں جانتا وہ آدمی کون ہے، تاہم یہ سچ ہے کہ اس نے اکیس منٹ میں جو باتیں کیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک سلیم العلم والفطرت آدمی نہیں ہے،صدق وصفائے علمی سے اس کے دور دور تک کا رشتہ نہیں ہے، اس نے اس دوران قرآن کریم کی کوئی آیت پڑھا ہی نہیں، تاہم جو حدیثیں پڑھی ہیں، وہ بھی سراسر غلط، محدثین میں سے صرف اور صرف ناصر الدین البانی کا نام لیا ہے، ان کے علاوہ کسی بھی محدث کا نام نہیں لیا، وہ اپنی باتوں کو محدثین کی طرف منسوب تو کیا ہے، لیکن کسی بھی ایک محدث کا نام نہیں لیا، وہ کسی عمل کو شریعت اسلامیہ میں غیر مشروع ہونے کا دعویدار تو ہے لیکن اس حوالے سے بطور سند کسی بھی ارباب علم، ائمۂ اسلام، ارباب سند، ارباب اعتماد، اصحاب مصدر میں سے کسی کا نام نہیں لیا، اس نے بس اتنی سی بات پر اکتفاء کیا ہے کہ ''یہ مشروع نہیں ہے'' علاوہ ازیں طرفہ تماشا ہے کہ اس نے ایک حدیث کو تین تین مرتبہ ''ضعیف، ضعیف، ضعیف'' کہہ کر ایک نام نہاد اصطلاح گڑھ لی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ دوسری یا تیسری صدی ہجری میں درایت و اصول حدیث کی تدوین، ترتیب شروع ہوئی ہے، یوں آج تک کوئی گیارہ صدیاں گزر گئی ہیں، کسی بھی ایک محدث کی زبان وقلم سے اس مذکورہ قسم کی اصطلاح میں نے کہیں نہیں دیکھی اور نہ سنی، یعنی ایک ہی حدیث کو تین تین مرتبہ ضعیف ضعیف یا موضوع موضوع موضوع کہنا کسی جذبات یا حالتِ غضب میں تو شاید ہوسکتا ہے، لیکن کسی سنجیدہ علمی گفتگو کے دوران کبھی نہیں، علاوہ ازیں اس آدمی نے کسی ایک حدیث کو موضوع بھی کہا ہے اور کبھی اسی حدیث کو ضعیف بھی، حدتو یہ ہے کہ اس نے نفس اسی حدیث کو منکر بھی کہہ چلا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اگر کوئی حدیث موضوع ہو تو اسے ضعیف کہنا کلی طور پر بے معنی ہے۔

اس نے کسی ایک حدیث کو بزعم خود موضوع کہہ کر اس پر عمل کرنے کو ناروا قرار دیا ہے، اس حوالے سے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت امام بخاری جیسے محدث جنہوں نے بخاری لکھنے سے پہلے چھ لاکھ

حدیثیں جمع کی تھیں، جن میں سے چار لاکھ صحیح اور دو لاکھ ضعیف، خود بخاری کو مسودہ سے مبیضہ کرنے سے پہلے تصحیح کرنے کے لئے اس زمانے کے ان کے چار اساتذۂ حدیث، امت کے چار عظیم محدثین (۱) اسحاق بن راہویہ (۲) علی ابن مدینی (۳) یحیی بن معین (۴) امام احمد بن حنبل کو دیا تھا، پھر بھی خود بخاری میں سینکڑوں احادیث ضعیف ہیں، لیکن رجال حدیث نے انہیں ضعیف ہونے کے باوجود حسن کا مرتبہ قرار دیا ہے، اسی طرح مسلم شریف، صحیح ابن حزیمہ اور صحیح ابن حبان کا حال ہے، ظاہر ہے کہ یہ ساری کتابیں صحیح کے نام پر لکھی گئی ہیں، جن میں سینکڑوں احادیث ضعیف ہیں، تو ضعیف احادیث ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ موضوع ہیں، ادھر کسی ایک حدیث کو کسی ایک محدث نے اپنے اصول وقواعد یا اپنی معلومات کی بنیاد پر موضوع یا ضعیف کہہ دیا تو اس کے برعکس اسی حدیث کو کسی اور ایک محدث نے صحیح بھی قرار دیا ہے، اسلام میں، علم حدیث کی تاریخ میں، احادیث کی ترتیب وتدوین وتسلسل میں جس کی سینکڑوں مثالیں اپنی جگہ موجود ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس آدمی (جس کے مراسلۂ صوتیہ آپ نے میرے پاس بھیجا ہے) کو ان علوم کا سرے سے خبر نہیں ہے۔

مزید برآں اس آدمی کے مطابق برصغیر میں حدیثیں پہنچیں اور نہ محدثین گزرے ہیں، بس حضرت سیدنا علی ابن ابی طالب سے مروی ایک ہی حدیث پہنچی ہے، جو اس کے زعم میں موضوع ہے، ہم اس حدیث کو لے کر اپنا کام چلایا کرتے ہیں، کاش اسے یہ معلوم ہوتا کہ اس امت میں حدیثیں جمع کرنے والے امام زہری، امام ابن خزم اور امام ربیع ابن سبیح جیسے اولین تین (ثالث ثلاث لیس لھم رابع) محدثین میں سے ایک کا تعلق برصغیر ہندوستان سے ہے، یعنی ربیع ابن سبیح متوفی ۱۶۰ھ کی وفات سرزمین سندھ (ہندوستان) میں ہوئی، چنانچہ ہمارا ہمیشہ یہ دعوی رہا ہے کہ اگر ان میں سے امام زہری پیدا نہ ہوتے تو احادیث نبویہ میں گوشت و پوشت نہیں ہوتے، اور احادیث کے چہرے داغ دار رہ جاتے، یاد رہے کہ مذکورہ تمام محدثین نے حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے احادیث نبویہ کو جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، ظاہر ہے کہ یہ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت، امام مالک بن انس، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، عبداللہ بن مبارک، سفیان ثوری، سفیان ابن عیینہ اور امام بخاری کی پیدائش سے کوئی ایک دیڑھ صدی پہلی والی بات ہے، غرض حدیث کو جمع کرنے والے اولین ان

مذکورہ تین محدثین میں سے ایک یعنی ربیع ابن سبیح کا تعلق برصغیر ہندوستان سے ہے، جنہوں نے جہاد اسلامی میں شرکت کی، غازی بنے، اور آخر کار جام شہادت پی کر اعلی مقام حاصل کیا، نہر سند کے ساحل پر مدفون ہیں رحمہ اللہ تعالی۔

بہرحال بات یہی ہے کہ احادیث نبویہ میں سے حظ کبیر ونصیب اوفر واکبر ہندوستان کو ملا، اس حوالے سے علامہ رشید رضا نے آج سے کوئی ستر اسی سال پہلے ہندوستان کے سفر سے واپس آ کر مجلہ ''المنار'' (یاد رہے کہ ان کے قلم سے مجلہ المنار کے علاوہ المنار نامی ایک تفسیر قرآن کریم بھی ہے) میں لکھا ہے کہ:

"لولا عناية اخواننا علماء الهند الى علم الحديث الشريف والسنة النبوية الشريفة لضاعت هذه العلوم الخ"

یاد رہے کہ علامہ رشید رضا امام محمد عبدہ کے شاگرد اور محمد عبدہ امام جمال الدین افغانی کے شاگرد ہیں، غالبا اسلام کے دور آخر میں ایک سو بیس سالوں کے اس دور میں اس طرح کا تسلسل بڑے بڑوں میں شاید ملتا ہو، جس طرح ابن تیمیہ، ابن القیم الجوزی اور ابن کثیر ہیں، اور جس طرح امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد ابن حسن الشیبانی ہیں، چنانچہ رشید رضا، علامہ محمد عبدہ اور جمال الدین افغانی کو دنیا امام کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

ادھر آپ جانتے ہیں کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد رشید مولانا محمد یوسف بنوری صاحبؒ (مولانا محمد تقی صاحب عثمانی ان کے شاگرد کے مرتبہ کا انسان ہیں) کو علامۃ الشام عبدالفتاح ابوغدہ نے '' نقاحۃ باکستان الادیب الاریب'' کا لقب دیا ہے، یہ میں نے آج سے کوئی چالیس پینتالیس سال پہلے علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی کی معروف ومشہور کتاب ''اعلاء السنن'' کے مقدمہ میں پڑھا ہے۔

مکرمی! بہرحال آپ کے اس مجہول الہویہ آدمی کے بیان (اگر اسے بیان کہنا صحیح ہو) کے مطابق ہمارے اس علاقے برصغیر میں اس ایک حدیث کے علاوہ کوئی اوراحایث نبویہ صلوات اللہ علیہ وسلامہ نہیں پہنچیں، اور جو حدیث پہنچی اسی سے ہم نصف شعبان کے کام چلاتے پھرتے ہیں، وہ بھی اس کی نام نہاد اصطلاح میں موضوع، موضوع، موضوع ہے، تو اس قسم کے واہیات، لخبطات، شہوانیات،

رغباتیات اور جاہلیات کی آپ نے اشاعت کی تو یقینا آپ گنہگار رہوں گے، پھر اسے مجھ جیسے آدمی کے پاس بھیجنے کی تکلیف کی تو آپ دوہرے گنہگار رہوں گے، چنانچہ قرآن حکیم کا نص ہے کہ "الا الذین تحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین آمنوا لهم عذاب الیم فی الدنیا والآخره" کے تحت امام احمد بن حنبل نے ایک روایت لائی ہے کہ "لاتوذو ا عباد اللّٰه ، ولا تطلبوا عوراتهم، فانه من طلب عورة اخيه المسلم طلب اللّٰه عورته حتى يفضحه فى بيته"۔

مکرمی! آپ کے اس آدمی کے مطابق ہندوستان کے جملہ علمائے کرام ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں، انہیں حدیثیں آتی نہیں ہیں، نہ جانے آپ کے یہ آدمی کس نوعیت کے راندۂ بارگاہ ہے، کہ جس نے اچانک کہاں سے ٹپک کر اسلامیان ہند کی تاریخ کو داغدار بنانے کی ناکام اور ناروا کوشش کی ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ نصف شعبان کے تمام مراسم ہندوانہ مراسم کی پیداوار اور مرہون منت ہیں، اب آپ بتایئے تو سہی کہ میں حسین احمد بن مفتی ابوالفضل نے بلد الحرام، سرزمین مقدس مکہ مکرمہ میں رہ کر نصف شعبان کا روزہ نہیں رکھا، ادھر آپ جانتے ہیں کہ ہماری قوم کی دینی، علمی، ثقافتی وسماجی تاریخ میں ''بکل تواضع النفس'' میرا کیا مقام ہے، پھر آپ میرے خاندانی احوال سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں، یہ جو اس مہبوط الحواس نے ہندوستانی علماء پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اس روزہ کو بہت ہی ضروری سمجھتے ہیں، اب بتایئے کہ اس آدمی کو یہ بات کہاں سے ملی ہے؟ دراصل بات یہی ہے کہ ہم اس روزے کو نہ ضروری سمجھتے اور نہ غیر ضروری سمجھتے ہیں، کسی نے رکھا تو اسے ثواب ملے گا، اور جس نے نہیں رکھا اسے نہیں ملے گا، وہ اس بحث کو چھیڑ کر اپنے آپ کو غیض وغضب کی آگ میں جلا کر بھسم کیوں کر رہا ہے؟ اسے کیا پریشانی ہے؟ وہ نہیں چاہتا ہے تو نہ رکھے اور چاہتا ہے تو رکھے، اس میں کیا خرابی ہے؟؟

علاوہ ازیں آپ کے اس مجہول الہویہ آدمی نے اپنے نام نہاد بیان میں جو پڑھیں، اس کے متعلق میں چیلنج کرتا ہوں کہ اس نے ایک بھی حدیث صحیح نہیں پڑھی، میرے عزیز! اللہ اور اس کے رسول کے دین کے حوالے سے دینی ودعوتی کام کرنے اور اس کی نشر واشاعت کرنے کے لئے خدا کو ایسے کم ظرف، بے عقل اور مہبوط الحواس ملا ہے کیا؟ شک نہیں ہے کہ ایسے آدمی دین ودعوت اسلام کے چہرۂ

زیبا پر ایک بدنما اور مکروہ بلا ہے، آیا دنیا سے علم دین ان جیسی مکروہ شکلوں کی وجہ سے ختم ہو جائے گا، الامان والحفیظ؟؟

کیا آپ کے اس آمی کو اتنا تک معلوم نہیں کہ کسی ایک چیز کو کسی ملک میں مکروہ کہا جاتا ہے تو کسی دوسرے ملک میں اسے مستحب، اس حوالے سے یاد رہے کہ ''لاتجتمع امتی علی ضلالۃ'' جس کے ذیل میں علامہ ابن تیمیہ کا کہنا ہے کہ امت مسلمہ مجموعی طور پر کسی ضلالت پر مجتمع نہیں ہوگی، اگر ہندوستان کے تمام علمائے کرام ایک حدیث ضعیف (اس مجہول الہویہ کے مطابق) پر عمل پیرا ہیں تو علامہ ابن تیمیہ کے قول کا کیا مطلب؟

جناب! آپ اگر مناسب سمجھتے ہیں تو اس نام نہاد داعی جو دعوت دین اسلام کے لئے نکلا ہے سے کہہ دیجئے کہ سب سے پہلے وہ قرآن سنۃ کے علوم سیکھے، اس کے بعد تبلیغ دین اسلام کے لئے نکلے، تاریخ اسلام کے رکن رکین، رکن اساسی، رکن من بناء الاسلام، ومن امارۃ الاسلام سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ: ''تفقھوا قبل ان تسودوا'' مفہوم یہ ہے کہ علم دین سیکھو تفقہ کی حد تک، الفاظ کی حد تک نہیں بلکہ معانی کی حد تک، معانی کی حد تک نہیں بلکہ عمق کی حد تک، عمق کی حد تک نہیں بلکہ تعمق کی حد تک، اس کے بعد لوگوں کے پاس جایا کرو، اس کے بعد ممبر ومحراب میں کھڑے ہو سکتے ہو، افسوس جو آدمی ایک حدیث بھی صحت کے ساتھ نہیں پڑھ سکتا ہو، وہ آج داعی کا لبادہ اڑھ رکھا ہے۔

ایک طرف آپ کے اس مجہول الہویہ نے بارہا کہہ چلا ہے کہ ''محدثین نے فرمایا'' کیا اسے اتنا تک معلوم نہیں ہے کہ دنیا میں سینکڑوں ہزاروں محدثین تھے، لیکن اس نے اپنے نام نہاد بیان میں ان میں سے کسی کا نام تک نہیں لیا، مانا کہ ایک حدیث کو کسی ایک محدث نے ضعیف کہا ہو، لیکن اس کا نام تو لینا ناگزیر ہے نا، پھر دوسری طرف طرفہ تماشا ہے کہ حدیث ضعیف (اس کے نزدیک) کو موضوع کارٹ لگا رکھا ہے، آیا موضوع کہنے کے بعد ضعیف کہنے کی بھی کوئی ضرورت ہے؟ موضوع ہونا ایک چیز ہے اور ضعیف ہونا دوسری چیز، موضوع کہنے کے بعد ضعیف کہنے کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں، علاوہ ازیں خود کسی حدیث کو موضوع کہنے پر بھی شدید اختلافات پائے جاتے ہیں، کسی ایک حدیث کو ایک محدث یا ناقد نے موضوع کہا تو دوسرے نے حسن کہا، پر عین اس حدیث کو تیسرے نے صحیح قرار دیا،

کیا آپ کے اس آدمی کے کانوں کان میں آکر تمام محدثین نے یک جا ہو کر بتایا ہے کہ: ''ارے او فلان ابن فلان راندۂ بارگاہ یزدان، دعوت اسلامیہ کے نام پر ممبر ومحراب پر کھڑے ہونے والا آدمی! ہم تمام محدثین عالم یک جا ہو کر بتاتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے'' استغفر اللہ العظیم، واعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، میں اس قسم کے آدمی کے جملہ شرور سے پناہ مانگنے کا طلب گار ہوں۔

آخر میں میں عبداللہ بن مبارک یا محمد بن سیرین علیہم الرحمۃ (مجھے تھوڑا شک سا ہو رہا ہے کہ آیا یہ ان میں سے کس کا قول ہے، کیوں کہ میں آج کل مسافرت کی زندگی میں اپنی ذاتی کتب خانے سے کسی قدر دور و مہجور ہوں، معلوم نہیں کہ آج کل میں کہاں اور میرے کتب خانے کہاں) غالبا عبداللہ ابن مبارک کا قول ہے کہ: ''لولا الاسناد لقال فی ھذا الدین و فی ھذا الاسلام او فی ھذا الاسلام من شاء ما شاء'' یعنی علوم اسناد کے ذریعے یا اسناد کی اہمیت کی وجہ سے اس دین کی حفاظت ہوتی ہے، سندیت کے بغیر، مصدریت کے بغیر اور مرجعیت کے بغیر جس کا من جو چاہا وہ علم کی بات کرے تو یہ ایک مستقل وباء وبلاء ہے، ایک مستقل غضب، مستقل ابتلاء اور مستقل محن ہے، ویسے ہمارے سماج ومعاشرے میں کہیں سے ایک مفتی نما آدمی ٹپک جاتا ہے، نہ سائل کا کوئی پتہ ہوتا ہے اور نہ مجیب کا کوئی ٹھکانہ، العیاذ باللہ۔

سنئے! اس کے برعکس یہاں میں آپ کا نام لے رہا ہوں جناب محمد یونس صاحب ارکانی! لیکن افسوس ہے کہ آپ اس نوعیت کی چیزیں میرے پاس ہمیشہ بھیجتے رہتے ہیں، کبھی ضروری سمجھ کر جواب دیتا ہوں تو کبھی کبھار غیر ضروری مان کر جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کرتا ہوں، آج آپ کی صورت میں ایک معلوم مقام سے سوال آیا تو جواب دینا ضروری سمجھا ہوں۔

میرا نام آپ سب جانتے ہیں کہ حسین احمد بن المفتی ابوالفضل ہے، بلغت من العمر فوق خمس ستین سنۃ الحمد للہ قضینا بتوفیق اللہ رب العالمین عمرنا او اعمارنافی خدمۃ الاسلام والعلم والدین والدعوۃ الاسلامیہ، کے ہوتے ہوئے بھی لسنا علی دین، لسنا علی علم و دعوۃ، یعنی میرا کوئی دعوی تو نہیں ہے لیکن ظاہر ہے کہ میں علم دین اور دعوت اسلامیہ کی خدمات انجام دیتے دیتے عمر کے اس مرحلہ میں

پہنچا ہوں، جو باتیں میں نے کہی وہ فی البدیہہ برجستہ کہہ کے آیا ہوں، اس میں بحث ومباحثہ کے لئے نہیں، آپ کے اس آمی کی اس طرح کی باتوں کے حوالے سے "ما انزل اللّٰہ بھا من سلطان" بس اتنی سی بات کہنی ہے کہ اس کی باتیں نہ دین ہیں اور نہ دعوت دین، نہ علم ہیں اور نہ اسلام۔

آپ خدارا اس آمی کو بتا دیجئے کہ پہلے دین سیکھے پھر دوسروں کو سکھایا کرے، پہلے علم دین پڑھے پھر دوسروں کو پڑھایا کرے، دین کی باتیں حاصل کرے پھر تبلیغ دین کے کاموں میں لگ جائے، تاہم دعوت اسلام سیکھے **من مصدر الدین والدعاة الاسلامیة، من مصدر الدعوة و الشریعة الاسلامیه والشرعیین، من رجال خیر القرون "خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم" من قدر قلیل من العلم من اصحاب الرسول علیه الصلاة والسلام، و من اصحاب اصحاب الرسول علیه السلام، و اصحاب اصحاب اصحاب الرسول علیه السلام،** یعنی اصحاب رسول، تابعین واتباع التابعین سے مباشرة، اس کے بعد خدمتِ دین ودعوت کے میدان پر اترنے کی کوشش کیا کرے، اس سے پہلے نہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قلم

ن۔ والقلم وما یسطرون وانت بنعمة ربک بمجنون۔

انسانی تاریخ میں قافلۂ حیات کی تعمیر جن چیزوں سے ہوئی ہے، یا بڑے پیمانے پر ہوئی ہے، ان میں غالباً قلم کا نام سرفہرست آتا ہے، اس کی ہمہ گیر خدمات پر روشنی ڈالنا، یا گفتگو کرنا شاید اتنا آسان کام ہو، جتنا فکر وتصور کے مراحل سے گزرنا، آغاز آفرینش سے آج تک جس نشیب وفراز سے کارواں گزرا ہے، اس کا اجمال وتفصیل اگر کسی قلم کی بات نہ ہوتی تو وہ کس ذریعے سے آپ اور ہم تک پہنچی ہوتی ؟ لکھنے اور ریکارڈ کرنے کا طریقہ جو عہد قدیم سے چلا آتا ہے، اس میں قلم ہی کا کام تھا کہ پچھلوں کے حالات اگلوں تک پہنچتے رہے، ظاہر ہے کہ آدم زادوں کا ہر پچھلا قدم اگلوں کے لئے عبرت کا مقام ہے، جو اخذ نتائج اور سنور سنبھل کر چلنے کی آگہی دیتا ہے۔ یوں انسانی تمدن کو تدریجاً روبہ ترقی ہونے کا سروسامان ہوا، یہاں تک کہ اس کا قافلہ یافت ودریافت کی نئی دنیا تک نکل آیا، جس میں آپ اپنی آرام دہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے دنیا بھر کی ہر چیز کا مطالعہ کر پاتے ہیں، کہ سٹلائٹ ایجاد ہوگیا، کمپیوٹر سائنس ہاتھوں ہاتھ آگیا، مزید اس پر انٹرنیٹ کے اضافے نے سونے پر سہاگے کا کام کر دیا ہے۔

آپ عہد عتیق کی کہانیاں پڑھتے ہیں تو قلم سے، عاد وثمود کی تاریخ پڑھتے ہیں تو قلم سے، بابل و مدائن کی داستانیں ہیں تو قلم سے، نسل انسانی کو اپنے اکابر وعظماء اور ان کی فتح وشکست کی بات ہے تو قلم سے، کہیں ظلم وعدوان کی بات ہے یا انسانی درندوں اور سفاکوں کا ستم ہے تو قلم سے، انسانوں کے

نوٹ: یاد رہے کہ جناب مولانا حسین احمد ارکانی کے مندرجہ تمام مقالات، رسائل اور تحریروں میں بے شمار علمی، فکری اور لسانی فروگزاشتیں تھیں، جنہیں اصلاح کئے بغیر من وعن درج کر دینا ان کی شانِ فضیلت کے خلاف سمجھا گیا، اس لئے یہاں اور بعد میں آنے والے مندرجہ ان کے تمام مقالات اور رسائل کی مقدور بھر اصلاح کر دی گئی ہیں، امید ہے کہ قارئین وناظرین کرام برا نہ مانیں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں مزید توفیق سے نوازے۔

عمرانی اور ترقیاتی منصوبوں کی کہانی ہے تو قلم سے، کوئی قلم کسی بڑے کی زندگی لکھ کر خود کو بڑا بنا دیتا ہے، یا کسی شوکت وشان کی تاریخ پر قلم اٹھا کر رہتی نسل کے لئے صاحب شوکت بن جاتا ہے۔ یہ وہ قلم ہے کہ جس نے حضرت انسان کو بہت کچھ دیا ہے، اس کے دامن کمال کو گونا گوں نعمتوں سے بھر دیا ہے، اگر آپ نے اسے سلسلۂ کائنات کا سرالوصال کہہ دیا تو کچھ بگاڑا نہیں، قافلۂ حیات کی روح رواں مان لیا تو کچھ برا نہیں کیا۔

آپ قلم ہی کے ذریعے سوسال ہزار سال کے گئے گزرے کتنوں کے نام سنتے اور پڑھتے ہیں، آپ کے کان کی کتنی ان سنی باتیں اور نگاہوں کے کتنے ان دیکھے واقعات وحقائق ہیں، مگر قلم ہی نے وہ سارے کام انجام دیئے کہ قلمبند کر کے اس کے سامنے پیش کر دیئے ہیں، قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں، حکمرانوں اور تاجداروں کے سر بفلک محلوں اور ان کے بلند وبالا مناروں کی بات، خاندانوں کے بننے بگڑنے کے قصے، قبائل کے ابھرنے اور مٹنے کے واقعات، مظلوموں کی آہ و فغاں اور درد وغم، ظالموں کی تیغ وسنان کی چمک دمک، اور ان کے گدھے گھوڑوں کے چیخنے اور دوڑنے کی تصاویر، اور اس بادصرصر اور طوفانوں کی بات کہ جس نے قبائل کو اور ان کے شاندار ماضی کو چشم زدن میں ویران کر دیا تھا، پھر اس بادصبا کی نزاکت جس کے خوش گوار جھونکوں نے ٹوٹی ہوئی امیدوں اور بگڑی ہوئی زندگیوں پر شبنم کے قطرے برسائے، اور ساز حیات میں آب وتاب کا کام کر دیا، غرض قلم ہی نے دارا وسکندر کی ساری داستانیں مرتب کر کے آپ کے سامنے رکھ دی ہیں، جنہیں آپ بے ساختہ پڑھنے لگے، جنہیں سننا تھا سننا شروع کر دیا، اور دیکھنے کی چیز تھی تو اپنے چہرے کی آنکھوں سے نظارہ کرنے لگے۔

صرف دیکھنے اور سننے تک کہاں محدود؟ بلکہ آپ ایک قدم اور آگے بڑھے، آپ نے خود لینے والی باتوں کو لے لے کر، چھوڑنے والی چیزوں کو چھوڑ چھوڑ کر وہ کام انجام دیا کہ جس کی وجہ سے کتاب تاریخ کے اوراق پر آپ کا نام بھی درج ہوگیا، آپ خدارا مجھے بتا دیجئے کہ یہ سارا کارخانہ کس ناموس اکبر کے طفیل سے چل رہا ہے، یقینا آپ کہیں گے کہ یہ صرف اس شہنشاہِ اعظم کی بوقلمونی سے چل رہا ہے، جس کا نام نامی قلم ہے، بس کارخانۂ ہستی کے ہر گوشہ پر اسی کا خاموش راج چل رہا ہے:

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم
قلم کش را بدولت می رسانم

جس طرح قلم کی خدمات بڑی وسیع اور زندگی کے تمام مہمات پر محیط ہیں، اسی طرح اس کے دامن کا پھیلاؤ بھی تاریخ کے پورے تسلسل وامتداد پر حاوی ہے، یہ جہاں ترحیب وترغیب اور اعتزاز کا کام کرتا ہے، ٹھیک وہاں نازک، دشوار گزار اور خطرناک منزل کی نشاندہی بھی کرتا ہے، اس کا رول اگر ایجابی اور تعمیری ہو تو وہ انسانیت کے لئے بڑا حیرت انگیز کام انجام دے سکتا ہے، اسی طرح اس نے اگر سلبی یا تخریبی رخ اپنایا تو وہ بگاڑ اور تباہی کے میدان کا بھی بڑا شہ سوار بن سکتا ہے۔

اس کی فریب کاری اور تماشہ گری ملاحظہ کیجئے! کہ اس نے کتنے سفاکوں اور شریروں کو خیر وفلاح کا تپلی بنا کر رکھ دیا، جب کہ دوسری طرف لاتعداد قدسیوں اور سعید روحوں کے صفحۂ ناز کو داغ دار کر دیا ہے، قلم جیسے اس جانباز سپہ سالار نے کارواں کی رہنمائی کے نام پر کتنوں کو ظلمتوں اور ہلاکتوں کی بھیانک صورت دکھائی تو اس ہی نے زخم سے چور اور جاں بلب قافلۂ حیات کو امنگوں اور کرنوں والی تابناک زندگی بخشی، کتنی قومیں ہیں تاریخ کی جن کی ڈوبتی کشتی کو کنارے پر لگایا، اور کتنوں کو موج دریا کے طلاطم میں غرق کر دیا، اور اسے پھر سنبھلنا نصیب نہ ہوا، دنیا کی دوسری نعمتوں کی طرح اس کی بھی یہی طبیعت ہے کہ اس کے استعمال پر خیر وفلاح کا مدار ہے، دنیا میں چیز کتنی اچھی کیوں نہ ہو مگر اسے استعمال کرنے کا ڈھنگ اور استعمال کرنے والوں کے ارادے کی خرابی کی وجہ سے وہ بدشکل اور بھونڈی ہو جاتی ہے، یوں قلم جیسی نعمت کا بھی وہی حال اور وہی طبیعت ہے۔

ہاں یہ بڑی تیز اور طاقت ور تلوار ہے، اسے کام میں لانے والا غلط یا منزل ناشناس مسافر ہو تو اس کا ضرب لگ سکتا اور زخم تو ہو جاتا ہے مگر اس سے کوئی بھی ایجابی اور تعمیری مقصد پورا نہیں ہو سکتا، کسی کو زخم سے چور تو کیا جا سکتا ہے، مگر اس سے کوئی نمایاں ایجابی کام انجام نہیں پا سکتا، بلکہ وہی بات ہو سکتی ہے، جسے آٹھویں صدی ہجری کے مشہور ومعروف عرب عالم، مفکر وفلسفی، سیاست دان اور اجتماعیات کے امام ابن خلدون نے صدیوں پہلے کہہ گیا ہے کہ ''نا اہل قلم کار کی مثال اس مستی زدہ اوباش جیسی ہے، جس کے ہاتھ پر تیغ براں ہے، اور اس سے اپنے عزیزوں کا سر قلم کرتا جاتا ہے''۔

تاریخ کے مختلف ادوار اور نشیب وفراز کی ان تباہ کاریوں کی مثالیں دے کر جو قلم سے ہوئی ہیں، آپ کی گراں باری اور سمع خراشی نہیں چاہتا ہوں، کارل مارکس کی ''کیپٹل'' (CAPITAL) اور لینن کی ''بیگیننگ'' (A GREAD BEGINNING) نے صدیوں سے آباد کلیساؤں پر جو طوفان مچایا اسے کون نہیں جانتا؟ کون نہیں جانتا کہ انہوں نے روح و مادے میں، پھر دنیا وآخرت کے مابین کتنا بڑا معرکہ برپا کردیا ہے؟ جس کے نتیجے میں آج کی مسیحی دنیا مختلف کیمپوں اور متنازع بلاکوں میں بٹ گئی ہے، اور کہیں وائٹ ہاؤس کی غلامی ہے، کہیں کریملین کی پرستش، کوئی نیٹو (NATO) کی زنجیر میں بند ہے اور کوئی وارسو (WARSAW) کے دام بلا میں گرفتار۔

بات بڑی امانت کی بھی ہے اور قدر شناسی اور عاقبت اندیشی کی بھی، بہر حال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خود خالق الکون نے قلم کے نام پر قسم اٹھایا ہے، اور ن۔ والقلم کہا ہے، اور اسے اپنے خاص پیرایے میں نعمتِ عظیم سے یاد کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ ظلمتوں میں بھٹکنے والا انسان اپنے پرانے کوراپن کی وجہ سے رب کی دوسری نعمتوں کی طرح اس ہمہ گیر نعمت کو بھی غفلت کی نگاہ سے دیکھا اور نا قدر شناسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے قلم چھونا تو ہوا، لکھنے کی طبیعت تو پیدا ہوگئی، مگر اس کے قلم کا چھونا یا اس کے لکھنے کی طبیعت نے انسانوں کی خدمت تو کجا اپنی ذات پات اور اپنی سیاست زندگی کا بھی کوئی کام نہ کرسکا، اس نے خدمت وتعمیر کے نام پر بربادی اور تباہ کاری کی ہے، اس سے ایسا منحوس کردار ادا ہوگیا ہے جو نہ قومی مصلحت کا حامی رہا ہے اور نہ اپنی ذات ومعاشرہ کے مفاد کا حامی۔

تلاوت کلام پاک کے لئے بھی ''اعوذ باللہ'' پڑھنا ہوتا ہے، تاکہ شیطان ملعون دور ہوجائے، آپ کے ارادے اور کام کرنے کے جذبے وولولے جتنے ہی نیک کیوں نہ ہو، کام کو شروع کرنے سے پہلے آپ کو شیطان کے شرور سے پناہ چاہنا پڑتا ہے، تاکہ اتنے پاک ارادے اور نیک جذبے وولولے کے ہوتے ہوئے فکر ونظر کا قافلہ کہیں بھٹک نہ جائے اور خود اپنی کلہاڑی کے وار سے آپ کی بربادی کا سروسامان نہ جائے۔

ارسطو کو شاید یہ وہم بھی ہو چلا ہوگا کہ اس کی اپنی قلمی کاوش ''جمہوریت'' (THE REPUBLIC) کی تصنیف کی شکل میں موت کا پیغام بھی چھپا ہوا تھا، فن سیرت ومغازی کے امام محمد بن اسحاق کو کیا خبر

تھی کہ ان کی تاریخ دانی یا تاریخ نویسی کے قلمدان میں ''دجال'' کا لقب پانے والا اور طیبہ کی سرزمین سے نکالے جانے کا حکم بھی پنہاں تھا، رشدی کو کب معلوم تھا کہ آیات شیطانیہ (THESATANIC VER SES) لکھ کر خود وہ عزیزانِ عزازیل بننے جارہا تھا، نسرین بی بی کا شوق بھی دیکھئے کہ آتھار (مصنفہ) بننے کے شوق میں ''حیاء'' لکھ دی اور بے حیائی کا سارا راز کھول کر رکھ دیا، اور جلاوطنی و خطرات کی زندگی اس کی مقدر بن گئی۔

دوسری طرف ان خوش نصیب اہل قلم کو بھی دیکھیں! جو اپنی قومی تاریخ اور اس کے نشیب وفراز کی نزاکت اور اپنے اکابر ومشاہیر پر لکھ کر ابنائے قوم وملت کے دائمی سپاس کے اہل بن چکے ہیں، جو اپنی ملی زندگی میں کارہائے نمایاں دکھاتے اور ادا کرتے ہوئے رہتی دنیا کے لئے فخر وناز کے منارے بنے ہوئے ہیں۔

اب میں دنیا کی عظیم اور طویل تاریخ سے نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کی زندگی سے، اور اس میں بھی قرونِ اولی کو چھوڑ کر بس دور متوسط و دور متأخر سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں، جن کی فہرست بھی کم طولانی نہیں، آپ سینکڑوں کے نام لیں گے تو ہزاروں کے نام رہ جائیں گے، جن کے مبارک کارناموں اور کاوشوں پر پوری امت کو فخر وناز ہے، اور آنے والی نسلوں کے لئے ان میں درخشاں منزل کی نشانیاں ہیں۔

حافظ ذہبی کی ''سیر الاعلام''، تذکرۃ الحفاظ'' اور ''میزان الاعتدال''، ابن حجر کی ''الاصابۃ''، تہذیب التہذیب'' اور ''الدرر الکامنۃ'' عرب عجم نہیں بلکہ پوری امت کے لئے فخر وناز کے گلدستے ہیں، زرکلی کی ''الاعلام''، لکھنوی کی ''النزہۃ الخواطر''، سرسید کی ''آثار الصنادید''، بلگرامی کی ''ماثر الکرام''، عبدالحق صاحب دہلوی کی ''اخبار الاخیار''، شیخ اکرام صاحب کا ''سلسلۂ کوثر''، علی میاں ندوی کی ''تاریخ دعوت وعزیمت''، عبدالقادر بدایونی کی ''منتخب التواریخ''، آزاد ابوالکلام کا ''تذکرہ''، شبلی کی ''ہیروز آف اسلام'' یہ اور ان جیسے سینکڑوں اہل قلم کی قلمی کاوشیں ہیں جن میں مدح وستائش کی باتیں بھی ہیں، جرح وقدح کا ستم بھی، تصویر حقائق بھی ہے، فکر ونظر کی فروگزاشتیں بھی، مگر مجموعی طور پر قوم اور قوم کے دانشور قافلہ کو ان کا لوہا ماننا پڑا، اور ان کی خدمات جلیلہ پر ان کی داد دینی پڑی۔

آج ہماری تاریخ نویسی کی شکل میں خدمات ملیہ کا حال بھی دیکھئے! ایسی خدمات کہ جنہیں پڑھ سن کر کسی کو راحت و اطمینان کا، ایمان و اسلام کا، سلامت فکر و دماغ کا کہیں بھی سراغ نہیں ملتا، ایسی تنقیدی پرواز کہ جس کے کسی بھی کردار کو اخلاق تاب نہیں لاسکتا، ایسا قلمی گھوڑا جس کی تیز گامی کے آگے اور تو اور برادری کا کوئی بھی پہلوان یا اپنے افراد قبیلہ کا کوئی بھی شہ سوار اپنا جمال و کمال نہیں دکھا سکتا، ایسی تیز و تند نگاہ کہ جس کے شیوۂ غرور و پندار کو کوئی دل فریب اور نظر کش حسن و جمال، دماغ پرور اخلاق و اطوار کبھی بھی خیرہ نہ کرپاتا ہو۔

ایسا سخت گیر صاحب قلم کہ جس کی شوکت تحریر کے طوفان کو سب کچھ اڑا لینا، تہ و بالا اور برباد کرنا تو آتا ہے مگر ہلکا سا تنکا پر بھی اس کی نظر کرم نہیں پڑتی، جو قابل رحم ہو، بال و پر ٹوٹا ہوا ایک پرند بھی اسے نظر نہیں آتا جو اسے دعوت لطف و کرم دیتا ہو، ایسا احسان شناس اور وفا شعار مسلم نوجوان کہ جس نے ملت کے سوز و ساز کے حوالے سے اپنی فکر و نظر، زبان و قلم اور عقل و دماغ کو فولاد سے بھی تیز سے تیز تر کیا ہے، وہ دنیا میں جس طرف بھی دیکھتا ہے اسے ایک وحشت کدہ ہی نظر آتا، اسے انسانوں کی شکل میں ہر کہیں درندے نظر آتے ہیں، ہر کجا مسلم و مومن کے لبادے میں بے شرع بے ایمانوں کا ریوڑ دکھائے دیتا ہے، تو یکا یک اس کے طبع ایمان پرور میں جنبش آجاتی اور اس کی زبان و قلم طوفان بن کر امنڈ آتا ہے، اور ایسی یورشیں شروع ہوجاتیں کہ جس کے نتیجے میں گرد و پیش کی ساری چیزیں، ہر افراد آدم، اور ہر قومی و اجتماعی ادارے تنکے کی طرح بہہ جاتے ہیں، جس کے گہرے زخم سے آج قوم کے ہر وہ فرد چور چور ہے کہ جس نے کبھی بھولے سے بھی ان مظلوموں کی دادرسی کا کام کیا ہو، ملت کی عزت و ناموس کا رونا رویا ہو، تاریخ وطن کے شاندار ماضی کا گن گایا ہو، یا قومی سیاست کی کسی بھی شاخ سے لو لگا کر کوئی بھی قدم اٹھایا ہو۔ غرض اس جواں ہمت اہل قلم نے کسی بھی وقت شاید قوم و ملت کی خدمات کو اپنا فریضہ سمجھا ہو، اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی فکر کی ہو۔

ادب و ثقافت کی تاریخ میں نقد کا کام بڑا نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے، جس پر قدم رکھ کر ایک انسان فکر و فن کی دنیا کا فاتح بھی بن سکتا ہے اور بے تاج بادشاہ بھی، جب کہ اس سنگلاخ میدان میں ذرا سی لغزش سے اس کا قدم اتنا ڈگمگا جاتا ہے کہ اسے پھر سنبھلنا مشکل ہوجاتا ہے، یہ کام جہاں شوق و اعزاز اور طبع

آزمائی کا ہے ٹھیک وہاں ہشیار رہنے، نگاہ روبرو کہنے اور چن چن کر قدم رکھنے کا بھی ہے، یہ جہاں مختلف مراحل کے طے کرنے کے بعد بلند و بالا روشن منزل کے پانے کا ہے، ٹھیک وہاں اس کی معمولی سی فروگزاشت سے وہ جہان دگر کا مسافر ہوجاتا ہے، یوں اس کے ابھرنے کی تمام امنگیں چشم زدن میں تہ خاک ہوجاتی ہیں۔

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات

بات نقد کی چل رہی تھی، اس حوالے سے ایک قدم اور آگے بڑھیں! اسلام نے نقد کو اتنا آگے بڑھایا کہ اسے مستقل فن بنادیا ہے، اس میں کام کرنے والوں کا بڑا اعزاز رہا ہے، کہ دین کی بات ہے، اسلام اور دین کی امانت والی چیز ہے، اسلام کے رخ زیبا کو گرد و غبار سے صاف رکھنے کا نازک کام ہے، کہیں یہ شخصی دباؤ اور جماعتی کبریاء کے آگے دب نہ جانا چاہئے۔ امام زہری کہا کرتے تھے کہ "**ان هذا العلم لا يدرسه الا ذكور من الرجال**" اس فن کا کام مردوں میں خاص مردانے والے کا ہوتا ہے، تاریخ اسلام اس فن کے اہل کار کو "ائمۃ المسلمین" کے لقب سے یاد کرتی ہے، علی بن المدینی، یحیی بن معین اور احمد بن حنبل اس وادیٔ ایمن کے بڑے بڑے شہ سوار ہیں، جن کا کام رواۃ حدیث کا نقد و نقاش تھا، برے کو برا، بھلے کو بھلا، بڑے کو بڑا اور چھوٹے کو چھوٹا کہنے اور کہلوانے کا کام تھا، بس یہی معنی تھا نقد کا، اور اسی کا نام ہے فن ہے، یہ حضرات اس فن میں کمال کے درجہ پر پہنچ کر امام کے لقب پائے تھے، آج بھی اگر کسی جواں ہمت نے اپنا یہ راستہ چن لیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، نقد کرے، نقاش کرے، تبصرہ نگاری کا کمال دکھائے۔

مگر ہلکی سی ایک شرط بھی ہے کہ وہ یہ کام بڑی بصیرت اور بڑی مہارت سے کرے، ربانی توفیق اور مخلصانہ جذبات سے کرے، کبھی اس کے اندر ہوائے نفسی، غفلت اور تساہل کا شائبہ بھی نہ آنے پائے، مبادا! اگر ایسا نہ ہوسکا اور اس کے اندر معرفت اور بصیرت کی کمی ہے، شرور نفس کی رنگا رنگی ہے، یا بغض و عداوت کے شعلے اور شرارے ہیں، تو وہ فن کے امام ہونا تو دور کی بات بلکہ فن کے دوسرے رجال کے نقد سے اس کا خانہ خراب ہوجائے گا، اور اس کی ناقدانہ کاوشیں مستند اور مقبول ہونے کے بجائے اس

کے قتل وخون یا خاتمہ بالخیر کا ''سرنامہ'' بھی ہوسکتی ہیں:

مجھے ڈر ہے کہ دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے ترے جینے سے

افسوس ہے کہ آج کل لوگوں کی فکری اوباشی اور ہوا پرستی کی وجہ سے اس امانت کا یہی حال ہے کہ ہر آدمی اپنا گھوڑا اس میدان میں دوڑانے کی کوشش کرنے لگا، باتوں باتوں سے بگڑ کر تنقید وتبصرے کا نیا دوڑ شروع کرنے لگا، اس کو دنیا کی ہر چیز بری لگتی ہے، اسے ہر مقام حسن پر بدنما داغ نظر آتا ہے، وہ ہر مخلصانہ اقدام کو مکر وفریب کا جال سمجھ لیتا ہے، ہر ربانی امنگ کو وساوس شیطانی کہہ کر ٹھکرانے کی عادت ہوگئی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس نئے دور میں ہماری برادری میں سے کچھ اہل قلم ایسے نکلے ہیں کہ جنہیں علم وفن اور فکر ونظر سے شاید دور دور کا بھی رشتہ ہو، مگر ان پر قومی اکابرین ومشاہیر کے علاوہ ہماری قومی تاریخ کے ماضی قریب پر لکھنے کا شوق کہیں سے سوار ہوگیا ہے، اس دھب کا شوق کہ جنون کی حد تک پہنچا ہوا ہے، مگر شوق ہونے کے اسباب اسے پورے کرنے کا ادب وطریقہ اور گرد وپیش سے باخبر رہنے کی بات تک بھول گئے ہیں، حتی کہ یہ بھی بھول گئے کہ لکھنے کے لئے کچھ پڑھ لینا بھی ہوتا ہے، اب یہاں اس ضمن میں مرحوم مولانا سید سلیمان ندوی کی ایک بات یاد آگئی ہے کہ آپ نے کیا خوب فرمایا کہ ''سو صفحہ پڑھو ایک صفحہ کہو، ہزار صفحہ پڑھو اور ایک صفحہ لکھو'' اللہ تعالی مرحوم کو خلد بریں میں جگہ دے، بڑے کام کی چیز بتادی۔

کہتے ہیں کہ لکھنے کے لئے فکر ونظر کی وسعت، دل ودماغ کی صفائی وادراک، قلم وزبان کی شستگی اور سنجیدگی کی بات یادرکھنی چاہئے، پھر جس موضوع پر آپ لکھتے ہیں اس کی نزاکت اور حدود اربعہ سے واقفیت بھی ضروری امر ہے، اور یہ بھی ضروری چیز ہے کہ آپ کے لکھنے کے بعد اس موضوع سخن کا کیا حشر ہوتا ہے؟ اور یہ بھی دیکھنا ہے کہ آپ اپنی اس کاوش کی راہ سے آیا مقصد سے قریب ہورہے ہیں یا اس سے دور نکل رہے ہیں، اور آپ کی نظر اس بات پر بھی رہے کہ اپنی تحقیق وتصنیف کے نیلا آسمان پر چاند لگتا ہے یا چار چاند؟

اللہ اکبر اور چشم بددور! کہ ایسا طرز تحریر اور انداز بیان، اور ایسا روح پرور اسلوب نگارش کہ جس سے

قومی زندگی اور اس کی عظمت رفتہ پر روشنی تو پڑ جاتی ہے، مگر اس سے مستقبل روشن نہیں ہوتا، تاریخ نویسی کا کام تو ہوگیا ہے، مگر تاریخ ملت کا سراغ نہیں ملتا، نئی نسل کے لئے تفریح طبع کا سامان تو ہوا ہے مگر اس کے درد دل کا مداوا نہیں ہوا۔

رب سے دعا ہے کہ ان ہونہار اہل قلم کا شوق دل ہی دل میں مٹ جائے، یا انہیں اسے پورا کرنے کا طریقہ وسلیقہ آجائے، ویسے پھر کسی کو حرف شکایت زبان پہ لانے کا حق نہیں ہوگا، اور اس جاں بلب ملت کے قدم پر کچھ حسین پیش کش بھی ہوگی، اور یوں ان قدسیوں کو کہ جن کے خون جگر سے آپ کی سرزمین لالہ زار بنی ہوئی ہے، ترسنے اور تڑپنے کی جگہ سکون وقرار کا تحفہ ملے، علاوہ ازیں ہمیں آپ کو اپنے قابل صد تحسین کارناموں کے ساتھ سینے سے لگانے کا زرین موقع ہوگا:

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

آخر میں کارساز عالم رحیم وکریم پروردگار سے سجدہ ریز دعا کرتا ہوں کہ اس گم نام اور خزاں دیدہ چمن میں ایسے گل ولالہ کھلے، جن کی مہک سے فضا معطر ہوجائے، اور صدیوں کی اجڑی دیار میں نسیم صبا کی بہاریں آجائیں، اور ملت مرحوم کے قد مجروح کو جوانی اور توانائی ملے۔

مت سہل ہمیں جانو! پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے ذرے سے انسان نکلتے ہیں۔

بس اس رب کی کرم فرمائی اور بندہ نوازی ہے کہ آج کے اس ظلمت کدے میں بھی صدائے حق کی گنگناہٹ رہ گئی ہے، اور چراغ راہ کا ٹمٹماتا ابھی باقی ہے، اور اس کھنڈر بستی کی گلیوں سے کارواں کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں، اور اس ویران کشت زار سے نخل تازہ کی امیدیں بندھی ہوئی ہیں:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔

حسین احمد ابوالفضل

۱۶/ فروری /۲۰۰۰ء۔ چاٹگام، بنگلادیش۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چمن اور اس کی بہار

(تبے گانگ ماسرا گانگ، ثاثمی گانگ مامینبا گانگ)

بچپن کی ایک سنہری یادگار سے شروع کرتا ہوں، جسے کسی غیر مسلم استاد سے پرائمری کے ایام میں سنا تھا، بات بڑی دل گیر تھی، زندگی بھر کام کرتی رہی، کہتا ہے کہ شاگرد اگر فاضل ہے تو دلیل ہے کہ استاد بھی صاحب فضل وکمال ہے، اولاد اگر شریف ہیں تو دلیل ہے کہ ماں باپ بھی نیک اور شریف ہیں۔ زبان کوئی برمی تھی، چوں کہ ہم مرحوم ارکان سے تعلق رکھتے ہیں، جس پر (افسوس ہے کہ) آج برمنوں کا راج ہے، زبان وادب انہیں کا چلتا ہے۔

کسی ادارہ کی کامیابی کے لئے اس کے کامیاب فضلاء ہی سب سے زیادہ روشن دلیل ہیں، اسی طرح کسی چمن کی جانفزائی اور دلربائی کے لئے اس کی کلیوں کا کھلنا، پھولوں کا ہنسنا، خوشبو کا مہکنا، اس کی فضا کی صفائی اور نکھار، پھر اس کے محل وقوع کی خوش نمائی اور اس کی گونا گونی بڑے شاندار اور جاندار قرینے ہیں۔

درس گاہِ ابراہیمی کی لن ترانی اس میں ہے کہ یعقوب، اسماعیل اور اسحاق سے گزر کر سیدنا محمد رسول اللہ تک جیسے رہبرانِ انسانیت اس کے دامن سے وابستہ ہیں، جو بلا چوں و چرا اس چمنستان توحید کے گل لالہ اور بہار جہاں پرور ہیں: {قل ملة ابراهيم حنيفا وهو سماكم المسلمين}

مدرسۂ صفہ یا دانش کدۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو ناز اس بات پر ہے کہ اس میں پلنے والے ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر اور ابوموسی رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین تھے، جن کے کردارِ بلند اور جمالِ جہاں آراء سے ترستی انسانیت کو دائمی زندگی ملی، جن کی حکمت وبصیرت، جانفروشی اور جان نوازی سے عرب کے ان گلہ بانوں کو عظمت و کبریائے شاہی ملی، ابھی کل جو اخلاقی قدروں اور شرافت انسانی کے دشمن تھے، دیکھتے ہی دیکھتے شرافت وانسانیت کی کسوٹی بن گئے، کل جو اپنے قبیلے میں بیٹھ کر باہر کی دنیا سے ڈرتے تھے، چشم زدن میں ان کے ستارۂ اقبال کو اتنا چمکنا آیا کہ ان کی آہٹِ قدم سے دنیا ڈرنے لگی،

اور ربع مسکون کے ایک عظیم حصے کو ان کی جنبشِ لب کا انتظار ہونے لگا۔

مدرسۂ نظامیہ بغداد کی بات تاریخ میں آتی ہے کہ اس میں پڑھنے والا غزالی جیسا نادرۂ وقت تھا، اور اس میں پڑھانے والا بھی آسمان علم ومعارف کا وہ سورج تھا جسے امام الحرمین جوینی کہلایا جاتا تھا، مدرسہ رحیمیہ دہلی نے شاہ ولی اللہ کو جنم دیا تو بس اس کا فریضہ انجام پایا، نافلہ کی بات تاریخ میں دیکھی جاسکتی ہے، بالآخر مدرسۂ دیوبند کی فائز المرامی کا حال دیکھئے! تو محمود الحسن کی ذات ہی بس، جن سے تقریبا مقصد پورا ہوگیا تھا، اشرف علی، انور شاہ، حسین احمد، الیاس وزکریا ''واسحاق نافلة'' کے پورے مصداق تھے، ان میں سے ایک ایک نام کو ملت وقوم کے الگ الگ میدان کی بادشاہی راس آئی، ان میں سے بعضوں کا ستارۂ کمال بہت ہی اجالا نظر آتا ہے، ان میں سے ہر ایک نے معمورے کی پوری آبادی کو فیض یاب کیا ہے، اشرف علیؒ ایک جہاں کا نام تھے، انور شاہؒ کو کوئی پانچ سو سال کی فترت کے بعد امت کی ایک ماں نے جنم دیا، حسین احمد پوری امت کی واحد سپوت نہیں اور کیا تھے؟ الیاسؒ اور زکریاؒ کی پوچھیں تو بلا جھجک کہہ دیتا ہوں کہ ان چراغانِ طور سینا سے آج کی دنیا کا کوئی بھی گھرانہ اور کوئی بھی خاندان باقی نہیں ہے کہ جو اپنا چراغ ان سے نہ جلایا ہو۔

آج مجھے اس نرم نازک مرکزِ فکر پر گفتگو کرنی ہے، جس کا نام ''ندوہ'' ہے، اور ''دار العلوم'' اس کی باضابطہ درس گاہ کا عنوان ہے، جو پوری ایک صدی تک بڑے خیر وبصیر کے ایک قافلہ کی رہنمائی میں پلا اور پروان چڑھا ہے اور جس نے اپنے انداز میں ملت وقوم کی خدمات انجام دی ہیں۔

ملت اسلامیۂ ہند جب استعماری طاقتوں اور اس کی وسیع سازشوں سے تنگ آچکی تھی اور اس اندھیری سے نکلنے کی تمام راہیں تقریبا بند تھیں، تب مدرسۂ دیوبند کی بنیاد پڑی، اٹھارہ سو ستاون کی ناکامی اور شکست کے بعد دشمن سے لڑنے کے لئے رجال تیار کرنے کا کام تھا (۱) ادھر مقابلہ برٹش

---

(۱) حضرت شیخ الہند کا تجزیہ تھا، انہوں نے دار العلوم کی بنیاد کا مقصد بتاتے ہوئے فرمایا تھا، ادھر ہم نے انہی کی ذات سے مدرسہ کی مکمل کامیابی کی بات کہی ہے۔ (حسین احمد)

سامراجی دشمن سے تھا، جس کی حکومت پورے کرۂ ارضی پر محیط تھی، اور وہ خود ملت کے اندر سے اپنے گھر کے دشمن تیار کر چکا تھا، ان کی ربوبیت کا اقرار خود ہند کے بڑے بڑے گھرانے بھی کرنے لگے تھے، علاوہ ازیں وہ زندگی کے ہر شعبے پر محیط ایک فکری، ثقافتی، سیاسی، سماجی اور مذہبی دشمن تھا، جس کا تاب نہ لانا، اپنی ویران اور اجڑی ہوئی بستی کو از سر نو آباد کرنا، گھر اور باہر کے دو دشمنوں سے اپنے وطن کو پاک کرنا اتنا آسان کام نہیں تھا، جو ایک معمولی سا دینی مدرسہ کو سونپا جائے، مگر قدرت کو سونپنا اسے منظور تھا، تاریخ نے اسی کا نام درج کیا ہے کہ آزادیٔ وطن کا سہرا اسی کا سر ہے، اسی مدرسہ کے پروردہ قافلہ کی محنتوں سے آزادی کی راہ ہموار ہوئی اور قوم کامل معنوں میں آزاد ہندوستان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

ادھر کارواں آگے بڑھ رہا تھا، چلنے کا راستہ بڑا تنگ اور تاریک تھا، بادِ مخالف بھی تیز سے تیز تر ہو رہی تھی، مگر قدرت کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے، یہاں سے انسانوں کا جرار قافلہ تیار ہونے کو ہے تو قومی ضروریات و خصائص کی اس ''عطر مجموعہ'' پر نظر پڑ گئی، جبھی مدرسہ کافی ضرب دینے کے قریب آنے لگا تو دشمن نے سوچا کہ اس مشن کو ابھی اور یہاں رک دینا چاہئے، اس حوالے سے باہر کے دواخانے کا کوئی بھی نسخہ کام نہیں آئے گا، خود ہندوستانی فکٹری کی دوا چاہئے، ہندی قوم کے آستین کے اندر سے وہ بچو نکالنا چاہئے جس کی زہریلی کاٹ سے اس کا خاتمہ ہو سکے کہ { **والانف بالانف والاذن بالاذن والجروح قصاص** } والی بات تھی۔

دشمن نے سوچا تھا کہ اس دعوتِ حق و صداقت کے آگے روڑے اٹکانے کے لئے ایک اور دعوت کی ضرورت ہے، گوکہ وہ کوری ہی کیوں نہ ہو، ایک مستقل قافلہ چاہئے، گوکہ وہ منزل ناشناس کیوں نہ ہو، ایک مدرسۂ فکر چاہئے، گوکہ وہ سوز و ساز سے پاک اور زبان کا گونگا کیوں نہ ہو، وہ تھا مدرسۂ علی گڑھ، یا علی گڑھ کی فکر، جس کا نام ''مسلم یونیورسیٹی'' ہے، اب اس کی بنیاد پڑ گئی تھی (شاید خال خال اس کے نیک مقاصد بھی رہے ہوں گے) تاہم اس مقصد بد کو پورا کرنے کے لئے کشتی کا لگام خود سرخ فام دشمن تھامے ہوئے تھے، نعرہ دشمن سے لڑنے کا کہاں تھا، بلکہ اس سے قریب ہونے کا تھا، ایسا قریب کہ قلب و قالب میں قریب اور روح و جگر میں قریب، تا کہ دونوں کے مابین کوئی اور کہیں اجنبیت کا نظارہ نہ ہو، دونوں کو ایک دوسرے سے ایسا پیوست ہونا اور حلول کرنا تھا کہ غلام و آقا میں

اور فاتح و مفتوح میں کوئی تمیز باقی نہ رہ پائے۔

یوں تاریخ کی نگاہوں نے یہ دیکھا کہ اس جماعت نے قریب ہونے، حلول کر جانے اور تمیز باقی نہ رکھنے کا کام تو خاطر خواہ انجام دیا، مگر وہ کام اس سے بھی نہ ہو سکا جو اسے ہندوستان کی حکمرانی کے لئے درکار تھا، دوسرے الفاظ میں کہوں تو آقا کو اپنے باپ دادا کی ''جاگیر شاہی'' تو چھوڑنی پڑی مگر ان وفادار غلاموں کے نصیب میں کچھ کام کی چیز نہیں آئی، صرف اور صرف اتنی سی بات بن سکی کہ وراثت میں بے جان رسم و راہ کی زنجیریں ملیں، جو بھاگنے والے آقاؤں کی پھیلائی ہوئی تھیں۔

واضح رہے کہ اب ملت اسلامیہ ہندوستان کی زمین میں دو قافلے کار فرما تھے، پہلے کی منزل تو پچھلی سطور میں بتا کے آیا یوں اور ساتھ ساتھ اس کی پہنچان بھی، جب کہ دوسرے قافلے کی بات بھی آپ کی نظر عنایت کے سامنے ہے، بس تقلید فرنگ ہی اس کا کام تھا، اور پینٹ پتلون سے اس کا مطلب، تو حالات ایسے ہوئے کہ دونوں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے، ایک کو دوسرے سے اتنا بعد تھا اور اتنی اجنبیت اور کش مکش تھی کہ ہر ایک کی دنیا ہی الگ ہو چکی تھی، تقریباً ان کی آخرت بھی الگ، مذہب بھی الگ، سوز بھی الگ اور ساز بھی الگ۔

تو ایسے حالات میں ایک تیسرے دانش کدہ کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی، جس کے نزدیک نہ مدرسہ کو دشمن سے برسرِ پیکار ہونا تھا اور نہ اس کی تہذیب و ثقافت کی تقلید کی جانی تھی، بلکہ ایک تیسرا کام اس کا حوالہ تھا، جس کا نمایاں طور پر اعلان بھی کیا جا رہا تھا، وہ یہ کہ ان دونوں متحارب کارواں کو قریب کیا جائے، ان متنازع کیمپوں کے درمیان پائے جانے والے خلیج کو کم کیا جائے، یہ دانش کدہ ان دونوں الگ الگ دنیا میں رہنے والوں کے درمیان ایک کامیاب سفیر کے بطور کام انجام دے، جس کا رسمی نعرہ یہ تھا کہ ''قدیم و جدید میں جمع کرے''۔

گوکہ اس تیسرے قافلہ کو دوسرے میدانوں میں کامیابیاں ہوئی بھی ہیں، مگر میرے خیال میں شاید اس رسمی نعرہ کی شان کا کوئی خاص کام اس سے ہوا ہو، یہاں تفصیل کی گنجائش تو نہیں، البتہ اتنی سی بات عرض کر دیتا ہوں کہ قدیم سے اگر علوم اسلامیہ مراد ہے اور جدید سے تجربی اور عصری علوم، تو ندوے کو نہ کبھی اور کسی بھی وقت ان مواد درس کو پڑھاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا، جو جدید ہیں، ہاں اتنی

سی بات تو ٹھیک ہے کہ علوم اسلامیہ کو اپنے خاص انداز یا عصری اسلوب میں پڑھایا گیا، تو یہ جدید و قدیم میں جمع کرنا کہاں ہوا؟ بس اسلوب عرض کے فرق سے ایک ادارہ کا امتیازی نام اور کام اور ایک کارواں کا تخصصی طرہ ہونا کہاں تک مناسب اور حسب حال ہے؟ اگر اس تجزیہ کے باہر کوئی پر اسرار چیز ہے جو عام نظروں سے اوجھل ہے تو اس کی شرح و توضیح کا انتظار رہے گا۔

بہر حال رسمی نعرہ یا امتیاز کا طرہ جو بھی رہا ہو، مدرسہ کی بنیاد پڑ چکی تھی، جو ان مبارک ہاتھوں سے پڑی تھی، جن کی مبارک فہرست میں مولانا مونگیری (بانیٔ ندوہ) کے علاوہ حلقۂ دیوبند سے حضرت شیخ الہند اور حکیم الامت تھانوی کے نام گرامی بھی تھے، ادھر طیبہ کی سرزمین میں بھی ابھی شیخ الطائفہ بقید حیات تھے، انہوں نے مژدہ سن کر بے ساختہ فرمادیا کہ ''یہ ایک غیبی لطیفہ ہے، قدرت اس کی حفاظت اور آبیاری فرمائے'' یہ جو بنیاد پڑ گئی تھی، ان بزرگ ہاتھوں سے ہی تھی، اور یہ ایک قلندرانہ صدا تھی جو منہ پہ آگئی تھی، رائگاں جانا تو دور کی بات بلکہ جوں کا توں کام آنی شروع ہوگئی تھی، گو کہ اپنی مراد و مقصود کی حد تک ہی سہی، قافلہ خدمات ملت کے میدان میں رواں دواں نظر آنے لگا تھا، گو کہ اپنی نگاہِ انتخاب کے دائرہ تک ہی سہی۔

اب یہ سوال اور تردد کا مقام ہی ختم کہ ندوہ بہتر ہے یا دیوبند؟ قاسمی زیادہ فاضل ہے یا ندوی؟ ندوے کا کام زیادہ قیمتی ہے ملت کے نام پر یا دیوبند کا؟ کیوں کہ ادارے کا بنانے والا قافلہ ان دونوں مکاتبِ فکر کے معجون مرکب تھا، یا یہ کہہ لیجئے کہ ولی اللہی شجرۂ طیبہ کی یہ دو چھوٹی بڑی شاخیں ہیں، جو پھیلنے لگی ہیں۔

مگر ادارہ ''ندوہ'' ابھی خدمت ملت کے حوالے سے کہاں تک کام آیا؟ زمانے کی ضرورت کے مطابق ملت کے وسیع میدان کے لائق کن کن کو پیدا کیا؟ اس اجڑے چمن کی پاسبانی کے لئے آیا کوئی انسان بھی نکالا؟ یہ وہ سوالات ہیں، جن کے جواب ہم تاریخ کے صفحات سے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کریں گے، اس کے بعد آپ بذاتِ خود اس درسگاہ کے ماضی و حال پر، اور اس کے آغوش تربیت میں پلنے والے قافلہ پر بلا جھجک اپنی رائے قائم کریں گے، پھر آخر میں اپنی ایک دو شکایتیں بھی پیش کریں گے، جو شاید آپ کی سمع خراشی کی باعث بھی بن سکتی ہیں، معاف فرمانا۔

ادارے ''ندوہ'' کی تحریکی شعار اور مشنری مہم کے حوالے سے ابھی بحث ہوگئی ہے، بات یہ ہے کہ ادھر ملت کو مدتوں سے ایک یگانہ شخصیت کی ضرورت تھی، جنہیں فکر و نظر کی وسعت، کردار و عمل کی پاک بازی، نظر و فکر کی گہرائی، حب الوطنی کا مزاج و جذبہ خود عرش والے سے ملا ہو، پھر ان کی پیہم جد و جہد سے قافلۂ حریت کو کامل مدد ملے، اور اس کی مسلسل کوششوں سے اس کا فروغ ہو، یا اسے ایسے پیکر انسانی کی حاجت تھی جس کے قائدانہ رول اور حکمتِ دعوت و دلاویز شخصیت میں ایسا جادو یا ایسی شان ہو جو اہل چمن کے دل و دماغ کو حیرہ کر سکتی ہے، یہ کام درس گاہِ ندوہ سے کہاں تک ہو سکا اس کی تاریخ اور جائزہ آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔

علامہ سید سلیمان مرحوم سے مولانا مسعود عالم مرحوم، مولانا عبد الباری مرحوم، مولانا مظفر صاحب مرحوم، اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تک ایک طویل اور انمول فہرست ہے، جس کے ہر نام پر الگ الگ اکاڈیمیاں قائم کی جائیں تو بھی کم ہیں، ہر ایک علم و فن، فکر و نظر اور زبان و ادب کے دنگل کے بڑے بڑے پہلوان تھے، رزم و بزم کی ہر بات پر ان کا قدم و قلم ممتاز نظر آتا ہے، ان کی سوانح زندگی پر جلدوں کی جلدیں لکھ دی جائیں تو بھی شاید ان کے حالات مکمل ہو سکتے ہیں، مجھے ان مختصر سی معروضات میں ان کے مقام بلند کو متعارف کرانا مقصود ہے اور نہ انہیں دفتر تاریخ میں چھوٹے کرنے کا ارادہ۔

ایک سیدھی سی بات عرض کرنی ہے بس، وہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ ہند کو ان کے عہد میں جس کارِ عظیم کا کرنا تھا، اور اس کی عزت و ناموس جن ناپاک ہاتھوں میں قیدی تھی، یا جن غلامان مکر و فریب کی دشمنی سے پوری ملت دوچار تھی، انہیں اس بات کی خبر لینی تھی، ان کو چاہئے تھا کہ فضا صاف کر لے، آذان سحر کی گونج جو رک سی گئی تھی ان کو از سر نو فروغ دے، انہیں مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں کی اجڑی ہوئی دیواروں پر غیرت ملی اور حمیت وطنی کی تیز نگاہوں سے دیکھنا تھا۔ یہ سب باتیں کہاں تک، کس حساب سے، اور کس انداز میں ان سے ہو پائی تھیں، یہ تھا سوال، جس کا جواب بلکہ واضح جواب پر ندوے کی کامیابی کا دار و مدار ہے، یہ اور اس جیسی باتوں کی بنیاد پر اگر تاریخ مرتب ہوئی، یا اس نقطۂ خیال کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا گیا تو شاید اس کا نام ان اداروں کی فہرست میں آئے گا، جنہیں تاریخ کی زبان

میں کامیاب اور فائز المرام کہا جاتا ہے۔

(ندویوں میں سے) آپ مرحوم عبدالباری کے علاوہ دوسرے کسی کا نام بتا نہیں سکیں گے، جس کا قدم اس سنگلاخ وادی پر پڑا ہو، اس دانش کدہ کی تاریخ سو سالہ پرانی ہے، اس کی آدھی زندگی برطانوی ہند میں گزری ہے، لگ بھگ اس کی دوسری آدھی آزاد ہندوستان میں، اور اس کی کتاب تاریخ کے روشن ترین ابواب وہ ہیں، جو عہد ظلم وعدوان میں لکھے گئے تھے، اس قافلہ کے سابقین اولین کے ابھرنے کا زمانہ وہ ہے جب پوری ملت سامراجیوں کے پنجۂ استبداد سے پامال ہوکر چور چور ہو چکی تھی، وطن عزیز کے رخ زیبا غلامی، اسیری، بے چارگی اور کس مپرسی کے بدنما داغ سے دوچار تھا، اس ملت کو تیغ سنان سے زیادہ کام تھا علم ومطالعہ کی گونا گونی، ادب وثقافت کی گہرائی وگیرائی، وعظ وارشاد یا ممبر ومحراب کی گرم جوشی سے زیادہ بالاکوٹ، شاملی اور پانی پت کی یادگار شوکت کی درکار تھی، مگر ''اس مدرسۃ الایمان'' نے شاید کسی جاں باز پہلوان کو پیش کیا ہوگا، جو اس میدان کارزار کا لائق تھا۔

ادب وفکر کا چرچا، زبان وقلم کا کام امن وسلامتی کے موسم میں زیادہ ہوتا ہے، جب کہ اسیری وپابہ زنجیری کی اندھیاریوں میں کام اس جاں بازی اور سپہ گری سے ہوتا ہے جس سے ظلمتوں کے تہ بتہ بادل کو ٹوٹا جاتا اور قید وسلاسل کی زندگی کو ختم کیا جاتا ہے، ملت کے سر سے وہ منحوس سایہ اٹھایا جاتا ہے کہ جس کی وجہ سے زندگانی دوبھر ہوگئی ہو، ایسے حالات میں {المسلم من آمن جاره بوائقه} کا رجز نہیں چاہئے بلکہ {لا يجتمع غبار في سبيل الله و دخان جهنم} کی ندائے غیب اور اس کی مسلسل پکار کا انتظار ہوتا ہے، مظلوموں کو چیخ نہیں چاہئے جو زبان وقلم، اور شعر وشاعری سے بھی ہوسکتی ہے، بلکہ وہ شمشیر خدا چاہئے جو ناموس وطن کی پاسبان ہو، ظلم وعدوان کو للکارنے والی ہو، پھر اس کا سر قلم کرنے میں کامیاب بھی ہو۔ یہاں آذان مجاہد والی بات ہے، کفن بردوشوں اور تیغ وتفنگ، تیروں تلواروں سے لو لگانے والوں کا کام ہے۔

بہر حال واقعہ اور حقائق کی روشنی میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس ادارے (ندوہ) نے اپنی تمام عظمت وکبریاء کے ہوتے ہوئے، اور اس کے بہت سارے کارہائے نمایاں کی طویل وعریض فہرست کے ہونے کے باوجود وہ کام انجام نہ دے سکا، جو ملت کو اولیت کی بنیاد پر درکار تھا، اس سے

دوسرے تیسرے درجہ کا جو فکری کام ہوا، اس سے اس مختصر عرض داشت میں میرا کوئی سروکار نہیں، پھر بھی اگر سچ پوچھیں گے تو یہ کہہ دینا واجب ہے کہ اس علم ودانش کے قافلہ کے بہتوں نے فکر ونظر، زبان وادب اور شعر وشاعری کے میدان میں بڑا گراں قدر کام کیا، جن سے علوم ومعارف کے خزانے میں عالمی معیار کا اضافہ ہوا ہے۔

(اس ادارے سے) ایسی شخصیات ابھریں، جو آزاد ہندوستان کی آبرو کہلانے کی لائق ہیں، مرحوم سید سلیمان ندوی وفد کابل کا صدر اور وطن عزیز کا سپوت تھے(۱) علی میاں ندویؒ صرف اسلامیان ہند کے نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے سرخیل گزرے ہیں، تو یہ حضرات گیسوئے ہند کی آبرو نہیں تو اور کیا تھے، ادھر یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ حضرت بانیٔ ندوہ مولانا مونگیری کو اویس ہند حضرت گنج مرادآبادی سے اور مولانا سید عبدالحی حسنی کو شیخ الطائفہ حضرت حاجی صاحب سے راہ ورسم اور باریابی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ملت عزیز کی ضروریات کے حساب سے خدمات کے لئے کامل معنوں کا انسان (اس ادارے سے) پیدا نہ ہونا بھی صحیح ہے، لیکن دوسرے میدانوں کے لئے ایسے کارگر قافلہ کا پیدا ہونا بھی صحیح، جس کے کردارِ بلند کا خوش گوار اثر آزادی سے پہلے گو دھیما دھیما تھا، لیکن آزاد ہندوستان میں بہت درخشاں رہا ہے، صرف ہند کے اندر ہی نہیں بلکہ اس کے حدود سے آگے بھی پورے عالم اسلام تک پھیلا ہوا ہے، بطور خاص علامہ سید سلیمان ندوی اور علی میاں کی شہرت ومقبولیت کی صدا چار دانگ عالم میں گونجی، اور اس بزم دانش کا آخری شہ سوار علی میاں تو آج کی علمی دنیا کا بے تاج بادشاہ سمجھے جاتے اور عرب وعجم کے مشاہیر میں میر کارواں اور صدر الصدور کی مسند بیٹھے ہوئے تھے۔

آخر میں میں اس بات پر جاتا ہوں کہ جو میری اس جرأت بے جا کا سبب بنی ہوئی ہے، اور مجھے آمادہ کیا ہے ان حساس چیزوں پر قلم اٹھانے کے لئے جس کا میں اہل نہیں ہوں، وہ یہ ہے کہ لسان العصر

---

(۱) نادر شاہ مرحوم کو نظام حکم میں اسلامی رنگ لانے کا ارادہ ہوا تو اس نے (افغانستان میں) ماہرین کا کنونشن بلایا تھا، ہندوستان سے سہ رکنی وفد کا صدر مولانا تھے، ممبران میں علامہ اقبال اور سر راس مسعود بھی تھے۔ (حسین)

اکبر الہ آبادی کے مطابق ندوہ ''زبان خوش مند'' کا نام تھا اور ان کا کہنا بھی اتنا دل فریب تھا کہ زمانے کے دوسرے ادارے سے پہلے ہندوالوں نے اسے بڑے فخر سے قبول کیا، اور طویل مدت تک اس کا چرچا کرتا رہا، ادھر زمانے کو اس ادارے اور اس کے قافلۂ دانش سے بجا طور پر یہ توقع تھی کہ کچھ لکھے تو خوش سے لکھے، یا کسی پر قلم اٹھائے تو ہوش مندی کا بھرم بحال رکھے۔ اور پھر ہم نے زندگی بھر اس کی سینکڑوں نظیریں بھی دیکھی ہیں کہ کتابوں پر ندویوں کا تبصرہ بڑا بے لاگ، برمحل اور باوقار ہوتا تھا، ان کی خود کی کاوشیں بھی بڑی آن بان کی ہوتی تھیں، حتی کہ مدتوں سے ہمارا یہ خیال ہو چلا کہ مصحف میں کہیں طباعت کی غلطی ہو سکتی ہے مگر ندوہ اور اس کے ''ادارۂ تحقیقات'' کے لٹریچر میں نہیں۔

حقیقت جتنی بھی کڑوی ہو مگر حقیقت ہے کہ آج کل اس ندوے کا رویہ اور مزاج کچھ دوسرا نظر آتا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے یہاں ملت ارکان کی تاریخ پر ایک کتاب نکلی ہے، جو ایک ندوی فاضل کے قلم سے ہے، کتاب اپنے طرز پر کہاں تک قیمتی اور کامیاب ہے اس پر کہتے ہوئے مجھے دوسرے اہل نظر کا ابھی انتظار ہے، مگر اتنی سی بات عرض کر دینے میں کوئی تاخیر نہیں کہ کتاب جس موضوع سے متعلق ہے اس کے بارے میں کسی یافت و دریافت کئے بغیر مولانا ندوی مرحوم سے لے کر نذر الحفیظ ندوی تک وہاں کے نمایاں سب اہل قلم کے تبصرے چھپے ہیں، جن میں تبصرے سے زیادہ سراہنے اور داد دینے کا جذبہ نظر آتا ہے، پھر یہ بھی سنا ہے کہ ایک صاحب نے بڑی بھاری سند بھی سنا دی کہ '' آپ کا اسلوب ادیبانہ اور مؤرخانہ ہے، اردو کی لسانی فروگزاشتیں ٹھیک کر لینا'' مبارک ہو وہ اسلوب ادیبانہ ومؤرخانہ ، مبارک ہو اس زبان مستند کی سند مبارک، محترم کا مغالطہ شاید اس بات سے ہو گیا ہو گا کہ مؤلف '' ندوی '' ہیں، باکمال ہونا فطری بات ہے، لکھنے پڑھنے کا اچھا سلیقہ ہو گا، مگر کبھی کبھار بات الٹی بھی ہوتی ہے، جس کی مثال آپ کی سو سالہ تاریخ میں ہزاروں ہوگی کہ ہر ندوی فاضل نہیں ہوتے، اور ہر فاضل کا ندوی ہونا بھی کوئی ضروری بات نہیں ہے۔

میرے محترم! وہ کتاب جو صدیوں کی ایک مسلم ملت اور اس کی تاریخی مد و جزر سے تعلق رکھتی ہو، اور اس کے مضامین میں کچھ ایسی حساس باتیں بھی ہوں جو اس قوم کی ان تنظیموں اور تحریکوں سے متعلق ہیں، جو آج تک برسرِ پیکار اور رواں دواں ہیں، اور اس میں ان چیزوں کا بھی تذکرہ آیا ہو جو اس قوم

کے مستقبل اور اس کی امنگوں اور تمناؤں کی دنیا سے سررشتہ رکھتا ہو، آپ کو ستائش و سپاس کا کلمہ لکھتے ہوئے اس بات کا احساس تک نہ ہوا کہ آیا جس قوم کی پر اسرار تاریخ زندگی سے گفتگو ہے اس کے کسی دانش ور کی رائے بھی یہاں ہوئی ہے کہ نہیں، اس قوم میں دو ایک شخص ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ جو ادب و ثقافت کی دنیا سے رشتہ رکھتا ہو، اور کوئی ایسا ادارہ بھی تو ہو سکتا ہے جو ان باتوں پر تخصصی نگاہ رکھنے کا قابل ہو، اہل لسان نہ ہونے کے باوجود اس خلد بریں کی زبان ''اردو'' سے باخبر کوئی مسکین بھی تو ہو سکتا ہے، جب کہ اس تقریظ کردہ کتاب میں سینکڑوں حوالے ان کتابوں کی ہیں جو ارکانی اہل قلم کی ہیں، اور اردو ہی میں ہیں، اور وہ قوم بھی کچھ ایسی ہو جو اپنی پشت پر ایک شاہانہ زندگی اور شاندار ماضی رکھتی ہے، گو کہ آج اندھیاریوں میں بھٹکنے اور اپنوں کا ستم کھانے لگی ہے۔

آپ کو یہ بات بھی دیکھنی تھی کہ کتاب میں کہیں ان مظلوموں کی ملی مصلحت کے خلاف قلم چل گیا ہے کہ نہیں، یا کہیں ان سرفروشوں کی جد و جہد پر ٹھیس لگا ہے کہ نہیں، جو ملت کی عظمتِ رفتہ کی فکر سے سرشار اور کفن بردوش ہیں۔

کاش آپ کا رویہ اتنا ستم ظریفانہ نہ ہوتا! کاش آپ اپنے سلف کے ان مؤرخین کی طرح ہم سے تساہل و تجاہل کا معاملہ نہ برتے ہوتے (۱) کاش آپ اپنی پرانی وضعداری کے برعکس اس سوقیانہ پن کے مرتکب نہ ہوئے ہوتے!۔

ہم جانتے ہیں کہ اس قوم ''روہنگیا'' کی خیر و فلاح کے کام کرنے والوں کی مثال اس ٹمٹماتا ہوا چراغ جیسی ہے جو نہ اپنی عمر دراز کی امید رکھتا ہے اور نہ دوسروں کو روشنی دینے کی طاقت، مگر ٹمٹما رہا ہے، نہ یک قلم گل ہو کر ختم ہو جاتا ہے اور نہ روشنی سے بھڑک اٹھتا اور گرد و پیش کو روشن کرتا ہے:

بال و پر ٹوٹے ہوئے پرواز کی طاقت نہیں
تاک میں صیاد ہے گلشن کی دیواریں بلند

---

(۱) جن کی تاریخی کتابیں جلدوں میں پھیلی ہوئی ہیں، ڈاکٹر اکرام صاحب کا ''سلسلۂ کوثر'' ان میں نمایاں ترین کاوش ہے۔ (حسین احمد)

یقیناً آپ کی مسیحائی کا راز اس میں پنہاں تھا کہ آپ اس چراغ کے اندر نئے طرز سے زندگی کی روح پھونکتے ، نہ اس میں تھا کہ اس کا مذاق اڑاتے ،طنز کرتے اور گلہ وشکوے کا بازار گرم کر دیتے ،اس قوم کو صرف قدرت ذوالجلال کی چارہ دستی کا انتظار ہے، جوڈوبتوں کو سہارا دیتا ہے،اور مرتے ہوؤں کو جیون۔

کہیں اس چراغ راہ پر رحمت پڑ گئی ،ان مظلوموں کے ستارۂ نصیب کو روشنی مل گئی ،اوران نیم جان اداروں میں جان آ گئی تو دل دل میں ، گھر گھر میں ایمان واسلام کی صدائیں گونجیں گی ، وہ اسلام جس کی نزاکت اور دل ربائی نے عرب کے مرگ زاروں کو جگایا ہے، اسی قسم کی دل نواز فطرت نے ایک بار نظر کرم فرمایا تھا تو آج پورے کرۂ ارضی پر صدائے حق کی بازگشت ہونے لگی ، یوروپ اور امریکہ سے لے کر مشرق اقصی تک ربع مسکون کے گوشے گوشے میں شوکتِ اسلامی کا جھنڈا بلند ہونے لگا ، وہ کسی صاحب تنظیم مدبر کا ہاتھ نہیں تھا ، بلکہ مدبر کون کے دست غیب کی چارہ سازی تھی ، یا سر بلندیٔ حق کی سنت قدیمہ، یا اس کرم فرما ذات کی بارانِ رحمت۔

یہ اصل میں کام ہی تجدیدیٔ فکر کا ہے، جس میں صاحب کردار کی نظر اس بات پر نہیں رہتی کہ کامیاب کہاں تک ہوا بلکہ نظر اس پر رہتی ہے کہ کام پر دل لگا ہوا ہے کہ نہیں ،مگر افسوس ہے کہ لوگوں کی کوتاہ نظری اتنی بڑھی ہے کہ اس عظیم کار نبوت پر بھی کاروبار دنیا کے حساب سے نظر دی جانے لگی ہے۔

افسوس ہے کہ آج ملت کو اپنے دشمنوں سے زیادہ ان نااہل دوستوں کی وجہ سے ستم پہنچنے لگا ہے جو دشمن کی کیمپ پہ ہوتے تو شاید اتنا کاری ضرب لگا سکتے ، یہاں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی یاد آ گئی ،مرحوم کہا کرتے تھے کہ ’’اسلام کو اپنے دشمنوں سے زیادہ صدمہ اپنے نااہل یاروں کی وجہ سے پہنچا ہے‘‘۔

اخیر میں رب کریم سے دعا کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے ان اداروں سے جن سے ملت کی امیدیں وابستہ ہیں ایسے انسان پیدا ہو جو حقیقت میں امیدوں کا مرکز بن سکے، اوران نونہالان وطن کو خدمت وطن کے شوق سے پہلے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے اور فریضۂ منصبی سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق ہوجائے ، اوراس بے یارو مددگار قافلہ کو ایسی رہبری ملے ،جس سے وہ اپنی منزل کا سراغ پا جائے ،اور یوں اس سرزمین اسلام پر اللہ اوراس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لازوال بادشاہت قائم ہو، جس کی تمنا اور انتظار میں ہمارے اسلاف کی نسلوں کی نسل ختم ہوگئی ہے:

حفاظت جس سفینے کی اسے منظور ہوتی ہے
کنارے تک اسے خود لا کے طوفان چھوڑ جاتے ہیں۔

حسین احمد ابوالفضل

۲۱؍فروری؍۲۰۰۰ء۔ چاٹگام، بنگلا دیش۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو سے میری کہانی خود اردو ہی کی زبانی

اردو نہ میری مادری زبان ہے اور نہ کبھی ہماری ملکی اور قومی زبان رہی ہے، جب احساس وشعور نے آنکھیں کھولیں اور لسان ولسانیات میں میری کروٹیں بدلنی شروع ہوئیں تو آغوش تربیت سے موروثی زبان جو ملی وہ کچھ ایسی تھی کہ دنیا وجہاں کی تمام زبانوں سے یک سر بے گانہ ونا آشنا، وہ کوئی لکھی پڑھی جانے والی زبان نہیں تھی، نہ اس کے حروف ہجائیہ کی کوئی پہچان تھی اور نہ الفاظ ومحاورات کا کوئی حسب ونسب اور اصل ونسل۔

جوں جوں چند سال عمر عزیز آگے بڑھے تو احساس وشعور نے عقل ودانش کے دروازے پر دستک دینا شروع کیا، جوابا ہزار تحریک وتشکیل کے باوجود کوئی سلیقہ بن نہیں پڑا، اس زمانے میں پڑھنے لکھنے کا نصیب اسکول کی درس گاہ میں تھا، وہاں کی زبان بھی بڑی حد تک اجنبی اور کسی حد تک اچھنبی تھی، اساتذۂ کرام جن کے ہم حوالے تھے وہ گھر کے ماحول سے یک سر ٹکرانے والے دین، تہذیب وثقافت اور زبان وادب کے مالک تھے، تو ہم یتیمانِ صفرۂ خودرو کہاں کی تعلیم لیں اور تربیت پائیں؟ اسی سن وسال کے ہوکر ذہنی الجھن اور کشمکش کے شکار ہم وقت کٹاتے رہے تھے، ایک طرف نہ زبان سمجھ آرہی تھی اساتذۂ کرام کی اور نہ عادات واطوار سے یگانگت تھی اسکول اور اہل اسکول کے، علاوہ ازیں بسا اوقات ایسی پرشکوہ صدائیں بھی کان سے ٹکراتی تھیں کہ یہاں مسلمان نہیں رہ سکتے، یہاں نمازیں پڑھنے کی چھٹی نہیں مل سکتی، کبھی ہم ابنائے اسلام اور ابنائے بدھ مت ایک دوسرے سے برسر پیکار، ایسے حالات میں مقدر کو جو کچھ منظور تھا ہوکر رہا، آخر یہ کارواں اور چند دنوں کے بعد رک سا گیا تھا۔

اب سفر تو زندگی کا تھا، مگر راہ الگ اور رہرو بھی نئے، راہ تو دیکھنے میں قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں والی تھی، جو بلند وبالا مناروں سے ٹکرانے والی، اور یہاں کارواں بھی کچھ ایسا تھا کہ {حتی ان الملائكة لتضع اجنحتها خضانا لهم} کی الہی سرٹیفکٹ لے لے کر گھومنے والا، اپنی اور اپنے معاشرے کی زندگی کو معبود سے ملانے والا۔

اب کی زبان الحمد للہ سمجھنے والی تھی، مگر آخر کس حد تک؟ یہاں بھی درس وتدریس کی زبان الگ تھی

اور علم ومطالعے کی الگ، صرف گفتگو کی زبان تھی سمجھ آنے والی کہ ہماری مقامی زبان تھی، اور اسے ہماری مادری زبان بھی کہہ لیں تو صحیح ہے، اب درس وبحث اور علم ومطالعہ کی زبان کہیں اردو کے نام کی تھی اور کہیں عربی کے نام کی، بہر حال یہاں کشمکش زبان کی حد تک کسی قدر تھی تو ضرور، مگر دوسری تیسری چیزوں میں اتنی دوری نہیں تھی جتنی پچھلی درس گاہ میں تھی، یہاں دین کے حوالے سے اسلام کا نام لیا جاتا، نماز وروزہ تو کام کی چیز تھا، تہذیب وثقافت تو اسلامی تھی، تو کسی قدر انس ومحبت سے وقت کٹتا رہا، یوں ذہن کو کسی قدر خوشی نصیب ہوئی، تاہم ضمیر کو اتنا اطمینان وسکون نہیں مل رہا تھا کہ سچ میں یہ وہ چیزیں ہیں کہ ہم جن کی تلاش میں یہاں آئے، یا جن روشن منزل کی جستجو میں ہم اس ماحول کے حوالے کئے گئے ہیں۔

یہاں ہمیں اردو بطور نظام مدرسہ سکھائی جارہی تھی، جب کہ عربی؟ ماشاء اللہ مدرسہ ہی تو عربی کا تھا، اور ہم طالب علم عربی کے طالب علم تھے، ویسے ہمیں ایک غلط فہمی یہ ہورہی تھی کہ ہم اردو اور عربی کے عالم بننے جارہے ہیں، علاوہ ازیں دوسرے علوم وفنون تو ہیں ہی، ایسے حالات میں درس گاہ میں چند سال اور ہوگئے تو صلاحیت کا اندازہ ہونے لگا، مگر کہاں تک؟ اردو کی تعلیم تو ختم ہوچکی تھی، ختم ہوچکی تھی سے مراد اردو اور پڑھائی جانے والی نہیں ہے، اردو کی صلاحیت ہوگئی، اور پڑھنے پڑھانے کی ضرورت جاتی رہی، یوں اردو لکھنے پڑھنے کی استعداد خیر!

ہم ادھر اردو ختم کرکے آرہے ہیں، ادھر اردو نے ہمیں ختم کردیا، یا دوسرے الفاظ میں ایک نے دوسرے کا خاتمہ کردیا، البتہ ایک کا خاتمہ تو عارضی اور وقتی تھا مگر دوسرے کا دائمی اور حقیقی، ایک کا تو کوئی خوش نصیب آکر سنوار سکتا ہے مگر دوسرے کا سنوارنا خود اپنی ذات پر تھا۔

اردو سے شد بد اتنی سی ہوئی کہ مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی کی کتابیں مولوی فیروز کی برکت سے ہم سمجھ جاتے تھے، مگر لکھنے کی جگہ ایسے لکھتے تھے کہ جسے دیکھ کر بابائے اردو بھی شرما جائیں گے، اور شبلی، حالی اور آزاد وغلام علی کی پاکیزہ روحوں کو ترس آئے گا، اور حق وانصاف کی عدالت میں ان فدایانِ اردو کی فریادیں جائیں گی کہ ایسی نسل کی ایپولیشن ممکن نہیں، ابھی کم سے کم اسے اور فروغ نہ دیا جائے، اس کا سلسلہ مزید دراز نہ کیا جائے کہ اردو دنیائے اسلام کی ایک بڑی اور بہت بڑی زبان ہے، بہت

سارے اہل دل نے اس کی تعمیر وترقی میں اپنی اپنی زندگیاں داؤ پر لگائیں، اس کی راہ میں بڑی بڑی مادی اور معنوی قربانیاں دینی پڑیں، اس معصوم کی عزت وناموس کے لئے۔

اب اردو کے بعد طبعی رفتار سے عربی کا مقام آیا، عربی پڑھائی جارہی تھی، ابتدائی کتابوں سے گذر کر ''نفحۃ الیمن'' اور ''نفحۃ العرب'' تک پڑھ لئے، اور ہم مقامات حریری اور متنبی کے سرسبز خواب میں دم لے رہے تھے، میرا تو پختہ یقین تھا کہ مقامات پڑھ لوں تو عربی کا سب سے بڑا انشار بن جاؤں گا، طہ حسین نہ بن سکا تو کم سے کم منفلوطی ضرور بن جاؤں گا، آخر اس نیم سروسامانی بلکہ پوری بے سروسامانی کے عالم میں نفحۃ العرب کی وادیٔ ایمن سے گزر کر مقامات حریری کے صحرائے فاراں تک پا پیادہ سیر کیا، میرے لئے یہ آخری مرحلہ تھا عربی ادب وانشاء کا، جو طے کرلیا گیا تھا۔

اب اپنے دامن میں جھانکتا ہوں تو ادب وانشاء اور شعر وشاعری کے کسی بھی داغ سے بھی اپنے آپ کو پاک پاتا ہوں، ہزار تمناؤں اور دلی دھڑکنوں کے باوجود نہ اس میدان میں خامہ فرسائی کی کوئی صلاحیت ہوئی اور نہ اس دنگل کے شہ سواروں کی زندگیوں سے واقفیت اور بصیرت، نہ امرأ القیس ومتنبی اور نہ زہیر وابونواس کی ادا شناس ہوسکا، نہ ابن قتیبہ وجاحظ اور نہ ابوعلی القالی کے دربار کی حاضری نصیب ہوسکی، لیکن ہم ابھی فضلائے مدارس عربیہ ہونے جارہے ہیں، لکھنے کی تمنا تو ضرور تھی کہ آخر ہمیں اس پیشہ کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا، کبھی کبھار لکھ بھی لیتے ہیں، عربی الفاظ ومحاورات کا ایک دفتر ضرور ہے، جو ہم ضرور سمجھ جاتے ہیں، مگر کسی اہل لسان کے سامنے اسے رکھا گیا تو خیر وہ کیا سمجھتے، پڑھنا بھی اس کو مشکل ہوجائے گا، آخر یہ بلا کیوں ہے؟

میرے نزدیک یہ سچ میں عربی کے کلمات اور الفاظ تھے، مگر جملے اور ترکیبیں عجمی، کبھی میں سوچتا تھا کہ ہماری ان عربی تحریروں کی اتنی بڑی درگھت اور اتنا بڑا حشر کیوں ہے؟ تو اس کا کوئی جواب نہیں ملتا، الا یہ کہ **كلمات عربية متجسمة تحت التراكيب العجمية۔**

بہرحال ہم عربی کتابت وخطابت کے عیب سے بھی یک سرپاک تھے، ایسے حالات میں ہمیں دورۂ حدیث شریف کے لئے لے جایا گیا تھا، اب کی درس گاہ جامعہ اسلامیہ پٹیہ کی تھی، سال دورۂ حدیث کا تھا، ہماری بے سروسامانی کا وہی عالم تھا کہ جس کا تذکرہ ابھی میں کر کے آیا ہوں، اب یہاں سے میری

اردو کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

اب تو ہم یہاں اپنے وطن کو چھوڑ کر ''فلولا نفر'' کے جواباً آئے ہوئے ہیں، زبان یہاں بھی تعلیم کی ایک اور عام گفتگو کی ایک، تعلیم کی تو اردو میں ہے، بطور خاص حدیث وتفسیر کی تعلیم کی تعلیم کے لئے اپنی مادری زبان کی جگہ اردو کا پانا یہ میرا دوسرا تجربہ ہے، بلکہ ایک گونہ تلخ تجربہ بھی، میرا ایک تجربہ تھا اپنے ملک کے اساتذۂ کرام کی صحبت میں، جب کہ دوسرا تجربہ تھا اس ملک کے مربیوں کے آغوش محبت میں، ویسے دل ہی دل میں ایک ناخوش گوار سوال ساتھ ہولیا اور کبھی پیچھا نہیں چھوڑا، کہ ایک اجنبی اور غیر ملکی زبان ہماری تعلیم کی زبان کیوں کر ہوئی؟۔

بہرحال اس وقت سے لے کر تا حال اس سوالیہ کو دماغ کے دروازے پر ہر وقت کھڑا پاتا ہوں، بطور خاص استادوں کی تقریر کے دوران ایک نامعلوم بے مزگی اور ناخوش گواری کا احساس ہوتا تھا، کہ (ایک غیر اہل لسان سے اردو سن رہا ہوں) جس کا جواب تقریباً نامعقول بن پڑتا تھا کہ ہمارے اکثر اساتذہ ہندوستان کے مدارس کے فاضل ہیں، جو اردو کے اہل لسان بزرگوں کی صحبت سے مستفید ہیں، شاید انہیں اپنے اساتذہ کے شوقِ تقلید اور جذبۂ اتباع نے یہی فضا قائم رکھنے پر مجبور کیا ہوگا، مگر اس جواب پر بھی دماغ کو سکون اور ضمیر کو اطمینان نصیب نہیں ہورہا تھا، آخر ہندوستان کے اساتذۂ وقت جن میں ہمارے بہت سارے بزرگ ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے اپنے اپنے مشائخ کرام (جو عربی زبان کے تھے) سے عربی میں تعلیم لی اور وطن واپس آ کر وطن ہی کی زبان میں تعلیم دی تھی، مگر ہمارے یہاں کے بزرگوں کو اس سنتِ حسنہ کی تقلید کا شوق کیوں نہ ہوسکا؟۔

بہرحال تقریریں اردو میں ہورہی تھیں، ادھر اردو میں ہمارے کمالات تو مولوی فیروز کی صحبت وبر کت تک محدود تھے، تب بھی احساس نہیں تو شوقِ احساس بڑا پرانا تھا، درس چل رہا تھا سنن ترمذی کا، صحبت حضرت ذوقؔ کی تھی، آپ نے اپنی تقریر کے دوران لفظ ''اقرار'' کو مؤنث کہہ کر چلا گیا، اور کواٹرمنٹ کے بعد پھر لوٹ کر مذکر کہا، اور تقریر آگے بڑھی، تو اس الٹ پھیر کی وجہ سے میرے احساس میں عزم کا رنگ بھرا کہ اردو واقعتاً سیکھنے کی چیز ہے، مگر کہاں سے اور کس تدبیر سے؟ مزید برآں سوالات بھی کچھ کم بھاری اور کم گہرے نہیں تھے کہ ہم موسم خزاں میں ہیں اور زبان وادب کی

اس اجڑی ہوئی دیار میں بھی۔

ذہن میں تڑپ تھی اور دل میں دھڑکن بھی، آخر کیا ہوسکتا ہے؟ دل دل میں سوچ رہا تھا کہ طلب صادق ہوتو وہ راہ خود ہی نکال لیتی ہے، میں صدق طلب کا دعوی تونہیں کرسکتا تھا مگر طلب تھی ضرور، ویسے چند دنوں کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے نثر اردو کی ایک چیز میرے ہاتھ لگ گئی، وہ تھی رشید احمد صدیقی کی ''گنجہائے گرانمایہ'' میرے خیال میں کسی دست غیب نے یہاں (جامعہ اسلامیہ پٹیہ) کے کتب خانے میں اسے چھوڑ گیا ہوگا، ورنہ اسے یہاں کون لاتا؟ اور کس کے لئے لاتا؟؟ اس کے سرِ ورق پر ایک شعر چسپاں تھا، اللہ جانے کہ کس دردمند کو یہ سوجھا تھا کہ:

مقدور ہوتو خاک سے پوچھوتو اے لئیم
تو نے یہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے؟

دراصل کتاب چند مرحوم ہستیوں کی زندگیوں پر مشتمل دل کی بے کلیاں تھیں، جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر ہم تک پہنچیں، میں ظاہر ہے کہ اس وقت رشید احمد صاحب صدیقی کے نام اور مقام سے پوری طرح نا آشنا تھا، اسی کتاب کی ابتدا میں صرف اتنی سی بات ملی کہ کراچی اور پشاور کی یونیورسٹیوں میں یہ کتاب ماسٹر ریڈنگ (ایم اے ڈگری کا ضروری مطالعہ) کے لئے لازمی ہے، اور سرورق پر مذکورہ شعر اور مرزا اسداللہ غالب کی تصویر مستزاد۔

بہر حال یہ کتاب یہاں ملنی بھی بڑی عجیب تھی، اب زمانہ رسمی طالب علمی کا ختم ہونے جارہا تھا، مدرسی کے بہانے سے ٹیکناف سے طلب ہوگئی، ایک مسافر طالب علم کے ساز وسامان میں اردو کا یہ نیا اور انوکھا مہمان بھی ساتھ تھا، جسے وہاں بھی کام میں لاتا رہا تھا، ایک ایک پیراگراف کو تکرار کرکے تلاوت کرتا رہا تھا، مگر کیا خبر تھی کہ یہ چیز سچ میں ایک کام کی چیز تھی، جو میرے ہاتھ لگ گئی ہے، مگر یہ سلسلہ دراز نہ ہوسکا کہ یہ کتاب ایک منحوس ہاتھ کی شکار ہوکر مجھ سے رخصت ہوگئی، (اللہ تعالی بھلا کرے ایسے منحوس ہاتھوں کا) دراصل کتابیں لے جانے والے لےتو جاتے اور اخلاص کے ساتھ واپس کبھی نہیں کرتے ہیں۔

ٹیکناف میں ایک دو سال مدرسی میں گزر گئے، اس کے بعد جامعہ دارالسنۃ نہلا کی کسی قدر علمی اور روحانی فضا میسر ہوئی، یہاں دوسرے تیسرے ضروری درسیات کے مطالعہ کے بغل میں معلوماتی

چیزیں بھی دیکھنے کو مل رہی تھیں کہ یکا یک حضرت مولانا علی میاں ندوی کی زیارت کی سعادت نصیب ہوگئی، پہلے حضرت کی کتابوں کی صحبت تھی، شوق وولولے کے بعد خود صاحب کتاب کی صحبت سے محظوظ ہوگیا تھا، علی میاں کی کتابوں کی صحبت سے رشید صاحب اور ان کی خاص کتابوں ''گنجہائے گرانمایہ'' اور ''ہم نفسانِ رفتہ'' کا سراہنا سن رکھا تھا، اب یقین ہوگیا کہ وہ سچ میں گنجہائے گرانمایہ ہے، جو مجھ جیسے یتیموں کے لئے نہیں صرف بلکہ سارے اہل کمال اور اہل علم ودانش کے لئے بھی گنجہائے گرانمایہ ہے۔

علی میاں کی برکت سے کہئے یا قدرت کی کیمیا گری سے کہ آزاد ابوالکلام سے شناسائی ہوگئی، اس کے بعد سید سلیمان، ماجد میاں، مہر صاحب، ماہر القادری، شبلی، حالی، محمد حسین آزاد، غلام علی بلگرامی، حبیب الرحمن شیروانی، شمس العلماء ذکاء اللہ جیسے کتنے ادب وانشاء کے امیروں اور بادشاہوں کی باریابی نصیب ہوگئی، جن کی صحبت اور زیارت نے ایک جہانِ نو کو دکھایا، یہ نئی دنیا میری نسبت ایک نئی دنیا تھی، ورنہ یہ نئی دنیا خوش نصیبوں کے لئے بڑی مانوس اور دیکھی بھالی تھی، پھر مرور زمانہ اور رفتار کارواں سے رنگ برنگ کی پھول سونگھنے کو ملی اور نئے نئے باغباں ہاتھ آئے۔

آزاد ابوالکلام کا نام تو بڑا مانوس نام ہے، جو بچے بچے کو یاد ہے، مگر ان کے ادب وانشاء کی شاہکار کتاب ''تذکرہ'' کا تذکرہ پہلی مرتبہ علی میاں سے سنا، یہ ہمارے ملک کے ایک صدیقی صاحب سے ہدیہ میں ملی تھی، کتاب سن رسیدہ اور کرم خوردہ ضرور تھی مگر کام میں لائی گئی تھی، اس کا ایک اور نسخہ فراہم ہوا تو اس سے پورا کام ہوا تھا، ویسے آزاد سے میرا رشتہ ہوگیا۔

کاش ہمارے ملک کے فرزندان دین کو ان اساتذہ سے شناسائی نصیب ہوتی تو اردو کے ادب وانشاء اور شعر وشاعری کے بہانے خدا جانے علم ومعارف کے کتنے ناپید کنار سمندر دیکھ لیتے، اور خود اردو زبان وادب کو (جو مرحوم ہونے جارہا ہے کوئی نصف صدی کے طویل زمانے سے) ان فرزندانِ توحید اور نونہالان صفرۂ دانش کے لئے اپنا سایہ دراز کرنا بھی ضروری تھا، ان کو اپنے آغوش عاطفت میں جگہ دینی ضروری تھی۔

میں نے کہی تھی اردو ادب وانشاء کے بہانے علوم ومعارف کے ناپید کنار سمندر کی بات، کیوں نہیں ؟ آپ اردو ادب وانشاء، منطق وفلسفہ، ہیئت وحکمت، تاریخ وسیرت، معاشیات ومعیشت، سائنس و

تجربیات، فلکیات وطبیعیات، مذہبیات وسیاسیات غرض علم وفن کے ایک ایک نام اٹھا لیجئے! اردو زبان میں آپ کتنے انمول خزانے پائیں گے، عربی کے بعد یوروپ کی دوایک ترقی یافتہ زبانوں کو چھوڑ کر دنیائے انسانیت کی کسی اور زبان کو اس سے برتری تو کجا بلکہ ہم سری کا دعوی بھی مشکل ہے۔

پچھلے چالیس سالوں سے اردو نے ایک پوری مملکت بھی پالی ہے، کتنی خوش نصیبی ہوتی اگر ملکی وضعداری اور ایک آزاد اسلامی ریاست کی تعمیری اور ترقیاتی اسکیموں کے ساتھ اس اسلامی زبان کی تعمیر نو کی فکر بھی کسی قدر زندہ رہی ہوتی، یہ تو خیر وفلاح کی چیز تھی، مگر نحوست کا عالم دیکھئے! کہ بہت سے صحافتی اداروں نے ترقی اور خوش حالی کے نام سے مغربی زبانوں کے عموما اور انگریزی زبان کے خصوصا الفاظ ومحاورات اس طرح بے دردانہ استعمال شروع کردئے کہ خدشہ ہے کہ کہیں یہ پردیسی مہمان شہری حقوق کا دعوی کر بیٹھے، اور نظام مملکت کا نظام سنبھال بیٹھے، اور اپنے پرانے مرشد ومربی کی طرح ''حکومت کمپنی بہادر کی'' کا نعرہ بلند کرلے، اللہ تعالی اس مرحوم پر رحم فرمائے۔

البتہ مجھے یہ پتہ نہیں چل سکا کہ آیا یہ مہمان شریف بھی ہے یا دعوت تکریم کے سہارے آرہا ہے، یا مان یا نہ مان میں تیرا مہمان والی مشرقی وضعداری کے سہارے بن بلائے آرہا ہے؟ البتہ یہ ضرور سچ ہے کہ اس کے پیش رو ''کمپنی بہادر'' یہاں ایک بار آکر دکھایا تھا، جب کہ اس کو زیر کرکے ملک بدر کرنے کے لئے پورے مشرقی بلاک کو دردسری ہوگئی تھی، اس حوالے سے کتنی جانیں لٹانی پڑیں، کتنی پاکیزہ روحوں کو ترسنا پڑا، مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں، دیروں اور مندروں کی خدا جانے کتنی عمارتیں گرکر مسمار ہوئیں، یوں آج بھی کون کہہ سکتا ہے کہ خدا نہ کرے یہ زبان وادب اور تہذیب وثقافت کے لبادے میں کوئی دوسرا مہمان نہ آرہا ہو، اور اپنے پیش رو لالچی اور دغاباز مربی سے سبق نہ سیکھ لیا ہو؟ نہ جانے اس بے دردی کے استعمالات کے پیچھے کون سا سوچا سمجھا منصوبہ چل رہا ہے؟ ہم ایک بڑے خطرہ کی نشانی دیکھ رہے ہیں، یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ میں اردو میں انگریزی یا دوسری کسی زبان کی آمیزش سے گریز نہیں کررہا ہوں، بلکہ بے دردی اور بے محل کے استعمال سے ہچکچاتا ضرور رہوں۔

خیر! یہ کہاں کی کہانی کہاں ہوگئی ہے، بہر حال اردو اور اساتذۂ اردو نے بہت ہی بڑی کرم فرمائی کی، ان بزرگ ہستیوں کی صحبت وملاقات نے ان کی سرزمین کی زیارت اور ملاقات کا شوق دلایا، ویسے

مدتوں تڑپتا رہا کہ کب وہ سعادت وبرکات کا موسم اپنا دامن بذل وعطا پھیلاتا ہے، تاکہ یہ غریب الوطن اپنے پرانے مرض سے شفایاب ہوسکے۔

دن پر دن گنتا جارہا تھا، اچانک لکھنؤ (یوپی) کی زیارت کا وقت آن پہنچا، زیارت کی سعادت نصیب ہوئی ایک ایسے دن میں کہ جب لکھنؤ میں '' آل انڈیا مسلم انٹلکچویل فورم'' کی زیر سرکردگی ایک عالمی اجتماع منعقد ہونے جارہا تھا، یوں ''گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ'' میں تقریب میں حاضری کا موقع ملا، یہ علماء اور دانشوروں کا اجتماع تھا، ہندوستان بھر کے چوٹی کے اہل علم تشریف فرما تھے، یہ میری پہلی ملاقات تھی (اور آج تک کے لئے آخری بھی) اردو کی سرزمین سے، عش عش کرتا ہوں اپنی قسمت پر کہ پہلی ملاقات ہوئی اس شان سے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے بعض اساتذہ نے یہاں تک کہا کہ آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ ادھر آپ کی آمد اور یہاں اتنا بڑا اجتماع ہورہا ہے، جو اپنی نوعیت کا بہت بڑا تاریخی اجتماع ہے، اور اہم بھی، علماء، صلحاء اور وزراء تک پر مشتمل یہ اجتماع جو میموریل ہال (جس کی یادکتابوں کی زبانی بہت ہوئی) کی تاریخ کے لئے کم اہم نہیں تھا۔(۱)

(۱) اردو سے میری کہانی خود اردو ہی کی زبانی کے عنوان سے یہ مولانا حسین احمد صاحب کی پرانی تحریر جو گئی صدی کی انیسویں دہائی کی ہے، جو دراصل آپ نے بڑی رواروی بلکہ غالبا سفر کے دوران زیب قرطاس کی تھی، عرصۂ دراز تک یہ تحریر راقم کے ذاتی فائل میں بوسیدہ شکل ہی میں سہی کسی قدر محفوظ تھی، اب اللہ تعالی کا کرم ہے کہ اسے بڑی مشکل سے موجودہ شکل میں لانے کی توفیق ہوگئی (مرتب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

وطن عزیز کی تاریخِ ماضی پر ایک نگاہِ عبرت رکھئے! اور دیکھئے کہ آج کی تباہی و بربادی، بے کسی و کس میپرسی، ظلم وخستہ حالی، ریا کاری وتکبر، قومی مستقبل سے بے خبری وعزلت پسندی، فرائض منصبی سے پہلو تہی و کنارہ کشی، قومی زندگی کی دوٹوک ضروریات ومعاشرے وزمانے کے قاہر تقاضوں سے یک سر بے گانگی اور بے ربطی، یہ ایسے ہمہ گیر اور المناک امراض ہیں جو وطن عزیز کے ذرے ذرے کو، کونے کونے کو لت جیسی بیماری بن کر کھاتے اور آگ بن کر خاکستر کرتے ہیں۔

یہ وہ سرزمین ہے کہ جس میں اپنے اسلاف کی ایسی سینکڑوں یادیں ہیں جو نونہالانِ وطن کے دل و دماغ کو مناتیں اور دعوت فکر وعمل دیتی ہیں، یہ وہ سرزمین ہے کہ جس کو سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوش تربیت کے پروردگانِ دین وایمان اور کاروانِ اسلام کے گروہوں میں سے دو ایک ہستیوں کے جولانِ قدم سے روندی جانے کی سعادت نصیب ہے، یہ وہ سرزمین ہے کہ جس کی تاریخ اسلامی اپنی قدامت میں اسلام کے اولین مفتوحہ علاقوں سے آنکھیں ملانے والی ہے اور جس کے حکمرانوں میں دو ایک خوش نصیب اور سعادت مند ایسے بھی گزرے کہ خلیفۃ المسلمین عمر بن عبد العزیز سے مخاطب تھے، اور چند دنوں کے بعد خود آں خلیفے کا مخاطب بننا بھی انہیں نصیب ہوا، اس سلطنت کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سلطانِ وقت کے کمالات کے لئے اسلامی وعربی علوم میں اتنی مہارت ناگزیر تھی کہ ممبر پر چڑھ کر عربی میں برجستہ خطبہ دے سکے، اور امورِ مملکت کی مشکلات و مہمات کا حل خود ہی تلاش کرنا جانے۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ ہم بغداد و بصرہ، شام وکوفہ کی خلافت اور انتظام مملکت کہاں سے لاتے، علماء، شعراء، فقہاء اور اصحاب فنون کا وہ اجتماع کہاں سے لاتے جس نے ایک ایک وقت میں روئے زمین کو علم ومعارف کا بیش بہا خزانوں سے معمور کیا تھا، مگر اس کی خوشی اور فخر واعتزاز کی بات تھی کہ کبھی اس سلطنت کی طویل تاریخ میں بغداد و بصرہ جیسے مسلمانوں ہی میں کجا بلکہ دوسرے مذاہب کے اہل وطن بھائیوں میں بھی شر وفساد کی وہ داستانیں آپ کی نظروں کے سامنے نہیں، وہاں خود امین الرشید کے قتل و

خون کے جانکاہ واقعات کہاں چھوڑیں گے؟ جو ایک باپ کے بیٹوں میں ہونے والے حوادث تھے، جنہیں تاریخ اسلام نے بڑی حفاظت سے ہم تک پہنچایا ہے۔

یہاں کی سرزمین کو یہی خصوصیت بھی حاصل رہی ہے کہ انتظام امور مملکت کے لئے کرسیاں تو فرزندانِ اسلام اور ابنائے بدھ مت کے درمیان تقسیم رہیں، (انیس بیس کا فرق کبھی کبھار رہتا تھا) تاہم ایسے روز بد کبھی نہیں آئے کہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہا ہو، اور اسلام کو امن وآشتی کی جگہ فساد کا اعلان کرنا پڑا ہو۔

دور آخر پر ہم نگاہِ حقیقت کے دوسرے گوشے سے دیکھتے ہیں، برطانوی سامراج کی یلغار کے بعد زمام حکومت (تمام مشرقی وایشیائی ممالک کی طرح) ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود اس کی تاریخ مملکت نہیں تو تاریخ عزیمت ودعوت یہاں خاصی روشن نظر آتی ہے (اور اس سے بھی پہلے شرقِ ایشیا کے مشہور اور الہامی شاعر علاوالدین یا عبدالاول (عرف علاول) نے اپنی الہامی شاعری جیسی چیزیں سنا کر دل دہلانے کا کام وہاں کے فرزندوں میں کیا کرتا رہا تھا، اور ایک جہاں کو زندہ وتابندہ اور آباد رکھا تھا) پھر دوسری طرف دنیا کے عظیم ترین دعوتی مشن لے کر ثناء اللہ بیرسٹر جیسے مخلص اور مجمع البحرین انسان اپنے اخلاص وللّٰہیت کے جواہر دکھانے گئے تھے۔

ادھر فقراء اور درویشوں کا ایسا مجمع رہتا تھا کہ یہاں ذکر وشغل اور تسبیح وتحلیل کا ہر کجا غلغلہ مچتا تھا، ان بندگانِ خدا کی یادگاریں آج تک عام زیارت گاہوں کی صورت میں یہاں قائم ہیں، جن میں برصغیر ہندو پاک کی تاریخ کا مشہور ومعروف بزرگ اور خدا رسیدہ درویش حضرت سید گیسو دراز کے نامی بزرگ کی زیارت گاہ زینتِ محفل کا کام دیتی ہے، یہاں مدرسوں اور خانقاہوں کا ہجوم تھا کہ تزکیہ و احسان اور تعلیم وتربیت کے میدان پر ہزاروں بندگانِ خدا سرگرم عمل نظر آتے اور قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں بلند رکھتے تھے۔

دوسری طرف علماء اور قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں کبھی اور کسی بھی طرح کا فارقہ نہیں رہا تھا کہ شیعہ ہیں سنی ہیں، بریلوی ہیں دیوبندی ہیں، حنفی ہیں شافعی ہیں، اہل حدیث ہیں یا مقلدینِ ائمہ، مسلکا پوری کی پوری آبادی حنفی اور عقیدے میں اہل السنت والجماعت سے منسلک، درس گاہوں میں ملا نظام الدینؒ کا نصاب ونظام، مشرب ومذاق میں اکابرِ دیوبند یا ولی اللہی تربیت (اسپرٹ) کے پابند:

یہی ہے مختصراً حکمتِ ولی اللہی
بیٹھے تو مدرسہ وخانقاہ اٹھے تو سپاہ

سرزمین کے پورے رقبے میں آپ کو کوئی ایک ایسا انسان نظر نہیں آئے گا جو شیعوں کے کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو، فقہ وفتاوی میں اہل حدیث اور غیر مقلدین کا سوال ہی کہاں؟ امام اعظم ابوحنیفہ نعمانؒ کے علاوہ دوسرے ائمہ کا کوئی بھی عملی پیرو یہاں نظر نہیں آئے گا، الغرض عقیدے ومسلک کا، فقہ وفتاوے کا کوئی بھی اختلاف اس ملک کے عوام میں کبھی اور کسی قسم کا رواج نہیں پایا تھا۔

مگر آج قصہائے دارا وسکندر میں سے ایک قصہ بھی سنانا پڑتا ہے، جو مادرِ وطن کے گیسوئے آبرو پر ایک بدنما داغ اور دل سے ٹکرانے والا ہے، یہاں ایک عجیب قسم کا بدنما داغ ہے جسے پھونکوں سے اڑایا جاسکتا اور نہ مالشوں سے مندمل کیا جاسکتا ہے، وہ صرف عزت وآبرو پر داغ نہیں بلکہ دل کے سوز وساز پر بھی پڑا ہوا ایک روگ ہے، جو نیم حکیم یا کسی معمولی حکیموں کے نسخے سے شفا پانے والا نہیں، وہ ایک وباء ہے ملک کی اجتماعیت اور سالمیت کے جسم پر، جو گھن کی طرح اندر ہی اندر کھایا جا رہا ہے، اور وحدت فکر خیال اور وحدت مزاج و ماحول کو یک سر ناتواں اور برباد کر رہا ہے، ایسے میں ہماری امید ہے کہ اسلام خود اسلام ہی کے گھر سے ایک ایسی نسل تیار کردے گا کہ جو عظمائے ملت کے کارناموں کے نہیں بلکہ یہاں کی تاریخی شخصیات کے کارناموں کے ذریعے اگلی نسل کے اندر حلاوت اور حرارتِ ایمانی بھر دے گی، اور حاملین پیغام الہی اور حاملین دعوتِ انبیائے کرام کی مبارک زندگیوں اور کارناموں پر پڑے ہوئے داغ کو مٹا دے گی۔

مگر آج کل یہاں بادصرصر کی تیز وتند جھونکے معاشرے کی دیواروں سے ٹکرا کر بلند وبالا میناروں تک پہنچ گئے ہیں، ویسے یہاں کی فضا بالکل نا مساعد اور مکدر ہو چکی ہے، یہاں ایک قبیلہ کا اسلام دوسرے قبیلے کے اسلام سے، ایک مدرسہ کا ایمان دوسرے مدرسہ کے ایمان سے، ایک مسجد کی آذان دوسری مسجد کی آذان سے پوری طرح بے گانہ اور پوری طرح نا آشنا نظر آنے لگی ہے، جسے ہم نے قریبی ملکوں میں بہت قریب سے مطالعہ کر دیکھا تھا کہ اسلام والوں کی جماعت میں خود اسلام ہی کے نام پر کفر والحاد کا خلیج نظر آتا ہے۔

نمازی کی صف میں نمازیوں کو دل و دماغ کے دو رنگے چہرے میں دیکھا جاتا ہے، اسلام اور وحدتِ اسلامی کی حقیقی روح بھی مصیبت کی شکار نظر آتی ہے، یہاں تک کی سید الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین جو ہم تک علمائے امت اور مجددین ملت کی محبت وبرکت سے پہنچا ہے، اسے بھی مابین کی بے اعتمادی اور بے بنیادی کا طعنہ کھاتا ہوا نظر آئے گا، اور تو اور خالق انسانیت کی سرٹیفکیٹ پانے والے گروہ انسانی کی زندگیوں پر نام نہاد تنقیدی نگاہ ڈالنے والے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنائی دے گا کہ ابوبکرؓ وعمرؓ میں خرابی نہیں تو کیا ہوا، مگر ان کا چھوٹا بھائی عثمانؓ (خلافتِ نبوت کا تیسرا علم بردار) کا دامن تو بچ نہ سکا، مگر ان کے پیش رووں اور باپ دادوں میں بہت سوں کی زندگیاں گناہوں میں لتھرائی ہوئی نظر آئیں گی۔

خاشاللہ! اگر وہ مقدس زندگیاں برباد ہوگئیں جن کی قداست پر ہزاروں زندگیاں قربان جائیں بھی تو کم ہیں، تو ہم اپنی آنے والی زندگیاں، ملک ووطن اور ملت کی شاہانہ زندگی کس خاک کے لئے پسند کریں گے؟؟ شاید اس غلامی ومحکومی کی حالت میں ہمیں اپنی زندگیاں قربان کرنی ہوں گی، شاید ہمیں آزادی اور خود مختاری کے نام پر دین کے پیغامات اور روایات سے آنکھیں بند کرنا پڑے گا۔ اس طاقت وسطوت، غلبۂ سلطنت واستیلاء پر اللہ کی لعنت جس کے حصول کی راہ پر ہمیں ایمان وعمل صالح کے تمام سہاروں سے شاید دست بردار ہونا پڑے، اس عزت وناموس اور جلال وجمال کی زندگی پر تف کہ جسے پانے کے لئے اسلام وایمان کی حقیقی ودائمی عزت وعظمت، عصمت وپارسائی کو پامال کرنا پڑے۔

بہر حال سلسلۂ کلام وہاں پر تھا کہ سرزمین ارکان کی روشن تاریخ اور قصہائے دارا وسکندر کے بغل میں اور ایک قصۂ حسرت وتأسف بھی سنانا پڑ رہا ہے، اس زخم کا مزید کرب وبلا یہ ہے کہ وہاں علماء کے لباس میں ایسے چند حضرات میدان پر آئے جن کو نہ علم وکمال سے رشتے ہیں اور نہ تقوی وامانت سے ناطے، اور آج کل علماء کا لفظ بھی اتنا بے محل استعمال ہوتا ہے کہ جس سے ملی مستقبل کی ایک بھیانک شکل وصورت نظروں میں پھر جاتی ہے، اور یہاں کی حالیہ تاریخ کا ایک بگڑا ہوا چہرہ سامنے آنے لگتا ہے، اور مزید حسرت واستعجاب کی بات یہ ہے کہ اگر وہ علماء (اللہ تعالی ان پر رحم فرمائے) سچ میں اس نئے طرز فکر سے ہم خیال ہو کر یہی رول ادا کر رہے ہوتے، (جو آج کل کرنے جا رہے ہیں) تو شکایت مطالعہ و

معلومات کی تحقیق وتجزیہ کی بات ہوتی اور بس، حقیقت میں دل ان باتوں کو ماننا تو نہیں ہے، بلکہ صرف دو وقت کی روٹی کی طمع نے یہ سماں آباد کیا ہے، یہ بے چارے واشگاف الفاظ میں یہ کہتے پھرنے میں کوئی بھی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ دل کے دکھ درد سے نہیں بلکہ پیٹ کی تکلیف سے یہی کچھ ہم سے ہو رہا ہے، معاف کیجئے!۔

ادھر پیٹ کی تکلیف سے ہو یا پیٹھ کی راحت کے لئے کام ان یاران اخلاص کا بن رہا ہے، جنہوں نے یہ لمبی چوڑی بیماری اس ملک کے پورے رقبے میں پھیلانے پر اپنی زندگی کو ہر قیمت میں لگا دینے کا بیڑا اٹھایا ہے، یہ لوگ دین و دنیا کی تمام مشکلات کا حل اس کے عوض ڈھونڈ رہے ہیں، اور اپنے باہر کے مربیوں کو اس سوچے سمجھے گناہوں پر باور کرا رہے ہیں کہ یہ سرزمین آج اس بیج کی قابل ہوگئی، جس کی کاشت کی فکر میں ہم مدتوں سے تڑپتے ہوئے معاشی فلاح و بہبود کے انتظار کر رہے ہیں، وہ بیج ان کی نگاہوں میں کیا ہوا اور کیا نہ ہوا اس سے ہمارا اتنا بھی کام نہیں، جتنا خود اس بات سے ہے کہ ہماری نظروں میں کیا کیا حسن و قبح ہے اس نئی بیج کی، ہماری نگاہوں میں (اور قریب ہے کہ اسلام کی نگاہ میں بھی یہی کچھ ہو) **{کشجرة خبیثة اجتثت من فوق الارض مالها من قرار}** والی حقیقت اس کی زندہ مثال ہے۔

اے نونہالان وطن! یاد رکھو اور کبھی بھول جانا نہیں کہ دین و دولت، عزت و ناموس اور ایمان و امانت کے خالق کی قسم، اس سرزمین ارکان کو وہی پرانی بیج پیاری ہے جس کے قد آور درخت نے کبھی برگ و بار لایا تھا، جس نے عالم انسانیت کو رحمت اور نوازش اور عدل و انصاف کے مہکتے ہوئے پھولوں کا تحفہ دیا تھا، اور پوری انسانیت کے سامنے بلند اخلاق اور سلیقہ من تدبیر مملکت، پرامن خارجہ پالیسی، آب حیات کا سا سدا بہار پیغام زندگی، بے مثال رعایا پروری اور بندہ نوازی، جانبازی اور سپہ گری، پاک بازی و امانت داری جیسے انسانی کمالات کے بلند معیار نمونے پیش کر دکھائے تھے، اور آج بھی ہمارا مسلسل اور بے دریغ دعوی رہا ہے کہ یہ سرزمین اب بھی اپنی قدرتی اور سدا بہار جوانی سے وہ پھل لائے گی جو پچھلے زمانے میں ہر وقت لاتی رہی تھی، دنیا کی گھٹا ٹوپ اندھیاریوں میں چراغ راہ کے کام کرنے میں سرگرم عمل رہے گی۔

اور ابھی کل کی بات تھی کہ اس بیج کے ایک پودے نے اتنا ہی رنگا رنگی اور شان وشوکت کا پھل لایا کہ پورے مشرقی بلاک میں اسلام کے عہد زرین کی یادیں تازہ ہوگئی تھیں، اسلام کی ایک شاخ نے

خاموش اور پرسکون طریقے سے ایسی اسلامی حصاریں قائم کیں کہ جن کی کوششوں کے نتیجے میں انگریز جیسی کل عالم کو نگل جانے والی طاقت کا خاتمہ ہوا تھا۔

اس پودے کا نام قدرت کے سفینے میں ولی اللہی رہا تھا، شاخ و پتے کی بات آپ سمجھ گئے، ادھر شاہ عبدالعزیز و اسحاق کی درس گاہوں میں قال قال کی صدائیں گونجیں تو ادھر سید احمد شہید و اسماعیل کی سپہ گری اور فدا کاری، ادھر میدان شاملی کی شہادت زار ہے تو ادھر علوم و معارفِ نبوت کا لالہ زار، ادھر امداد اللہ، نانوتوی، گنگوہی اور ضامن شہید کی جانفروشیاں ہیں تو ادھر دیوبند کا مدرسہ، تھانہ بون کی خانقاہ، ندوے کا بزم علماء اور نظام الدین کا مرکزِ دین ودعوت ہے۔ امداد اللہ مہاجر مکی، رشید احمد گنگوہی، محمد قاسم نانوتوی، محمود الحسن دیوبندی، حسین احمد مدنی، اشرف علی تھانوی، عبید اللہ سندھی، شبیر احمد عثمانی، محمد علی مونگیری، عبدالحی لکھنوی، شاہ سلیمان پھلواروی، خلیل احمد سہارنپوری، زکریا و محمد الیاس کاندھلوی، ابو الکلام آزاد، محمد علی و شوکت علی ایک ایک شاخ، ایک ایک پتے اور ایک ایک پھل کا نام ہے الگ الگ رنگ و مزے کا، جن کی حیرت انگیز قصے ہم نے اپنے بزرگوں کی زبانی سنے ہیں، اور یہ اس درخت کی بات تھی جس کی شاخ اور پتے آسمان سے تازگی اور زندگی لیتے، اور جس کی جڑیں خالق ارض و سماء کی زمین سے پوری طرح جڑی رہتی تھیں **{کشجرة طیبة اصلها ثابت و فرعها فی السماء}** اور اس شجرہ کی بات چل رہی تھی جس کا ایک سرا آسمان والے سے ہدایت و رہنمائی کا سروسامان لیتے ہوئے معاشرہ کی اندھیاریوں، بے کسیوں اور ظلم و عدوان کے بازاروں میں امن و آشتی اور دین و ایمان کے پیغام سنانے کا کام کرتا رہتا ہے۔

اے عزیزان ملت! آپ کو جذبۂ جہاد و حریت مبارک ہو، نعرۂ اللہ اکبر مبارک ہو، آپ کو سچ میں آزادی و حریت اور سرخروئی پسند ہے تو کس تدبیر سے؟ کس سروسامان میں اور کس مزاج و ماحول سے جڑ کر؟؟ کیا اللہ تعالی کے بھیجے ہوئے رسولوں پر بے اعتمادی اور الزام تراشی کی راہوں سے؟ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے آغوشِ رحمت میں پلنے والے انسانوں کی زندگیوں پر داغ لگا لگا کر؟ علمائے اسلام اور مجددین ملت کی بے لوث خدمات اور کارناموں پر بے سری کی باتیں پھیلا پھیلا کر؟ مدرسوں، خانقاہوں اور دعوتی مشینوں پر جہالت و گمراہی کے طعنے دے دے کر؟ ہرگز نہیں اور قیامت تلک نہیں۔

آپ کو آزادی وحکمرانی چاہئے تو انبیاء، اولیاء، علماء اور صلحاء کے ساتھ رہ کر، ایمان واعتماد سے رشتے جوڑ کر، دعوت وتجدید کے شہ سواروں پر حسنِ ظن اور عقیدتمندی کی شاہ راہوں پر چلتے ہوئے، مدرسوں، خانقاہوں اور دعوتی مرکزوں کی قدردانی کرتے ہوئے، اور ساتھ ساتھ حلقۂ اخلاص وللّٰہیت میں اپنا مقام بناتے ہوئے۔

اپنے اسلاف وملت کے عظماء کے نام ومقام، ایمان وامانت اور تقوی وطہارت سے عدم اعتماد کی بنیاد پر اگر آپ کو اپنے وطن کی آزادی مل بھی گئی تو یہ کس حکمرانی کے لئے؟ انسانیت کی فلاح وبہبود کے آخری نمونوں سے ناطے توڑنے کے بعد ایک آزاد ریاست مل بھی گئی تو یاد رکھنا کہ ریاست کے پیٹھ پر انسانوں کے حلیے میں آپ کو انسانوں کی نہیں بلکہ بھیڑیوں اور درندوں کی بستیاں بسی ہوئی نظر آئیں گی، انسانیت کے حق میں امن وآمان کی جگہ شر وفساد، سفاکی وخون ریزی کی ایک جنگل آباد ہوئی ہو گی، آپ کے مالک ومعبود، آقا ومحبوب کو آپ پر اطمینان کی جگہ تشویش اور پریشانیاں ہوں گی۔

آپ کو ان تمام چیزوں پر اپنے گریبان میں سر رکھ کر سوچنا چاہئے، ورنہ آپ اپنے پیروں پر خود اپنی کلہاڑی کی ضرب سے برباد ہو جائیں گے، اور آپ اپنی آباد زندگانی اور اپنے درخشاں مستقبل کا لہلہاتا ہوا باغ خود اپنے ہی ہاتھوں سے آگ لگا کر ویران کر دیئے ہوں گے۔

تحریکِ آزادی کی جدوجہد بڑی اہمیت والی چیز ہے، کبھی بھی نظر انداز کرنا نہیں! مگر اپنا وہ فرض جو روز اول سے فرض تھا، وہ دم آخر تک فرض ہی رہے گا، وہ ہے ایمان وعملِ صالح کا فریضہ، اور اخلاق و کردارِ بلندی کا فریضہ، وفاداری واحسان مندی کا فریضہ، اسے کس کے سر پر چھوڑو گے؟:

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرم نگاہِ دیدۂ صورت پرست ما است

قومی زندگی کی ان تلخ نوا حقیقتوں پر شاعر کا دل کھولا تھا کہ:

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حسین احمد ابوالفضل

۱۰ / دسمبر / ۱۹۹۰ء۔ چاٹگام، بنگلا دیش۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بلکہ ظلم کو تڑپانے والی شمشیر ہے

اسلام دین ودولت عقیدہ وعمل کا مجموعہ ہے، صبر وشکر، غضب وانتقام اس کے عناصر ترکیبی ہیں، جہاں اسلام اپنے ماننے والوں کو دینیات کی تلقین کرتا وہاں طاقت وسطوت، دولت وسلطنت کی جاہ و جلال کی بھی شناسائی دیتا ہے، اگر یہ فرد پر اولا بالذات ہے تو یہ جماعت وسوسائٹی پر بھی، وہ اسلامی زندگی کا پہلا قدم ہے تو یہ سفر حیات کا دوسرا قدم ہے، وہ سفر ہے تو یہ منزل، وہ عشق ہے تو یہ معشوق، وہ کوشش ہے تو یہ مرام ومقصود۔

تاریخ کے اوراق میں جہاں کہیں بھی اسلام یا مسلمانوں کو ان دونوں پہلوؤں میں زیر وزبر یا اونچ نیچ کا سامنا ہوا، ان کو ذلت وخواری، عزلت وپستی، ناکامی ونامرادی کی کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑا، طاعت وبندگی، صلح وآشتی، امن وعزلت پسندی کا راستہ اپنایا تو طاقت وحکومت ان سے رخصت ہو گئی، جس کے نتیجے میں کبھی بغداد پر تاتار کی یلغار رونما ہوئی تو کبھی اندلس پر جرمنوں کی یورش، کبھی ہندوستان پر برطانویوں کا جابرانہ تسلط ہوا تو کبھی دین وسیاست کی ماکرانہ تفریق کا طلسم۔

اسی طرح سطوت وحکومت، طاقت وسلطنت کا جذبہ وداعیہ جب زور پر پہنچا تو حکومتوں کی جگہ حکومتیں، ظلمتوں کی جگہ ظلمتیں آنی شروع ہو گئیں، آج امویوں کا ستارہ روشن ہے تو کل عباسیوں کا ستارہ بلند، آج ان کی تاج وجبروت تیزی پر ہے تو کل ان کے غضب وانتقام، قتل وغارت، عصبیت و عداوت کا بازار گرم، حد یہ کہ ان میں سے کسی کے ایک بار حکومت کے آنے اور جانے میں لاکھوں جانیں چلی گئیں، سینکڑوں کی عصمتیں مجروح ہو گئیں، اللہ کے حدود کی ایسی پامالی ہوئی کہ جن کی یاد سے انسانیت شرما جاتی، اقلام تاریخ رک جاتے اور دنیا ظلمت وتاریکی میں بدل جاتی ہے، لطف یہ تھا کہ ان قتل وغارت گروں کو جاہلی عصبیت وعداوت، حدود اللہ کی بے حرمتی وپامالی کے لئے خود کتاب اللہ سے سند جواز نہیں بلکہ طمغۂ اعزاز مل جاتا تھا، یوں ان سرخ پنجوں والے سفاکوں کو اور انسان نما درندوں کو کبھی خلیفۃ المسلمین اور کبھی امیر المومنین جیسی خلعتوں سے سرفراز کیا جاتا، اور ہر جگہ ممبروں پر ان کے ناموں کے خطبے بھی پڑھ سنائے جاتے تھے۔

فرد کی عبادت و بندگی جس بلند معیار پر کیوں نہ سہی، جس پابندی و پامردی، اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ کیوں نہ ہو، سوسائٹی کے امن وفلاح کی طرف یک لخت بھی متوجہ نہ ہوکر، حکومت وسطوت، تاج و سلطنت کی طرف ایک نظر بھی نہ اٹھا کر اسلامی زندگی کا جامع تصور کبھی بھی نہیں آسکتا، ایسے انسانی یا اسلامی گروہوں کے ہوتے ہوئے ان عبادت گزار اور وفا شعار قوموں کے رہتے ہوئے وہ مناظر دکھائے دینا عجوبہ نہیں جو آج دنیائے اسلام کے ہر خطے میں کسی کمی بیشی کے ساتھ نظر آرہے ہیں۔

ہندوستان میں مساجد و مدارس کی کوئی کمی نہیں، ذکر و شغل، تزکیہ و تربیت کی خانقاہوں کا فقدان کہاں؟ مگر وہاں انسانیت کے مجازر ہیں برپا، مسلمانوں کی قربان گاہیں سرخ ندیوں کی طرح بہتی جارہی ہیں۔

ادھر کچھ تھوڑی مسافت پر ارکان کی سرزمین پر دیکھئے! جس میں مساجد و مدارس کی تعداد کچھ کم نہیں، تعلیم و تربیت اور تزکیۂ نفس کا مشین چنداں سست نہیں، عابدوں اور زاہدوں کی بڑی کثرت ہے، صلحاء کی جماعت میں کسی بھی طرح کی گراوٹ نہیں، مگر یہاں کے مسلمانوں پر وہ سب کچھ بیت رہا ہے، جو تاریخ میں کسی قوم پر شاید بیتا ہوگا، مسلمان ان تمام مظالم کے شکار ہیں، جن کی مثال تاریخ میں ملنی مشکل ہے، کبھی مسجدوں پر تالے لگائے جاتے، کبھی مدارس اسلامیہ پر غضب ڈھایا جاتا، کبھی کلام الٰہی کے اوراق نذرِ آتش کئے جاتے تو کبھی شعائر دینی کی بے حرمتی کی جاتی ہے، کبھی مسلم کنواریوں کی عصمتیں پامال کی جاتیں تو کہیں معصوم شیر خوار بچوں کی لاشیں راہوں میں تڑپتی ہوئی دکھائی دیتیں، مگر کسی پوچھنے والے کی ہمت بھی نہیں ہوتی کہ یہ کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔

اسلام سے قبل بلکہ متصل قبل ہم دینِ سماوی کو دیکھتے ہیں، جس کے پیروؤں نے دین سے چند عبادت و عقائد کا مجموعہ پکڑ لیا تھا اور خاموش، ان میں تھوڑے دنوں بلکہ بہت تھوڑے دنوں کے اندر مذہب و دین کا نام و رسم کے سوا اور کچھ نہ رہ پایا، چلتے چلتے رسم پر بھی ظلمت کا بادل اتنا چھایا کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ان کے لائے ہوئے دینِ حقیقی سے دنیا ایسی ناآشنا ہوگئی کہ پورے کرۂ ارضی میں صحیح مذہبی خط و خال سے واقف کار کوئی انسان موجود نہیں تھا، دینِ مسیح کے مؤرخین عموماً اور حضرت سیدنا سلمان فارسیؓ کے اسلام لانے کے واقعہ لکھنے والوں کی تحریریں خصوصاً اس بات کی بین دلیل ہیں کہ عموریہ کے پادری حضرت سلمان فارسی کو یہ کہہ دیتا ہے کہ ”تم میری موت کے بعد کوئی مسیحی

عالم نہیں پاؤگے جو دینِ مسیح کے واقف کار ہو اور تم اپنے لئے وہی راہ اختیار کرنا جو میں تمہیں بتا دیتا ہوں“۔

مسیحی قوم ایسی پست اور ذلیل ہوگئی کہ قرآنِ حقیقتِ ترجمان کی زبان میں {**ضربت علیهم الذلة والمسكنة**} والی حقیقت اس کے مقدر بن گئی، اس کے بعد یوروپ میں علم و عقلیت کا سیلاب آیا، تحقیقات و انکشافات کا شور مچا، تو ان کے پاس دین کے نام پر جو چیز تھی، اس نے ان لال چھڑیوں کی رہبری اور دستگیری تو کجا بلکہ ان کے ساتھ چلنے تک کی ہمت نہیں کی (جو دراصل مذہبی روایات و عقاید و عبادات کا ایک مجموعہ بن کر رہ گیا تھا) مذہب و عقلیت کا معرکہ اور کشمکش کا زمانہ خاصا طویل گزرا، بالآخر سائنس اور تجربیات کی فتح ہوئی اور دین و مذہب کو شکست سے دوچار ہونا پڑا، آج آپ مسیحی قوم کو صاف دو گروہوں میں بٹی ہوئی دیکھیں گے، مذہبی گروہ کہ جس کا خیال اور نعرہ یہی ہے کہ دین و دنیا میں کوئی بھی واسطہ نہیں ہے، کلیسے میں ہوتے ہیں تو اللہ کے بندے ہیں اور دین کے پیرو ہیں، آپ وہاں سے باہر نکلتے ہیں تو کسی کام کے نہیں ہیں، اور جو وہاں سے دنیا کے لئے نکلے وہ ان کی نظر میں عبد الدنیا یا عبدالشیطان بن کر رہ گیا ہے۔

دوسری طرف علم و عقل کے دعویداروں کی نظر میں مذہب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ قدامت پرست یا رجعت پسند بن گئے، وہ لوگ قدامت پسندی یا رجعت پسندی کا طعنہ کھا کر مجروح اور مایوس ہو گئے، ان عقلیت پسندوں کے یہاں مذہب ہے تو سالانہ یا ماہانہ کسی مذہبی تقریب کا نام ہے، اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں، یہ دنیا بس دنیا داروں کی دنیا ہے، بس کھاؤ پیو اور مزہ لو کی دنیا ہے۔

بہر حال ہم یہاں اتنی سی بات کہہ دینا چاہتے ہیں کہ مذہبِ اسلام دین و دولت، عبادت و حکومت کے مناسب امتزاج سے عبارت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اس حسین امتزاج کا عالم برپا تھا، خلفائے راشدین کے مبارک دور میں اس کی وسعت ہوئی تھی علم و عمل کا، عقل و مذہب کا، عبادت و حکومت کا، یہاں بلا کسی بھی کم و کاست، بلا کسی بھی اونچ نیچ، بلا کسی بھی قلت و کثرت اسلام ہی کا نعرہ بلند رہا تھا، دنیائے جاہلیت اسلام کے سامنے ہار چکی تھی، اور تمام غیر اسلامی طاقتیں اسلام کے سامنے لرزہ براندام تھیں، جاہلیت کے تمام علم بردار اور تمام عناصر واپسیں کے سانس لے رہے تھے۔

جوں جوں اس الٰہی امتزاج فطری میں کم و بیشی کا امتزاج آتا گیا، اسلام کی شوکت و طاقت میں

زوال وانحطاط کا دھبہ لگتا گیا تھا، چلتے چلتے مسلمانوں میں وہ حسین امتزاج تو کجا عقل و مذہب میں، روح و مادے میں، عبادت وحکومت میں ایسی مسافت حائل ہوگئی جیسے ان دونوں کے درمیان بعد المشرقین ہو، مسلمان کہیں روحانیت کی دنیا میں بسنے شروع کئے، کوئی مادیت کے منکر بن بیٹھے، اور کہیں مادیت کے علم برداران مسلمانوں کی جماعت میں نکل گئے، کوئی روحانیت سے بے زار بن بیٹھے، الغرض خود مسلمانوں میں وہی کشمکش برپا ہوگئی جس طرح ان کے پیش رو مسیحی قوم میں برپا تھی، یوں مادیت کی جیت کی شکل میں روحانیت والے مسلمان مادیت کے شکار ہوگئے، کاش کہ روحانیت کی فتح ہوتی تو مادیت کی ہار ضرور ہوئی ہوتی، روحانت کی فتح ہوتی تو مادیت کے علم برداروں کی شکست ہوجاتی۔

ظاہر ہے کہ اسلام نہ مادیت محض کا نام ہے اور نہ روحانیت خالص کا، مسلمان نہ مادیت کے عاشق زار ہوسکتے ہیں اور نہ روحانیت محض کا علم بردار، مسلمان نہ عباد الشیطان ہوسکتے ہیں اور نہ عباد البطن و الشہوات ہوسکتے، ہم آج کے مسلمانوں کو کبھی روحانیت کی خانقاہوں میں دیکھتے ہیں جو انکار مادے کے فریضہ انجام دیتے، اور کبھی مادیت کی دانش گاہیں اور ان کی گزرگاہیں ہوتی ہیں جن کا فریضہ روحانیت پر ہزار الزام تراشنا ہوتا ہے، روحانیت پر ہزار الزام تراشنے والی فکر وعقل ان دلوں میں طوفان مچادیتی ہے، لسان العصر اکبر مرحوم نے اس منحوس کشمکش کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے کہ:

ادھر یہ ضد ہے کہ لیمون بھی چھو نہیں سکتے
ادھر یہ رٹ ہے کہ ساقی صراحئ مئے لا۔

آیئے! ہم پیغمبر اسلام کی وسعتِ دلی اور آفاقیت والی تعلیم کی طرف نگاہِ عبرت اٹھائیں، جہاں وہ اپنی زبانِ حقیقت ترجمان سے عبادت و بندگی، ایثار وقربانی کی تعلیم دیتے تو وہاں غبارِ راہ صاف کرنے کی آگہی بھی کرتے اور جاہلیت سے لڑنے اور شیطان وطاغوت کو زیر کرنے کی تعلیم بھی پیش کرتے ہیں، جہاں وہ انابتِ الی اللہ اور فنا فی اللہ کے بیانات پیش فرتے تو وہاں طلبِ رزق حلال اور علمی وتجرباتی ترقیات کی تلقین بھی فرماتے ہیں۔

آیئے! ہم آج قرونِ اولی کی زندگی کی طرف نظر دوڑائیں، جس میں مسلمان قافلۂ حیات سے

صرف نہ بھٹکنے کے لئے نہیں بلکہ راہِ حیات کی قیادت وامامت کے لگام سنبھالنے کے لئے اور اپنے اندر خوبیوں کو پیدا کرنے کی فکر میں گام زن تھے، ادھر مسجدِ صفہ کی تعلیم گاہ ہے تو ادھر لشکرِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ٹریننگ گاہ میں مصروفِ عمل، ادھر امن وآشتی کی تلقین ہے تو ادھر حق واصحابِ حق سے گستاخانہ حرکات کو زیر کرنے کی رزم گاہ، ادھر {**و اذا خاطبهم الجاهلون قالوا اسلاما**} کی توصیف ہے تو ادھر {**فمن اعتدى عليكم فاعتدو عليه بمثل ما اعتدى**} کی تربیتی اسپرٹ، ادھر آسمانِ ایمان و ہدایت کی بارشیں برستی دکھائی دیتی ہیں تو ادھر لشکروں کی جماعت میں {**الی عباد اللہ، الی عباد اللہ**} کی آوازیں بلند کرنے والے کمانڈرز۔ادھر امن وآمان میں {**صل من قطعک واعف عمن ظلمک**} کی صدائیں بلند رہتی ہیں تو ادھر میدان جنگ وجدال میں بارش سے بھی زیادہ برسنے والی تیروں کی برسات اور نیزوں کے ذریعے دشمنوں کی طرف بڑھتے جانے کی ہمت وطاقت کا کرشمہ۔

آیئے! ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو اپنائیں، اور اپنائے جانے کو نکلیں، ابوبکرؓ نے اپنایا تو صدیق بن گئے، ابن الخطابؓ نے اپنایا تو فاروقِ اعظم بن گئے، عثمان بن عفانؓ نے اپنایا تو ذی النورین کی خلعت پائی، علی بن ابی طالبؓ نے اپنایا تو اسد اللہ الغالب کا لقب پایا۔

ہمارا نبی صلی اللہ علیہ وسلم مذہب وعقل کا نبی تھے، حکومت وبندگی کا نبی تھے، رزم وبزم کا اور خلوت و انجمن کا نبی تھے، صلح وجنگ کا رہنما تھے، روح ومادے کا ترجمان تھے، سائنس وتجربات کا سرچشمہ تھے، وجودِ کائنات کے اسرار سربستہ تھے، یتیموں کا والی اور غریبوں کا ماوی تھے، باطل پر برسنے والی بجلی تھے، طاغوت پر مچلنے والا طوفان تھے، ظلم پر تڑپنے والی چیخ تھے اور ظلم کو تڑپانے والی شمشیر بھی۔

حسین احمد ابوالفضل

چاٹگام۔ بنگلادیش۔

بس اللہ الرحمن الرحیم

ملتِ عزیز کی یاد پر

محترمی ومکرمی!   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،

اللہ تعالی آپ کا بھلا کرے،اور ہم یتیمانِ سیاست کو اپنی ملت کی یاد پر دو قطرہ آنسو بہانے کی توفیق ہوجائے۔

ساحل مشرق کی وہ سرزمین جس کی یاد میں ہم آپ کو دو قلم لکھنے بیٹھے ہیں،کہیں صدیوں تک آباد سرزمین رہی ہے، جہاں عرب جہاز رانوں کے تجارتی قافلے آتے جاتے اور دینِ حنیف کی دعوتِ حق کے ذریعے یہاں کی آبادی کو چمکاتے چلے جاتے تھے۔

اسلام کی صبح صادق کا زمانہ تھا کہ یہ سرزمین نورِ اسلام سے چمک چکی تھی،اور یہاں اسلامی تہذیب و ثقافت کی خوش گوار فضا قائم ہوچکی تھی،کبھی یہ نور اسلام چمکتے چمکاتے معاشرہ کی نچلی دیواروں سے ٹکرا کر ایوانِ حکومت کے بلند و بالا محلوں تک کو جگانے جایا کرتا تھا،کبھی مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں کی پرشکوہ عمارتوں پر اپنا نشیمن بناتا اور شانِ گدائی کے عہدِ کہن کی یاد دلاتا تھا کہ:

{بدأ الاسلام غریبا و سیعود کما بدأ}

کبھی اس نورِ اسلام کی تاریخ پر مد کا زمانہ چلتا تھا کہ وہاں کا سلطانِ وقت بھی اسلامی علوم وتہذیب تو کیا؟ بلکہ پوری طرح اسلامی مزاج و ماحول اپنانے میں نازاں معلوم ہوتا تھا،اور کبھی اس طویل تاریخ پر جزر کے زمانے بھی گزرنے کی داستانیں ہم اپنے اوراق پریشان سے کھوج نکال پاتے ہیں،مگر کفر و اسلام اور نور وظلمت کی اس پر پیچ کشمکش میں کبھی ایسا دن نہیں دیکھا گیا کہ اسلام کی روشنی اور ضیا پاشی سے یہ سرزمین یک سر خالی ہوگئی ہو،اور یہاں کفر وضلال کا راج پوری آن بان سے قائم ہوچکا ہو۔

دنیا کی دوسری سرزمینوں کی طرح سرزمین ارکان نے اپنی زندگی میں نور وظلمت، عروج وزوال اور کفر واسلام دیکھا ہے، تاہم کفر واسلام کے اس نشیب وفراز اور مدو جزر میں اس نے کبھی بھی گم نامی اور بے مایگی کے ساتھ خاموش ورق گردانی نہیں کی ہے،نور چمکا ہے تو کبھی خاموش نہیں چمکا، پاکیزہ اور مقدس خون گرم کا ایک قطرہ بھی زمین کی فطری پیاس بجھانے کو نہیں پڑا، یہاں ظلمت واندھیاری کو

شانِ حکمرانی نصیب ہے تو تب بھی حق اور اصحابِ حق کے قافلے ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش نہ رہ پائے تھے،مصیبتوں اور مظالم کے پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑے تو وہ خاموش نظارہ نہیں کر پائے، یقینا ہمیں تاریخ کی حق گو زبان سے یہ واقفیت ملی (فطری اصول اور دنیا کی قدیم تاریخ کی شہادت بھی اس سے خاصی ملتی جلتی ہے) کہ ملت اسلامیہ کے جانبازوں کی ہزاروں جانیں اس ظلمت و اندھیاری کی مخالفت میں گئیں، سینکڑوں عصمتیں مجروح اور پامال ہوئیں، شانِ توحید و رسالت کے لاکھوں پہلوانوں نے اس دنگل میں نکل کر جان جانانِ آفرین کی راہوں میں قربان کردی،جن کے مقدس خونِ شہادت کی برکت سے یہ خانہ آباد ہے اس موسم خزاں کی تہ و بالا فضا کے آنے تک، کفر واسلام کی اس بھیانک کشمکش کے ایام آنے تک،اور اس عہد جور و جفا کی یاد کے اس لمحے تک۔

یہاں کبھی آذانِ سحر کی صدائیں بھی گونجتی رہی تھیں، کہیں قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے غلغلے اور شور وغوغا بھی برپا تھے،اور کہیں زاغ وزغن کی آوازیں بھی کان سے ٹکرائی تھیں،اور کہیں اس دینِ ابراہیمی کے نئے نئے خون کے قطرے برسے تھے تو کہیں کلیجے کے ٹکڑے کردینے والی طاقت کے طوفان بھی مچے تھے۔

آج سے کوئی نصف صدی کا زمانہ تھا، اچانک یہاں کے مسلمانوں پر ظلمت کا سب سے بڑا پہاڑ ٹوٹ پڑا،اس امت پر جو اپنی کیفیت ونوعیت میں تاریخ قدیم کی تمام ظلمتوں اور مصیبتوں میں اچھنبی اور بھیانک قسم کی ظلمت تھی،اور ظلمت کیا تھی؟ ہماری قوم کی حریف یا متحارب قوم کے (جو کفر وضلال کی علم بردار تھی) ہر فرد فرد کے قلب پر ایک نئی قسم کی روح چھا گئی اسلام اور مسلمان دشمنی کی، دیہاتوں سے قصبوں تک، قصبوں سے شہروں اور ایوانِ حکومت کی درو دیواروں تک، اس بادِ صرصر نے ہر کجا عداوت وانفجار در انفجار کا طوفان گرم کردیا تھا، پہلا ہم اہل تزکیہ پر اس دھب سے ہوا کہ ہم سنبھلنے نہ پائے تھے،ہمیں زمام حکومت سے دستبردار کردینے کی اسکیم تیار کی گئی،ہمیں کبھی وزارت کے عہدے سے معزول کردیا گیا تو کبھی قومی پارلیمنٹ کی مؤقر مجلس سے ہمارے قدم اکھاڑ دیئے گئے تھے، یہ ساری سازشیں بغض وعداوت کی تمام داستانیں صرف اور صرف ایک ہی جرم پر تھیں کہ ہم مسلمان ہیں، ہم اپنے دین وایمان کی روح رواں سے بچھڑ جانے والے نہیں ہیں، ہم اپنے اسلاف کی لائی

ہوئی اس میراث پر فخر کے ساتھ موت و زیست کی جنگ لڑنے کو تیار ہیں {و ما نقموا منهم ان يو من بالله العزيز الحميد}

وقعہ یہ ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے ایوانِ حکومت کے زرق و برق لباس ہم سے اتار دیئے گئے، اور بات یہاں تک پہنچی کہ ہمیں اپنے تمام حقوق شہری و سیاسی سے یک سر محروم کر دیا گیا، یہاں کا ماحول کچھ ایسا ہو گیا کہ ہماری معاشی، معاشرتی، سیاسی و مذہبی تمام شکایات اور اربابِ حکومت کے بلند و بالا محلوں کے درمیان کوئی صدیوں کا فاصلہ حائل ہو گیا، یوں ہم بے دست و پا ہو کر رہ گئے، نہ موت کے کنارے سے ہم گزر سکتے ہیں، کیوں کہ وہ ہمارے بس کی بات نہیں، اور نہ حیاتِ زندگی کے سانس لے کر تازہ و زندہ رہ سکتے ہیں:

بال و پر ٹوٹے ہوئے پرواز کی طاقت نہیں
تاک میں صیاد ہے گلشن کی دیواریں بلند

مگر ہماری طاقت کوئی مٹنے والی طاقت نہیں، جو ہمیں اپنے اسلاف سے میراث میں ملی تھی، جسے ہم نے اپنے سینے سے لگا کے آیا تھا، یہ ایک چراغ تھا جسے پھونکوں سے بجھانے اور بجھنے والا نہیں تھا، باطل کی تنگ و تاریک نگاہیں اس ناموسِ فطرت و حقیقتِ غیب کو تاڑنے سے عاجز آ گئیں، ہمیں مٹانا چاہا تو ہم اور بھی ابھر پڑے، ہمارے خاتمہ کی فکر کو نکلے تو ہم خود ان کی موت و حیات کی تاریخ لکھنے اپنے لوح و قلم سے نکلے ہیں ہاتھوں میں ید بیضاء لے کر:

{فاما الزبد فيذهب جفاء}

دوسری طرف بلا کیا تھی؟ وہ بھی ملاحظہ کیجئے! جس سے ہمیں بلا اندر بلا کی مثال یاد آ جاتی ہے، کبھی تاریخ کی ان بوقلمونی کو دیکھ کر ہمیں وہ جن میراث کی وجہ سے ٹکرا رہے تھے، یا جن جرائم کی پاداش میں ہماری یہ درگھت تھی، وہ صرف اور صرف کلمۂ حجازی یا رہنمائے حجازی کی نسبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھی، ہمیں تجسس یا انتقام کو نکلنا تھا، مگر ہم نہیں نکلے، اس کارِ خیر یا نا کردہ گناہوں کے مجرم اول، یا ان حضرات کا قافلہ جسے ان جرم بے گناہی پر اولیت حاصل ہے، یا دوسرے الفاظ میں حاملینِ مشعلِ ایمان و ہدایت یا قافلۂ سالارانِ اہل توحید یعنی علمائے کرام (اللہ تعالی ہمیں معاف فرمائے) یعنی وہ

حضرات جو حاملینِ لوائے مصطفوی تھے وہ خاموش، عزلت پسند اور اس معاملہ سے کنارہ کش نہیں بلکہ اس حیات سے ایک گونہ بے زار ہیں، آخر ان حالات میں میدان میں آئے تو کون آئے؟ کون آئے اسلام کے نام پر؟؟ البتہ کچھ مردان جذبۂ ایمان تو آئے، لیکن کام جس اہمیت و چابکدستی کا تقاضا رکھتا تھا، اور رجالِ کار میں جن اوصاف و کمالات کی ضرورت تھی، ان سے وہ یک سر بے گانہ بلکہ نا آشنا تھے، کام شروع ہوا تو الحمد للہ، نہ ہونے سے کچھ ہونا ہی بہتر۔

مگر ان جانبازوں کا قافلہ گذشتہ ادوار کی طرح اس بار بھی دنگل میں نکلا جس آن بان اور شان و شوکت سے تھا وہ بالکل نہیں ہو پایا، اگر یہ قافلہ آگے بڑھ رہا ہوتا تو آپ اور ہم یہاں بیٹھے مسکنت کی زندگی سے دو چار نہیں ہوتے، اور ہم عہدِ قدیم کی طرح اسلام اور نورِ ایمان کو پھر سے ہماری سر زمین کے بالا خانوں پر، بلند مناروں پر، پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکتا اور چمکاتا ہوا ضرور دیکھتے، مگر جو ایک قدم آگے گیا تو دو قدم پیچھے ہٹ گیا ہے۔

ہماری ہزار سالہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہماری اپنی غفلتوں اور ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے (جن کی ایک طویل روداد اور لازوال داستان ہے) ہماری یہی درگھت ہوئی ہے، تاہم یہ ایک خوش آئین بات ہے کہ ہمیں آج کسی سمت کی طرف کس منہاجِ زندگی اور زادِ راہ لے کر رختِ سفر باندھنا ہے، اس سے ہماری قوم پوری طرح نہ ہو تو کسی طرح آشنا ہو گئی ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے اپنی قومی زندگی میں دوست کو دوست سمجھ کر اور دشمن کو دشمن جان کر سفر کرنا نہیں سیکھا، آج الحمد للہ ہم مجموعی طور پر اتنے بیدار ہو چکے کہ دوست اور دشمن میں فرق کر سکتے ہیں، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر دشمن اور دوست کے تمام امتیازات اور استثنائیات سے واقف کار ہو چکے ہیں، ہمارے قدم آگے بڑھے تو دنیا ہم سے آشنا ہو گئی ہے، جب کہ اس سے پہلے دنیا سے ہم یک سر بے خبر اور وہ ہم سے سراسر بے آگاہ تھی، آج ہم اتنے آگے بڑھے تو واقعتہ ہم یتیمانِ دین و ایمان کے لئے ایسی برادری بھی آنکلی جو ہماری حالت زار پر کان دھرتی اور ہماری آواز سے آواز ملانے کی تمنائیں رکھتی ہے، اور:

{فامددناهم بسبعة آلاف من الملائكة مسو مين}

کا عالم اس پر مستزاد ہے، جس ہی کی امید پر ہم جیتے ہیں اتنے دنوں تک، اور اگر اللہ تعالی کو منظور ہے تو

آنے والے دنوں تک اور قیامت تک، ترجمانِ حق وصداقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ہم نے سنی ہے کہ:

{وجعلت لی الأرض کلها مسجدو طهورا}

ادھر ہمارے میدانِ کار میں نکلنے کا زمانہ شروع ہو رہا تھا کہ ہم زمام حکومت سے معزول ومحروم تھے، مگر عام شہری حقوق سے کسی قدر بہرہ ور تھے، نئے نئے آئین (کالا قانون) بنانے شروع ہوئے تو رفتہ رفتہ دوسرے پھر تیسرے درجے کے شہری ہمیں بنایا گیا، آج کل کے زمانے میں جب ہم آپ سے مخاطب ہیں،، ہم چوتھے درجے کے شہری حقوق کے انسان ہیں، تازہ بننے والے قانونِ شہریت (سیٹیزن شپ لا) کی رو سے آپ پہلے فیصل کریں مقدمے کا، پیچھے ہٹنا دو قدم کا تھا یا کچھ اور ۔۔۔؟ ادھر میں ایک طرف ہمارے زوال اور پستی کی خبر دے رہا تھا، تو دوسری طرف ہمارے عروج اور پیش قدمی کی اس متضاد سمتِ سفر کو لے کر قدم ہمہ گیر انقلاب کی راہ پر گام زن کرنے کے لئے آپ سے چند کلمات کی گزارش ہے کہ:

امید وبیم کی اس پر پیچ کشمکش میں، راحت ومصیبت کی ملتی جلتی ذہنی ساخت لے کر ہمیں کچھ کرنا ضرور ہے، ہماری امیدوں کا سہارا، زندگی اور زندہ روی کا ناموس اکبر تو ہے: **{انهم لمنصورون وانا جندنا لهم الغالبون}** اور **{وما یعلم جنود ربک الا هو}** اور پھر **{لأغلبن أنا ورسولی}** کا نعرۂ فطرت نے اپنا پیغام سناتا نہیں تھکتا، اور ہم رجال کار کے اوصاف وکمالات پر نگاہِ فکر واعتبار رکھ کر، او پردۂ غیب کی دستِ جود وسخا کی طرف دامن پھیلا کر آج میدان پر آتے ہیں تو رہنمائی اور دست گیری کے لئے عرش والے سے صدائے مکرر ہے کہ:

{هل من مستنصر فأنصره هل من مستجیر فأجره}

اب ایمان ویقین کے تمام التزامات اور استثناء ات لے کر، اپنے وطن اور اپنی قوم کی تمام داستانہائے نو وکہن کو سامنے رکھ کر چند ایسے اہل دل ودماغ کی جمعیت کی ضرورت ہے، جس پر فاطر کائنات کا قانون رضا اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ورضا کی دولت یک جا کرنا ممکن ہو، اور ایک ایسے جان نثاروں کی جماعت ہونی چاہئے کہ:

بر کفے جامِ شریعت وبر کفے سندانِ عشق

وہ کم سے کم اتنے حوصلے کا مالک ضرور ہو کہ موت کو کسی آغاز کا انجام اور خاتمہ کا نام نہ سمجھے، بلکہ یہی سمجھے کہ موت بہت بڑی طویل داستانِ زندگی اور تاریخ حیات کی نگارشِ خوش گوار کا پہلا باب ہے، جہاں سے گزر کر مومنینِ صادقین کی اصل زندگی اور لطف وکرم سے بھرپور زندہ وتابندہ زندگانی کا پہلا دروازہ ہے، ایسی ایک جماعت جس کے سامنے سرسبز وشاداب جنت ہو۔ اور یہ بھی ضرور ہے کہ مومن کے ساتھ قاہر وقادر کا قدرتی ہاتھ ہوتا ہے، اس حوالے سے ارشادِ باری ہے کہ:

{ومارمیت اذ رمیت ولکن الله رمی}

اور مومن ہر آن زندہ ہوتا ہے، جب کہ کافر ہر آن مردہ اور جماد، اور مومن کی ساری جانبازی اور جان سپاری تصویر ہے اس حقیقت کی کہ: **{رجال صدقوا ما عاهدو الله علیه ومنهم من قضی نحبه ومنهم من ینتظر}** اور ع:

ہم تو جیتے ہیں تو جنگوں کی مصیبت کے لئے۔(۱)

حسین احمد ابو الفضل

ڈھاکہ، بنگلا دیش۔

---

(۱) دراصل مولانا حسین احمد صاحب کا یہ ''ملتِ عزیز کی یاد پر'' مضمون حضرت مولانا محی الدین خان صاحبؒ آڈیٹر ''مدینہ'' کے نام لکھا گیا ایک مراسلہ ہے، جسے آپ نے ڈھاکہ کے ایک ہوٹل میں سپرد قلم کیا تھا، جس کا ایک بوسیدہ سا مسودہ راقم کے ایک ذاتی فائل میں محفوظ تھا، جو آج ناظرین کے سامنے ہے(مرتب)

نواں باب

(مختلف شخصیات کے نام مولانا حسین احمد صاحب کے چند خطوط)

مراسلہ نمبر (۱)

قدسی صفات حضرت اقدس دامت برکاتہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

یہاں قدرِ میسر خیریت ضرور ہے، حضرت کا کیا کہنا؟

ذاتی طور پر یہ میری پہلی پیشی ہے میرے خیال میں، یہاں حضرت کے حوالے سے کام تو جہاں تک ہورہا ہے قابلِ توجہ ہے، مگر علماء کی عموماً اور حضرت کی خصوصاً برائے نام یاد کی جارہی ہے، بلکہ اس عنوان وانداز کی یاد جو مستقبل میں علماء کے نام پر کام کرنے والوں کی راہ پر رکاوٹ سی کھڑی ہوگی، اور جہاں ان سابقہ کارکردگیوں کی وجہ سے عوام مایوس اور برگشتہ ہو چکے ہیں، ہم سے بھی ہاتھ دھرے بیٹھنا بعید از قیاس نہیں۔

حضرت کی توجہ ضرور اس جانب مبذول ہورہی ہوگی، تب بھی حالات پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر دو ایک جملے لکھ دینے کی ہمت کررہا ہوں، صحیح معنی میں اس وقت کام کی گرانی ہے، کام کرنے والوں کی لازوال اہمیت دوچند سہ چند ہو چکی ہے، اس موسم گراں کا کام جس پر اہمیت کا چاند لگا ہوا ہے، بکھرے ہوئے چند جملوں سے کہہ دینا کوئی آسان کام بھی نہیں ہے۔

دوسری جانب اس موضوع پر حضرت سے گفتگو ضرور کی جانے والی ہے، اور میں بھی بذاتِ خود باریا

بی کی امید ضرور باندھتا ہوں، باپ بیٹے کے درمیان کی یہ پہلی گفتگو ہے، یقین رکھتا ہوں کہ پدرانہ شفقت اور قصہ کی نزاکت کام کرتی رہے گی۔

مولوی راغبؔ جن لوگوں کو کام میں لا رہا ہے، وہ ضرور ناکافی، نامکمل، نامناسب اور غیر موضوعی ہیں، آپ ضرور نظر فرمارہے ہوں گے، دوسری طرف جن لوگوں کا گلہ ہے وہ ملاقات کررہے ہوں گے، آپ ضرور ملاحظہ فرمائیں گے، ذاتی طور پر میرا سب سے بڑا دکھ یہ ہے کہ کام کسی کا ہو اور نام آپ کا، یا مضامین کسی کے اور سرخی آپ کی، والسلام۔

حسین احمد ابوالفضل

۱۷/ آگست/ ۱۹۹۸ء۔ چاٹگام، بنگلا دیش،

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۲)

حضرت مخدومی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

اللہ تعالی آپ کی صحت وعافیت میں برکت وعنایت فرمائے، اور ہم یتیموں کے سروں پر آپ کے پرلطف سایہ کرم فرمارہے۔

میری بگڑی ہوئی زندگی کا یہ دوسرا پیش کش ہے عزیزانہ ونیازمندانہ، ہوسکتا ہے کہ یہ سلسلہ کسی دور رس اور بارآور انجام کا آغاز ہوگا۔

کام کی فضا اپنی حد انتہا تک بگڑ چکی ہے، چند دنوں سے لوگ ایک نیا دور آزمانے جارہے ہیں، علمائے دین میدان میں آنے کے بعد خصوصاً آپ کے سایۂ عاطفت کی ضوفشانی دیکھ کر، مگر بہت ہی تھوڑے دنوں میں وہ آخری امیدوں کا سہارا اور بھی اپنے دم واپسیں لے کر رخصت چاہ رہا ہے۔

حضراتِ علمائے کرام کے علاوہ دوسری تیسری قیادتیں تو الحمد للہ کہوں یا ماشاء اللہ کبھی ''ساقی صراحئ مئے لا'' کا زندہ قرینہ ہوجاتیں، کبھی اپنا مستقبل اور قومی ترقی تو کجا بلکہ اپنی پیاری زندگی تک سے مایوس ہوجاتی دکھائی دیتیں۔

پستو زبان والوں کی عالم گیر ترقیاں دیکھ کر آج کی دنیا پوری طرح اسلامی قیادت یا کم سے کم اسلام

کے نام سے اٹھنے والی قیادت کی متمنی اور دل دادہ ہوگئی تو یہ بے چارے جائے کہاں؟

دن ہمارا ہی تھا، مگر ہم اپنا ہی بگاڑ رہے، ہم اپنا موقف اور فرضِ منصبی سے یک قلم بے گانہ و نا آشنا، قوم و ملت کی آنے والی زندگی اور بننے والی تاریخ سے پوری طرح بے گانہ، ہمارے آج اس پر پیچ موضوع میں امیدوں کی خزاں چھائی ہوئی ہے، اندھیری فضا میں قدرت کی فیاضی اور بندہ نوازی ہی پر کامل ایمان رکھ کر بھی رفقائے کار کی گرانی کا احساس کرتا رہتا ہوں، حضرت سے رہنمائی چاہتا ہوں اور دعائے فکر عمل بھی، موافق یا مخالف تمام بادہائے تیز و تند سے برادرم الحاج مولوی محمد حسین کی زبانی واقف حال ہوئے ہیں، خدا کرے کہ ملک و ملت کی بننے والی روئداد میں حضرت کی دستِ کیمیا گر اپنا جوہر دکھلاتی رہے، والسلام۔

آپ کا مخلص عزیز

حسین احمد ابوالفضل

۲۲/۱۲/۱۹۸۹ء

نوٹ: مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کی جانب سے مرقومہ بالا مراسلہ نمبر ایک اور دو بنام حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزویؒ (خلیفہ و مجازِ بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) ہیں، جن میں اشارے اور کنایے والے الفاظ اور جملے تراشے گئے تھے، کیوں کہ ظاہر ہے کہ اس زمانے اور بعد میں بھی شاہ مظفر احمد صاحب اندرونِ وطن تھے، جو آئے دن برمی حکومت کی طرف سے ممکنہ آنے والے خطرات کا سامنا کر رہے تھے۔ کیوں کہ یہ اس زمانے کی بات تھی کہ حضرت کے نام پر دریائے ناف کے اس پار کچھ لوگ مولانا محمد حنیف راغبؔ ارکانی صاحب کی سرکردگی میں ''مشائخ اربعہ'' کے عنوان سے کام کر رہے تھے، جن کے بیان کے مطابق شاہ صاحب سب سے نمایاں کردار تھے' وطن عزیز ارکان کے حوالے سے سیاسی و انقلابی سرگرمیاں کر رہے تھے، ویسے مولانا حسین احمد صاحب اسی دوران بعض اسباب کی وجہ سے کہ جن کی قدرے تفصیلات اس کاوش میں دیکھی جا سکتی ہیں مولانا راغب اور ان کی تنظیم کے سخت ترین مخالفین میں تھے، جن کی شکایات کچھ دبے ہوئے الفاظ میں مولانا کے ان دونوں مراسلے میں دیکھی جا سکتی ہیں، تاہم یہ ایک الگ بات ہے کہ ان شکایات کی تفصیلات پر جاؤں تو ایک طرف اندیشہ ہے کہ بڑی حد تک یہاں بدمزگی پیدا ہو جائے گی تو دوسری طرف تلخیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جائے گا، جو اس عجالے میں ہم نہیں چاہتے۔ (مؤلف)

مراسلہ نمبر (۳)

امتِ مرحوم کے برمحل اور حسبِ حال امیدوں اور تمناؤں کی اجالی کرن برادر عزیز و محترم اعجاز الحق صاحب بارک اللہ فیہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

ہم آپ کے اسلامی برادری کے چند اراکین، سرزمین ارکان (برما) کی خونیں داستان سہنے والی مسلم اقلیت کی انقلابی سرگرمی سے نسبت رکھنے والی ایک جماعت ہیں، بس آپ کی تشریف آوری کی خبریں ہمیں یہاں تک لائی ہیں، تین دن کا یہ مختصر دورہ جو مسلسل اور گرما گرمی کے زد میں ہوگا، ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کی (گو مختصر سہی) زیارت و سعادت کا موقع نہ پا کر یہ عریضہ پیشِ خدمت ہے۔

شہیدِ اسلام قائدِ ملت مرحوم صدرِ پاکستان کی زندگی میں ہمارا ایک وفد اپنا انقلابی میشن لے کر وعدوں اور امیدوں کی فضا میں صحبت و زیارت کی سعادت سے محظوظ ہوا تھا، عالم اسلامی کی دوسری برادری کی طرح ہم نے بھی اپنی زندگی کے حال و مستقبل کے متعلق اپنی تمنائیں اس شہیدِ اعظم کی زندگی سے مربوط رکھی تھیں۔

ادھر عرش والے کو مرحوم کی روح پیاری تھی، ادھر حق و انصاف اور امن عالم کے دشمن منحوس اور کالے ہاتھ کو بھی پرانی عادت یاد آ گئی، تو مرحوم کو اپنے اسلاف کے ان شہیدوں سے ملنے کا سر و سامان ہوا، جن کی راہ پر آپ گامزن تھے، اب ہم تمام اسلامی برادری کی طرح ایسے یتیم اور بے دست و پا ہو گئے کہ اپنے حال کو (جو آج کل ماضی ہونے جا رہا ہے) سنبھالنا اور مستقبل کا سنوارنا اپنی قومی تاریخ اور ملی زندگی کے حوالے سے ایک عظیم سے عظیم ترین معمہ بن چکا ہے۔

چوں کہ برما کے آج کل کے بدلتے ہوئے حالات دوسری اقلیات اور قومیات کے حق میں جیسے بھی پلٹا کھائیں تو کھائیں، مگر ہم ابنائے اسلام کی زندگی کو کسی دیرپا بربادی اور دوررس تباہی کے سوا ہرگز کوئی پیغام سنا نہیں سکتے۔

آپ سے اپنے باپ کے لائق فرزند ہونے کی حیثیت سے اور ملت کے مستقبل پر دھڑکنے والا دل اور منزل کی نشانی دیکھنے والی نگاہوں کا مالک ایک نونہال اسلام مان کر یہی اپیل ہے کہ آپ واپسی کے

بعد ہمیں وہاں بلالیں، جہاں معمار نسل اسلام اور آپ کے والد شہید نے ہمارے دل منائے اور امیدوں کی ایک دنیا سامنے رکھ دی تھی، جہاں اس قائد وسپوت نے ہمارے حالات زار پر اپنی درد بھری نگاہوں کے گرما گرم آنسو بہائے ہمیں مخاطب تھے۔ یقیناً یہ ہماری برمحل اور جائز توقعات ہیں آپ جیسے امت کے شیر زادے سے، اللہ تعالی سے ہماری فریاد رہے گی کہ آپ کے خاندان کا وہ چراغ صدیوں کے لئے روشن رکھے، جسے شہید ضیاء کے دل دردمند نے ایک بار جلایا تھا، اور آپ کو اپنے سلف کا کامیاب تر یادگار اور والد مرحوم کے بہترین جانشین ہوکر زندگی گزارنے کی سعادت بخشے، حضرت مرحوم اور متعلقین کی دو یادگار تصاویر ساتھ چھوڑتے ہیں، جن میں شہید صدر ضیاء سے ہمارے وفد کی ملاقات کا ایک چہرہ ہوگا، ہم اپنے میشن کی نمائندگی کے لئے آپ کی خدمت میں حاضری کا ایک وفد اس ترتیب سے دیتے ہیں:

۱۔ مولانا محمد حنیف۔ ۲۔ مسٹر سلیم احمد۔ ۳۔ مسٹر عبدالرحمن۔ ۴۔ مسٹر محمد اقبال۔ ۵۔ مولانا حسین احمد۔

والسلام علیکم۔(۱) ۱۰/۰۷/۱۹۹۰ء

☆☆☆

(۱) ۱۹۹۰ء کے دوران جناب محترم اعجاز الحق (صاحب زادۂ گرامی شہید ملت حضرت صدر پاکستان محمد ضیاء الحق) صاحب نے ایک وفد کی قیادت کرتے ہوئے بنگلا دیش کا تین روزہ سفر کیا تھا، دراں حالیکہ جناب اعجاز الحق صاحب کا سپرد کسی وزارت (غالباً وفاقی وزارت برائے امور مذہبی پاکستان ہو) کا قلمدان تھا، یہ وفد ڈھاکہ پہنچا تو ادھر سے مولانا حسین احمد صاحب اور آپ کے چند رفقائے کار جن میں محترم محمد اقبال صاحب باغکونوی منگڈوی مقیم حال ولایاتِ متحدہ امریکہ پیش پیش تھے نے بڑی کوشش کی تھی کہ اس وفد سے کسی بھی طرح ملاقات ہوجائے، لیکن اس کوشش میں ان کو بظاہر ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا، جس کے بعد آپ نے اعجاالحق صاحب کے نام ایک رسالہ بھیجا، تاہم یہ الگ بات ہے کہ اس رسالے کا کیا نتیجہ نکلا تھا؟ پھر یہاں ایک بات ضرور ناقابلِ فراموش ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا محمد حنیف راغبؔ ارکانی صاحب کے مابین عرصۂ دراز کی سیاسی، فکری کشمکش اور تناؤ کے بعد کسی قدر قربت نصیب ہوئی تھی، جو مراسلہ سے ظاہر ہے۔

مراسلہ نمبر (۴)

صدیقِ مکرم مولانا صدیقی صاحب! خدا کرے کہ صدق وصفا آپ کا شعار ہو۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

اپنی حد تک خیر وعافیت سے ہوں، اور راہیوں کی خیریت بھی سناتا ہوں۔ آپ کا دیرینہ ''انتظارِ فردا'' آج اور محتاجِ انتظار نہیں، خود ''منتظر'' بن کر نظروں کے سامنے ہے، گرد و پیش پر اندھیاریاں چھائی ہوئی ہیں، بدلیوں پہ تہ دامنی اور آشفتہ سریوں کا عالم ہے، اور زمین پر ویرانی اور نامردم سازی کا دور دورہ ہے۔ ایک طرف زندہ وسلامت ہیں، اور ہماری آہٹوں کی خبریں ہیں، ادھر امنگوں اور ولولوں کا ایک نازک مگر سرسبز وشاداب باغ بھی ہوتا ہے۔

اس بزم کے یارانِ ستم پیشوں کا ایک ایک کر کے خاتمہ اب ہو رہا ہے، اور وہ بھی نئے آن بان اور نئی شان وشکت میں، پرانی روایات مگر نئی اداؤں میں، ایسے حالات میں چند اور یاروں کا زینتِ بزم بن کر ابھرنا اور اچھی طرح سے ابھرنا ایک ناگزیر اور فطری بات ہے کہ ''موسم ہوگیا اور زمین نے خوش آمدید کے ساتھ استقبال کی صدائیں بلند کیں'' ادھر فضا میں ''الوداع'' تو ادھر ''مرحبا'' کے زمزمے گونجنے لگے۔

مولانا! آپ قلم ودوات کو صاف اور دوٹوک فرمالیں اس دم واپسیں پر یا اس آہِ سرد دل پر، کیا کیا داستانِ غم ہے جو سنانے کی رہ گئی ہے، زمانے کی کیا کیا نیرنگیاں ہیں اس داغستانِ تاریخ کی، ہم آپ کی ایک نظر یارانہ وکریمانہ کے منتظر ہیں، آپ جہاں جہاں بھی رہے ہوں، آداب کے شناسا ہو جائیں، ادھر کمی اس بات کی ہے جو سینکڑوں سال پہلے کسی دلِ دردمند کو سوجھی تھی:

مت سہل ہمیں جانو ابھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے ذرے سے انسان نکلتے ہیں

آپ کا منتظرِ فردا:

حسین احمد ارکانی۔ چاٹگام، بنگلا دیش

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۵)

جناب صدیقی صاحب ! صداقت وصدوقیت آپ کا شعار رہے۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

آپ کے مختلف تاریخ کے دو پرچے چند دن ہوئے موصول ہوئے، آپ بڑے شکر وسپاس کے لائق ہیں، کہ آپ نے اپنی نگاہوں کے سراب کو سراب کر کے تاڑا {فاما الزبد فیذھب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الأرض} والی زندہ مثال آپ نے چھوڑی آج کل کے نام نہاد دانشوروں کے لئے۔

کل بھی مجھے مشرق وسطی کے لئے نکلنا ہے، کام کی نوعیت تو الگ ہے، آپ کے بقول سرمایہ داروں سے کوئی مسابقہ یا واسطہ نہیں، وہاں ہی تو امتحان ہے اہل حق ودل کے لئے، محراب ومنبر نہیں بلکہ دین و دھیان بھی بیچنے والے ہر زمانے میں ہوتے ہیں، کسی نہ کسی بہانے سے ان کا شیوہ یہی رہتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ دین کسی غلط کاروں کے ہاتھوں کے بازیچۂ اطفال نہیں {واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون} اور {انا له لحافظون} والا وعدہ ہر آن اپنا کام کرتا آیا ہے {جعلت لی الأرض کلها مسجدو طهورا} کا احاطہ ہم تک ضرور ہے۔

وعدۂ چار چشمی کوئی روایتی چیز نہیں، میری آمد کی خاطر دل کا صاف وشفاف رکھنا ہزار شکریہ کے لائق ہے، آپ تو جانتے ہیں کہ آمد جبھی ہوتی ہے یکبار ہوتی ہے، وہ بھی ہزار انتظار کے بعد، اس بار مشرق وسطی کم سے کم آپ سے جود وسخا کا برتاؤ کرے گا۔

مولانا! کام بہت مگر وقت بہت کم، ایک سال بھی سامنے نہیں ہے ٹھوس کوئی اقدام اسی اثناء کرنا ہے، نوعیت جو بھی ہو مگر ٹھوس اور برمحل ہو۔

تمنا تھی کہ عمالقہ کی سرزمین میں ملاقات کروں گا، مگر وقت نے وفا نہیں کی، آپ کا ہزار شکر کروں بھی تو کم ہیں، وطن عزیز کی ہمہ گیر دستگیری اور رہنمائی کے منصبِ بلند کے لئے اللہ تعالی آپ کو قبول فرمائے:

ہوتا ہے زمانے میں کم مردِ خدا کا پیدا۔

ورنہ سیلاب میں بہ جانے والی عقلیں بہت ہی ہوتیں، ہمارے یہاں مقام اس عقل ودانش کا ہے

جو اپنی تیئں بہنے کی عادت نہیں رکھتی، بلکہ ضرورت پر طوفان بن کر ہزار عقلوں کو اڑا کر لے جانے والی ہو، خدا کرے کہ چار چشمی کے دوران ان داعیہائے دل کو رفو کرنے کی سعادت ہاتھ آئے۔

آپ لوگ ستم رسیدہ ضرور ہیں، مگر ہمیں چھوڑ کر کیوں؟ ہم دیارِ غیر میں کسی منزل کی راہ ورسم کے لئے غربت کی زندگی گزار رہے ہیں، آپ جیسوں کو کم سے کم احساس ضرور ہونا تھا، زخم پر نمک پاشی کبھی بھی ہو جائے تو چشم پوشی کی لائق ہے، کیوں کہ آب پاشی کی نیت میں بھولے سے نمک پاشی ہوئی تو آپ جانتے ہیں کہ وہ خواب ضرور شرمندۂ تعبیر ہونے کو ہے، سیدنا عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی زبانی سنئے کہ:

{الی متی یسعدھؤلاء و قد ولدتم امھاتھم احرارا}

مگر دوسری طرف ہم اپنے اوصاف وکمالات کا ایک بار جائزہ لیتے ہیں تو صاف دیکھتے ہیں کہ ہم اس قابل نہیں ہیں، آپ مانے یا نہ مانے یہ ایک زندہ حقیقت ہے جو اپنا چہرہ دکھانے کے لئے کسی ترجمان کا محتاج نہیں، اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ میں کسی احساس کم تری کا شکار ہوں۔

میں اور آپ الحمد للہ ہزار طوفان اور سیلاب کے بعد اور ہزار تیز وتند بادِ صرصر کے جھونکوں کے بعد:

بال و پر ٹوٹے ہوئے پرواز کی طاقت نہیں

تاک میں صیاد ہے گلشن کی دیواریں بلند

کا فلسفہ نہیں مانتے، فللہ الحمد اولا و آخرا، والسلام۔

آپ کا مخلص/حسین احمد ارکانی

چاٹگام، بنگلا دیش

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۶)

برادر محترم صدیقی صاحب! صدق اللہ فی میثاقک و میعادک۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

آپ کے ۲۲ر مئی اور ۷ر جون کے دو پرچے چند دن ہوئے موصول ہوئے، اللہ تعالی آپ کا بھلا کرے کہ وطن عزیز کے جاذبِ دل سراب کو سراب کر کے تاڑا، {فاما الزبد فیذھب جفاء واما ما

ینفع الناس فیمکث فی الأرض }والی حقیقت آج کل کے دانشوروں کے حق میں بڑی کارگر ہی ہوگی۔

کل بھی مجھے مشرق وسطی کے لئے نکلنا ہے، کام کی نوعیت تو الگ ہے، سرمایہ داروں سے کوئی مسابقہ کیسے؟، وہاں اہل حق کا امتحان ہے، محراب وممبر نہیں بلکہ دین ودھیان بھی بیچنے والے ہر زمانے میں ملتے ہیں، کسی نہ کسی بہانے سے بیچتے ہی رہنا ان کا شیوہ رہتا ہے، مگر دین کسی ہاتھ کی غلط کاری کا شکار نہیں ہوسکتا {واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون } اور {انا لحافظون } والا وعدہ ہر آن اپنا کام کرتا آیا ہے {جعلت لی الأرض کلھا مسجدو طھورا } والی سرزمین ہے۔

وعدۂ چارچشمی کہیں روایتی محبوباؤں کا سا بھی ہوسکا تو کچھ ہوا، مگر کارنیک کا وعدہ تھا جو روایتی چیز نہیں، وعدہ کا حال بھی کیسا ہو آپ کو معلوم ہوگا، میری آمد کی خاطر آپ نے تمام کورا کرکٹ سے اپنے آپ کو پاک رکھا تو سپاس وشکریے کے لائق ہیں۔

اس بار کا مشرقِ وسطی آپ سے کم سے کم تہی دامنی نہیں کرے گا، وقت بہت کم اور کام بہت زیادہ ہے، آپ احساس ضرکررہے ہوں گے، سچ میں اگلا ایک سال یا اس سے کم کے ایام باقی ہیں ٹھوس کسی اقدام کے لئے، کام کسی بھی نوعیت کا ہو مگر ٹھوس ہونا چاہئے، تمنا نہیں بلکہ دل کی دھڑکن تھی کہ ساحل عمالقہ پر ملاقات کروں گا، مگر وقت نے ساتھ نہیں دیا، آپ کی اس دیرینہ محبت کا ہزار شکریہ کروں گا بھی تو کم ہے، اللہ تعالی آپ کو وطن کی ہمہ گیر رہنمائی کے منصب کے لئے قبول فرمائے:

ہوتا ہے کم زمانے میں مردِ خودآگاہ پیدا

ورنہ سیلاب کے رو میں بہہ جانے والی عقلیں بہت ہوتی ہیں، ہم اس عقل ودانش کو مقام دیتے ہیں جو اپنی عادت بہنے کی نہیں رکھتی ہو، بلکہ طوفان بن کر ہزار عقلوں کو اڑا کر لے جانے والی ہو، خدا کرے کہ چارچشمی کے دن ان داغہائے دل کو رفو کرنے کی سعادت ہاتھ آئے، والسلام۔

آپ کا دوست:

حسین احمد

۹/ ۱۲/ ۱۹۸۹ء۔ چاٹگام، بنگلادیش۔

مراسلہ نمبر (۷)

محبِ مکرم ومحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

اپنی حد تک خیروعافیت سے ہوں، اور آپ لوگوں کی خیریت کی چاہت تو ہماری اپنی ہی رہی ہے۔

چند دن ہوئے کہ آپ کے نام خط روانہ کرایا، جو مدتوں کے آپ کے خطوط کا جواب یہ تھا، ملک کی گرتی اور بگڑتی ہوئی حالت پر ایک نظرِ عفت بھی دوڑا اگر لیتا ہوں تو چین وسکون کا عالم ایک خواب بن کر رہ جاتا ہے، قوم کے اربابِ فکر ودانش کی حالت زار پر کان دھرتا ہوں تو مستقبل کی اندھیاری اور کالی گھٹاؤں میں اپنے آپ کو گم پاتا ہوں۔

اسلامی تحریک کے نام پر کچھ حرکت تو ضرور ہورہی ہے،''اس قوم کی تقدیر پر ہزار خوشیاں منائی بھی تو کم ہیں'' جس میں علماء کی شرکت اور رفاقت ضروری چیز تھی میری نظر میں، مگر ادھر علماء کی آمد تک کے لئے راہ ہموار نہیں پا رہا ہوں، تحریک تو اسلامی ہے، ٹھیک ہے، اسی سرزمین میں چلنی ہے، کہ مزاج وافتاد کی رہنمائی کرنی ہے، کسی طاغوت وفرعون کو زیر کرنا ہے، مگر یہ تمام کے تمام سوالات ہیں، جن کا جواب ہر قدم وقت پر ہونا چاہئے، پلان اور پروگرام کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہئے، مگر۔۔۔۔۔ان کے استقبال کی تسبیح ہزار گردانی جاتی ہے مگر راستوں میں کانٹوں کا جنگل بچایا جارہا ہے۔

محترما! اس وقت ان لوگوں کا کیا کہنا؟ میں جہاں تک دیکھ رہا ہوں یہاں اہل علم ودانش کی قیمت کی جگہ ان لوگوں کی قدر وقیمت زیادہ رہی ہے جنہیں زمانے میں کچھ کرنے کرانے کی صلاحیت ہر وقت ڈرتی رہتی ہے، جنہیں جی حضور اور جہاں پناہ کہہ چلنے اور حلوہ روٹی زندہ آباد کی دنیا میں بسنے کی عادت ہے،''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' والا فلسفہ نے تو آج کل بازار گرم رکھا ہوا ہے۔

مولانا! اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرچکا تھا کسی بھی اسلامی تحریک کے ساتھ کام کرنے یا خود سے اٹھانے کے لئے، مگر اس وقت جہاں قوم وملت کی زبوں حالی پر غم کھاتے رہنا نصیب ہے، وہاں بے یار وغم گسار وقت کاٹنے کی مصیبت بھی، جہاں اپنی زندگی کی تمام قیمتی متاع لٹانی ہے، وہاں خوف وہراس اور امید وبیم کا علم دیکھنا بھی میسر۔

میں نے آپ کو علمائے کرام کی ایک سربراہ جماعت یا ''تنظیم'' کی بات سنائی تھی، مگر آپ نے میرا

مطلب نہیں پایا، میری مراد علماء سے یہ ہے کہ جنہیں وسعتِ ظرفی، فراخ دلی، عزتِ نفسی، عفتِ دامنی، تخریب کی جگہ تعمیر، تنقید کی جگہ تردید، زمانے کی نوکری اور غلامی کرنے کی جگہ خود زمانے کو چاکری اور غلامی کرانے کی بلند ہمت اور قاہر طاقت نصیب ہو، میں لکھتے لکھتے خیالات کی دنیا میں گم نہیں ہوگیا ہوں، عمل و تطبیق کی سرزمین پر بیٹھے بیٹھے لکھ رہا ہوں، بہرحال الحمدللہ اولا و آخرا، میں نے پمپلٹ قسم کا ایک سلسلہ جاری کیا، جس کا پہلا شمارہ آپ تک ضرور پہنچ گیا ہوگا، میری طرف سے بھی ایک خاص پرچہ رکھئے! انشاءاللہ مسلسل جاری کرتا رہوں گا، آپ اپنے سفر کا پروگرام کسی بھی حالت میں ملتوی نہ ہونے دیں، اور درخواست دعا ہے، والسلام۔

آپ کا مخلص:

حسین احمد

۱۶/۱۰/۸۷ء۔ سراج منزل، چاٹگام، بنگلا دیش۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۸)

مکرمی ومحترمی!   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،،

اللہ تعالی آپ کو سلامت سے رکھے!

آپ کی ۲۹/ مارچ کا مکتوب گرامی موصول ہوا، عافیت سے تھا، ہمہ تن شوق وولولہ کا دورہ پڑا ہوا ہے، ویسے جوابیہ لکھنے بیٹھا ہوں، بے اعتنائی تو یقیناً نہیں کوتاہی ضرور ہے، میں اعتراف کرتا ہوں۔

شاید آپ کو شبہ ہوگیا ہوگا میری سابقہ تحریر سے، علماء جماعت سے میرا مقصود صرف اور صرف وہ حضرات ہیں، جنہیں زمانے میں آج اور کل میں فرق سمجھنے اور اس فرق وخلیج سے سبق لینے کی توفیق نصیب ہے، نہ ان حضرات کی ڈھیل ڈھول کی جماعت جس کی دو بزرگ ہستیوں کا نام مبارک آپ نے تلاوت کر سنایا، اور قصۂ پارینہ کی ایک نئی کڑی (شاید کہ آخری بھی ہو) بھی سامنے لائی، میرے خیال میں بقولِ آپ کے اس تاریخی اجتماع میں آپ کی غیر موجودگی زہی قسمتی بھی تھی اور تہی نصیبی بھی۔

اس وقت مسٹر امان اللہ، مولوی شبیر اور مولوی الیاس آئے ہوئے ہیں، ماشاءاللہ ان کا آنا بڑا زرق و برق کا تھا، پیسوں اور روٹیوں کا جال بڑا لمبا بچھایا گیا، دیکھتا کیا ہوں؟ کہیں مسندِ ارشاد واصلاح کے مشائخ، کہیں دبستانِ سیاست کے نام نہاد قائدین یک قلم پھنسے ہوئے نظر آرہے ہیں، عربی میں اس منظر دل فریب یا دل سوز کی تصویر ''یتکالب علیہ'' کی فراخ دامن مثال سے کھینچی جاسکتی ہے، اس قوم کی قسمت پر ہزار نالہ کریں، نوحہ کریں، زاری کریں اور غم کریں تو بھی بہت کم ہے، جس کی فکر و دانش کا جنازہ نکل چکا ہو، جس کی عقلیں اور دماغیں اپنی قدیم شاہانہ زندگی کی داستانیں حلوہ روٹی کے معجزہ کے سامنے یک سر بے حقیقت بلکہ ملیامٹ ہوجاتے ہوں۔

ادھر اور ایک جماعت ہے دیکھ لیجئے! ارکان کی سرزمین پر اپنی کھوئی ہوئی بازگشت لانے کی فکر و کوشش سے زیادہ کسی نظریہ اور آئیڈیالوجی کے لئے فتح کی کاوش میں سرگرم ہے، خدا جانے یہ لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ اور کیا کرتے ہیں؟؟ جس طرح آپ نے ان پاگل دماغوں کا قصہ سنایا، یہاں بھی علماء کی ایک بڑی جماعت بنی، مولانا مودودی مرحوم کے خلافیات کا جائزہ لینے، اور عوام کو نشاندہی کردینے کے عزم وخیال لے کر، آج کل تو میرے یہاں متعدد اصرارات تک آئے اس پر قلم اٹھانے کے بارے میں، مگر میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ان اصرارات پر سمع قبول دوں تو دینی فریضہ یا امانت سمجھ کر دوں یا سیاسی اور قومی ذمے داری مان کر؟

اگر آپ کو وقت ہے تو اس موضوع پر پانچ منٹ خرچ کریں، ان لوگوں کا سیاست کی جگہ مولانا کی شخصیت کو بے غبار یا پر وقار بنانے کی فکر میں مست ہوجانا کہاں تک قرینِ عقل ودانش ہے؟

بہرحال ان گوشہائے گفتگو سے ذاتی تعلقات اور قدیم راہ ورسم میں کوئی خلل نہیں ہونا چاہئے، اس وقت یہاں کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ فکری اور نظریاتی اختلافات کو دلی اختلافات کا نہیں بلکہ دلی نفرت اور عداوت کا رنگ چڑھا دیا جاتا ہے۔

آج کل غیر حاضر دماغی کا شکار ہوں، ادھر ادھر کی بکھری ہوئی چند باتیں کہہ دیں، طبیعت کو بھاری ضرور محسوس ہوگی، ویسے دوستوں سے تلخیاں بھی کبھی چاشنی کا کام دیتی ہیں۔

عزیزوں کا حال لکھنا نہ بھولئے! اقبال اور طلحہ کو دعائے دلی، ام طلحہ کو سلام عقیدت، ادھر کا رخ کر

سکتے ہیں تو کمال ہوگا، اور دل میں شوق تحریر موجیں مار رہا تھا،قلم کو اپنی صحت و عافیت سے شکایت ہے تو۔۔۔۔والسلام۔

آپ کا مخلص دوست:

حسین احمد

۰۶/اپریل۔ چاٹگام، بنگلا دیش۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۹)

برادر محترم مولانا حسین احمد صاحب ! رعاکم اللہ تعالی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،،

خدا کرے کہ آپ کے دل کی دیرینہ دھڑکن لازوال سکون وطمانیت سے بدل جائے، اور آپ کا وطن پورے طور پر اسلامی ریاست بن کر رہنے کا آپ کا پرنزاکت خواب شرمندۂ تعبیر ہوجائے۔

مولانا! کسی چیز کی طلب وجستجو جب کسی انسان کو پالیتی ہے، اس کو چین وسکون کا کلمہ یک قلم بھول جانا پڑتا ہے، راحت واطمینان کی دنیا اس سے رخصت ہولیتی ہے، منزل کی تلاش میں وہ دیوانہ وار تڑپنے لگتا ہے، میں آپ کے ہر اندازِ گفتگو سے محظوظ ہوتا ہوں، جس پر کبھی کلمۂ الحمدللہ بھی پڑھ دیتا ہوں۔

مولانا ! آپ یقین مانئے کہ آپ پاگل نہیں ہوجائیں گے، بلکہ آپ ان تمام بے قراریاں، وارفتگیاں، آزادی کی امنگ، اور منزل کی شیفتگی اور عشق آپ کی اپنی فکر ونظر میں، فہم وبصیرت میں چار چاند لگانے والی چیزیں ہیں، بس آپ کا مرشد (میری کوتاہ نگاہ میں) یہی ایک سورش اور سوزش ہے، یہی ایک دائمی تڑپ اور دھڑکن ہے، یہی ایک پامردی اور پاک نفسی ہے، آپ مطمئن رہیں، اور کام کو آگے بڑھاتے جائیں۔

مولانا! پھر بھی اگر مرشد کی اور تلاش رہی ہے تو میں آپ کو ایک اچھنبا مرشد بتا دیتا ہوں، جن کی تلقین وارشاد کی کرشمہ سازیوں نے آپ کے اسلاف واکابر کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ دنیائے

انسانیت کی قیادت کا لگام اپنی دو انگلیوں میں تھام لیتے تھے، جنھوں نے صدیوں پہلے عرب کے گلہ بانوں کو دو ایک عشوۂ نگاہ کے اندر دنیا کی مہذب ترین قوموں میں تبدیل کردیا تھا، جنھوں نے انسانیت کو پیغام زندگی سنایا تھا، اور آبِ حیوان کا ساغر پلایا تھا، مگر افسوس ہے کہ آج امت کی رہنمائی اور دستگیری سے خود امت اپنا سر لگا نہ رہنے کی وجہ سے یا اپنے ان اسلاف کی چوکھٹ اور آستانۂ تلقین و ارشاد کو چھوڑ دینے کی وجہ سے آج کی اس برقی دنیا میں دردر کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے، اور طاغوت وشیطان کے جولانِ قدم سے ’’غبارِ راہ‘‘ کی طرح روندی جارہی ہے۔

وہی ایک مرشد ہے ہم اور آپ کا (بلکہ پوری کائنات کا) وہ بے زبان مرشد ہے، مگر ہمہ تن زبان کا، وہ بے حرکت مرشد ہے، مگر ہر حرکت وسطوت اور قوت وسلطنت کا، وہی سرچشمہ ہے، وہی کیمیائے سعادت ہے آپ کے سفرِ زندگی کا، وہی آپ کے زادِ راہ ہے، وہی آپ کی آنے والی زندگی اور سربلندی کا پیغمبر ہے، وہی آپ کی ان کٹھن منزلوں کے حق میں خضرِ راہ ہے، وہی قرآن اور کلام الٰہی ہے، جس کی ایک سطر آپ کی زندگی کی ایک نہیں بلکہ سینکڑوں ہزاروں گتھیوں کو سلجھانے کے لئے کافی ہے، وہ بزم ورزم کا رہنما ہے، خلوت وانجمن کا ترجمان ہے، راحت ومصیبت کا ہمدم ہے، غلامی وبے کسی میں دستگیر ہے۔

مولانا! یوں تو آپ دوسرے تیسرے درجے کے مرشد سے کہاں تک دل چسپی لیتے ہیں اس سے مجھے اچھی طرح واقفیت نہیں، خدا کرے کہ ہم اور اس مرشدِ انسانیت، مرشدِ کائنات سے قریب سے قریب تر رہنے کی توفیق کے حصے دار ہوجائیں، **وما توفیقی الا القائد الحیاۃ البشریۃ و علیه توکلت و هو حسبی و نعم الوکیل۔**

نوٹ: کسی چاہت کے بغیر آپ نے مولانا حنیف صاحب کی روئدادِ سفر پیش فرمائی ہے، ایک دو لفظوں میں اس کا شکریہ، جمعیتِ علماء کا کیا کہنا، اس سے کیا توقع ؟ مگر حنیف صاحب کو آپ نے تخمین کرنے میں حقیقت تک رسائی نہیں کرپائی، دوسری تیسری جماعتوں کی بھی خبریں لکھنی ضرور تھیں، آپ نے گریز کیوں کیا ہے؟

زبان میری استعارہ کی ہے ازل سے، اسے چھوڑنا کیسے ممکن؟ استعارہ کی زبان مستعار سے اور کیا

سروس ہوسکتی ہے ''استعارہ کے بغیر'' خدارا معاف کیجئے! والسلام۔

آپ کا مخلص:

حسین احمد ارکانی

۲۲ رنومبر رسراج منزل، چاٹگام، بنگلا دیش۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۱۰)

برادر محترم مولانا صاحب ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،،

بصد شوق وتمنا، درد والم یہ پیش کش ہے !!

آپ کا وہ پر درد لہجہ بڑا اثر تھا کہ ''ہر کجا اسلامی نام کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہیں کیوں نہیں ارکان کی سر زمین سے بھی ایک زندہ تحریک اٹھے، ہم اور آپ کے سر پہ ہے وہ ذمے داری''۔

یوں تو میں آپ سے مانوس تھا مدتوں سے، اس طرح یا اس سے زیادہ آپ کے رفقائے کار سے بھی، اور ادھر میں تعمیری خیال کا واقع ہوا ہوں، شوشل لائف کا متمنی بھی ہوں اور عادی بھی۔

آپ لوگوں کے اصرار اور پر خلوص دعوتوں کو کان دھر کر عظیم منصوبہ اور بامقصد پروگرام دل میں رکھ کر اسلام کے نام پر بنی ہوئی تنظیم کو قریب سے دیکھنے گیا تھا (جیسا کہ آپ کو معلوم ہے) تو ہزاروں قربانیاں اور سینکڑوں آزمائشیں سر پر گرنی شروع کیں، کبھی حلقۂ احباب میں برے لب ولہجے میں یاد کیا جا رہا ہوں، کہیں عزیزوں قریبوں سے شکوک وشبہات کی روشنائی سے لکھے ہوئے خطوط پا رہا ہوں، کہیں اساتذہ اور مربیوں کے گوشۂ چشم کی تیزی کا شکار ہو گیا ہوں، ان ساری چیزوں سے فراخ دلی کے ساتھ ڈٹ کر مقابلہ کیا گیا، ہزاروں خارش دیکھی مگر کسی منزل کی تلاش میں دیوانہ وار خوش وخرم ہر چیز کا استقبال کیا گیا تھا، لیکن آخر کار رہا نہیں گیا، تھوڑی مدت کے لئے جسمانی طور پر علیحدگی کو ترجیح دی گئی، یوں گوشۂ عزلت میں بیٹھ گیا ہوں، بڑی امید تھی آپ لوگوں کے ساتھ سفر کرنے کی، توقع تھی واپسی کے بعد معاملہ سلجھ جائے گا، مگر آج تک کی طویل خاموشی نے اور بھی مایوس کر دیا۔

مولانا! یہ دنیا ہے خیر وشر کی آماجگاہ، نور وظلمت اور حق وباطل کی رزم گاہ، یہاں ساتھ چلنے والوں کی تعداد بڑی ملتی ہے ہر وقت، مگر جس کے ساتھ چلنے سے ساتھی کا کچھ ہوتا یا ہوا جا سکتا ایسوں کی گنتی بہت کم ہوتی ہے، کام کرنے کی گنجائش تو ہوسکتی ہے مگر کام کا ہنر مند، سفر زندگی کا حاذق وذکی الحس، منزل کا دیوانہ ووارفتہ انسان کی بڑی گرانی رہی ہے، تاریخ عالم میں بقول مولانا مودودی ''پتہ مارنے والے محنتی اور ذہین نوجوان نہیں ملتے'' آپ کی نظریں ضرور اس طرف کھل رہی ہوں گی۔

آپ کا یہ اقدام مبارک ضرور ہے کہ ''تحریک اٹھ کھڑی ہوا اسلام کی، ہمہ گیر اسلامی معاشرے کی'' مگر آپ کا یہ طرز انتخاب سفر، خطوطِ عمل، انتخابِ رفقائے کار اور تعیینِ منزل سے آپ اپنی منزل کی جانب کہاں تک رواں دواں ہیں آپ کو اچھی طرح پتہ چل رہا ہوگا، کام جس پیمانے کا قیمتی کیوں نہ ہو، اور اس کی آواز کس مخلص دل سے نکلی ہوئی کیوں نہ ہو، کامیابی کے لئے فطری اصولوں اور تقاضوں کے مطابق اپنے فطری سانچے میں ڈھلنا بھی توفیق الٰہی ہوتی ہے، مخلص اور کامیاب رفقائے کار کا مل جانا بھی مستزاد شرط ہے اس پر۔

مولانا! آپ یقین مانئے! آپ پر میری حسرت رہی ہے اس جانب سے کہ امام لیث بن سعدؒ اتنی بڑی بلندیٔ مقام، عظمتِ شان اور جلالتِ قدر ومنزلت کے مالک ہونے کے باوجود دنیا اس سے نا آشنا رہ گئی تھی، اور وہ ناکام دنیا سے چلے گئے تھے، چناں چہ امام شافعیؒ امام موصوف کے حق میں فرماتے ہیں کہ ''لیثؒ امام مالکؒ سے بلند مقام کا فقیہ تھا، مگر ان کے شاگردوں نے ان کا بگاڑ دیا'' امام ابوحنیفہؒ کو دنیا امام کر کے پہنچاننے میں ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے فعال ہاتھ کا بڑا دخل تھا، شاہ ولی اللہؒ کو دنیا ان کے عزیزوں کی زبانی پہنچانی ہے۔

مولانا! شخصیت جتنی بھی قابل، باصلاحیت اور دلاویز کیوں نہ ہو، سست رفتار اور ناقابل رفقائے کار کے ساتھ کبھی بھی شوشل پروگرام میں کامیابی میری عقل نہیں مانتی، اور چیز بھی غیر فطری ہے۔

ہم اس قوم میں تو ہیں جس کا کوئی مستقل تہذیب وثقافت، مستقل منہاجِ زندگی اور زبان وادب کا نام ونشان بھی نہیں ہے، جس قوم کے دانشوروں کی نظر میں ذاتی اختلافات کو مذہبی اور دینی اختلافات کا رنگ چڑھا دیتا ہو، فروعی اور جذباتی مخالفت کو اصولی اور ایمانی مخالفت کی اہمیت مل جاتی ہو، اس کے

مستقبل کا کیا کہنا، جسے آپ کھلی آنکھوں سے نظارہ کر رہے ہوں گے، اندرونِ ملک میں کون سی بادِ خزاں اپنا موسم گرما رکھی ہے، اور کون سے خیالات اور نفسیات نے وہاں اپنا راج قائم کر رکھا ہے، اربابِ علم و دانش نے اپنا رختِ سفر کس سمت کی طرف اور کس عشق و لگن کے ساتھ باندھ لیا ہے وہ بھی آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے۔

ابھی بھی وقت باقی ہے میری نگاہ میں، آپ بھی قدر ضرورت حذاقت و ذہانت تدبیر و اعتدال سنجیدگی اور بلند حوصلگی کے ساتھ معاملات کو سلجھانا چاہتے ہیں تو امکانیات و توقعات کا اپنے خاطر میں ایک اچھا خاصا انبار پاتا ہوں، آپ کی تحریک یقینا ایک اسلامی تحریک ہے، اور غالبا ملک و ملت کی بھلائی کے لئے اٹھی ہے، تب بھی اس ملک کے فرزندوں کے افتادِ فطرت کی طرف ایک نظر اٹھانی تھی، اس زمین کی قدیم اور روایتی چیزوں کی طرف ایک لمحہ کے لئے سہی توجہ دینی ضروری اور لازمی تھی، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ غالبا نہیں دی گئی۔

مولانا! کام کی اس بگڑی ہوئی صورت میں، اور امیدوں کی اس خزاں چھائی ہوئی فضا میں بھی مایوس نہیں ہوں، ساتھ ساتھ بے دست و پا بھی نہیں ہوں، اقبال کا:

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

والے پیغام نے کام کرنا نہیں بھولا، اور قرآنِ کریم کی آیت {**لقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الأرض یرثھا عبادی الصالحون**} طاقت و ہمت دلاتی رہی اور خضرِ راہ کا کام دیتی رہی ہے۔

مولانا! آپ نے میرا موقف اور نفسیات کو نہیں پایا، افسوس ہے کہ میرے رویے اور مقاصد سے آپ ناآشنا رہ گئے، حالت کیسی بگڑی ہوئی تھی، اور معاملہ کی صورت کیسی بھیانک تھی، اس کا اندازہ آپ کو نہیں، مگر سب کچھ آپ جیسے مخلصین کے چہروں کی طرف دیکھ کر صبر کے ساتھ برداشت کیا، یارانِ غم گساران کے درد و محبت کے صدقے اس بے معنی کا غم کھا لیا، یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ساتھ چلنے کی ہمت اب بھی میرے اندر رہ گئی ہے، میرے اندر زندگی کی اور زندہ دلی کی رمق باقی ہے، آپ کو وقت نے اچھی طرح سمجھنے نہیں دیا ہوگا، ورنہ توقع تھی آپ ذکی الحس اور بیدار مغز واقع ہوں گے۔

مولانا! انسانی تاریخ کے سفرِ حیات میں سب سے بڑی بوقلمونی جو میں نے دیکھی ہے وہ یہ ہے کہ کسی کا اپنی زندگی میں متوازن طاقت (مخالف ہو یا موافق) کی تخمین نہ کر پانے یا تخمین میں غلطی کرنے کی جہ سے منزل کی طرف رواں دواں ہونے کے بجائے قافلۂ حیات سے یک قلم بھٹک جانا پڑتا ہے، ہزار کامیابی اور فتح مندی کی توقعات کے باوجود آخر دنیا سے مایوس رخصت لینا پڑتا ہے، اخلاص و للّٰہیت، حوصلہ و صلاحیت کے پیکر اور جوہر ہونے کے باوجود بھی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انسان خوبیوں اور کم زوریوں کا مجموعہ ہوتا ہے، لیکن کسی انسان کا اپنی کم زوریوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈال کر دوسروں کی کم زوری پر پنجہ آزمائی کرنا کہاں تک قرینِ عقل و دانش ہے؟ وہ بھی سمجھنے کی چیز ہے۔ والسلام۔ (۱)

آپ کا قدیم مخلص:

حسین احمد

۲۰/ ۱۲/ ۱۹۸۷ء۔ چاٹگام، بنگلا دیش۔

---

(۱) مرقومہ بالا حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے چار مراسلے نمبر ۷/ ۸/ ۹/ ۱۰ کوئی مسٹر حسین احمد صاحب ارکانی کے نام تھے، جو اسی زمانے میں پاکستان سے آئے ہوئے مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، جہاں تک اندازہ ہوا ہے کہ وہ اسی زمانے میں جماعتِ اسلامی سے متأثر روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) میں شامل تھے، اور جن کی چاہت و خواہش تھی کہ محترم مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب مؤخر الذکر اس تنظیم کے لوگوں سے مل کر قوم و ملت کے لئے کام کریں، لیکن آخر تک یہ نہیں ہوسکا، جس کے مختلف اسباب اور وجوہات پر مولانا نے اپنے ان مراسلات میں کسی قدر اشارات و کنایات کے ساتھ کھل کر بات کی ہے، اور سطور بالا میں بھی میری خاصی معروضات اس حوالے سے موجود ہیں، میں نے مولانا محترم سے ان مسٹر صاحب کے متعلق بذریعۂ ٹیلفون پوچھا تھا، لیکن آپ نے ان کے بارے میں بہت تفصیل سے بتانے کی زحمت نہیں اٹھائی، نہ جانے ان مسٹر صاحب کا کیا حال ہے، آیا حیات سے ہیں یا نہیں، یہ بھی نہیں معلوم، جو کچھ بھی ہو کہ بڑے دردمند انسان معلوم ہوتا ہے، واللہ اعلم۔

مراسلہ نمبر (۱۱)

ماں! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

تمہارے سایۂ لطف وعاطفت سے محروم اپنی زندگی کا لطف کہاں سے لاؤں؟ زندگی اور موت ایک معنی کی چیز ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ایسی زندگی بے معنی کی زندگی ہے جو پیار ومحبت کے رہے سہے سہارے سے محروم، آج میں اپنی ماں کے آوازۂ مہر کرم سے محروم ملک بدر ہوں۔

عید تمہارے سامنے منانے کی ایک پرانی اور بہت پرانی آرزو تھی، جو مولوی محمد حسین (۱) کے ذریعے پیش کی گئی تھی، اس کے بعد عزیز حلیم کو بھیجا مگر آپ نے آنا برداشت نہیں کیا۔

یہ میری پیش کش کوئی رواروی کی نہیں تھی، مدتوں تڑپتا ہوا دل کا ایک سواگ تھی، جو زبان سے نکل کر عمل وتطبیق کی منزلوں سے گزری، مگر ناامیدی اور بدنصیبی کا عالم دیکھ کر وہی دل میں چھپا لینا پڑا، مگر اب بھی وعدوں اور امیدوں کے سہارے جیتا ہوں آپ کے حلیم کا کہنا ہے کہ آپ ووٹ (الیکشن) کے بعد آتی ہیں، تو دن گنتا جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔

حسین احمد

چاٹگام، بنگلادیش۔

---

(۱) مولوی محمد حسین صاحب کی پیدائش شہر بوسیدنگ کی شمالی مغربی معروف مسلم بستی چاؤفرانگ میں ہوئی، آپ مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے حقیقی پھوپی زاد بھائی ہیں، میرے علم کے مطابق آپ نے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب ومدرسہ میں پاکر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، اور سندِ فراغت یہیں سے حاصل کی، آپ اپنے ماموں حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب کے شاگردوں میں سے ہیں، بعد میں قومی وملی کام کی خاطر وطن سے ہجرت کی، عرصۂ دراز تک مولانا محمد حنیف راغب کی سرکردگی میں چلنے والی تنظیم ''اتحاد المجاہدین ارکان، برما'' سے وابستہ رہے، ۱۹۸۸ء کے دوران اس تنظیم کے نائبِ سالار کے عہدے پر فائز تھے، بعد میں ارایل او میں شامل ہوئے، لیکن چند دن کے بعد وہیں سے نکالے گئے تھے، بڑے نیک اور اخلاقِ حمیدہ سے متصف انسان ہیں، نہ جانے آج کل آپ کہاں اور کس حالت میں ہیں؟۔

مراسلہ نمبر (۱۲)

عزیز جانم مولوی محمد جلیل سلمہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

خیر وعافیت، ہمہ گیر ترقی اور خوش حالی کی دعائیں دیتا ہوا قلم پکڑ لیا ہوں، اور خیرت سے ہوں۔

یوں تو میں جسمانی علالت کا شکار پورے سفر میں تھا، یہاں آنے کے بعد کچھ دماغی پریشانی بھی آئی، ایک تو کتابوں پر تردد، دوسری ملکی حالات بھی حد سے متجاوز تباہی، اور تیسری اپنے مستقبل کے بارے میں ناطئے شدہ خط وخال۔ بہر حال تمہارے خط کا کسی قدر انتظار تھا، میں نے دو تین مرتبہ فون کیا، پتہ نہیں کیوں خبر نہیں ہوئی؟ یوں اپنی عادت کے خلاف خط لکھنے بیٹھا ہوں۔

کتابیں چند دن ہوئے مل گئیں، مگر کسٹم کے تمام تقریبا رسومات کی ادائیگی کے بعد، بہت حفاظت سے آئیں، کسی بھی کتاب پر کوئی اسپوٹ (داغ) بھی نہیں لگی ہے، بڑی آسانی سے چاٹگام تک پہنچ گئیں، اب ان کو الماریوں میں ڈالنا اور پروگرام کے مطابق لائبریری کا تشکیل دینا سر پر آیا ہے۔

تم اپنے خاص مشورے سے محظوظ کرنا، بطور خاص ایک قسم کا تردد اس پر ہو رہا ہے کہ عام مطالعہ کے لئے الگ ایک جگہ یا کسی معقول سکونت کا سوال کھڑا ہوگا، گھر میں چھوڑ کر وہ کام جو مطلوب ہے کبھی اور کسی بھی صورت میں نہیں ہوسکتا، میں اکیلا تو کسی قدر استفادہ کرسکتا ہوں اور کرتا بھی رہتا ہوں۔

اور ایک ضروری بات ہے کہ ''مکتبۃ عالم المعرفۃ'' کی ہدیہ والی کتابوں میں ایک موسوعۃ ''لسان العرب'' بھی تھا، جو پندرہ جلدوں میں ہوتا ہے، پکینگ کتب خانہ والوں کی تھی، یہاں آکر دیکھتا ہوں کہ تین نمبر والی جلد نہیں آئی، تو تم پر میں ایک بار اٹھا دیتا ہوں کہ تم کتب خانہ میں جانا، اور وہی تین نمبر والی جلد ان سے لے لینا، اور کسی تدبیر سے یہاں بھیج دینا اور میں تمہارے ہی نام لے کر ان کے وہاں خط بھیج دیتا ہوں، فون سے کتب خانہ کی جائے وقوع (لوکیشن) کا پتہ لگا لینا، اور ان سے میرے نام بتانا، وہاں ایک صاحب ہیں ہندوستانی، جس کا نام ضیاء الدین سید ہے، ان سے ملنا زیادہ بہتر ہوگا، یا اور ایک صاحب ہیں ابوبکر وہ بھی ہندوستانی ہیں، مگر وہ اردو بولتا نہیں۔ باقی تمہارے حالات سے ہمیں واقف کرانا، پاکستان میں رہنے والے عزیزوں کے حالات کی تفصیلات بتانا، ہوسکتا ہے کہ میرا پاکستان جانا بہت مختصر دنوں میں ہوجائے گا، اور وہاں سے اللہ تعالی کو منظور ہو تو تمہارے وہاں تک۔

امی جان کی طبیعت کسی قدر ٹھیک ہے، باقی سب اچھے ہیں، سب اچھے ہیں والے لفظ کا لکھنا ختم ہو رہا تھا کہ عزیز انور میرے سامنے کھڑا، تو اسے میں تمہارے نام کا خط ہونا بتایا، وہ اپنے خاص لہجے میں سلام کہہ رہا ہے، اس کا سلام قبول کرو، اور دعائیں دو! والسلام۔

حسین احمد

چاٹگام، بنگلا دیش۔

مراسلہ نمبر (۱۳)

برادر محترم الحاج عبدالغفار صاحب ! (۱) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،،

میں اللہ تعالی کی خاص مہربانی سے صحیح وسالم گھر آ پہنچا، اور کتابوں کے سلسلے میں تھوڑا تردد تھا، آج کل وہ بھی الحمد للہ اطمینان بخش ہے، کتابیں پوری طرح مل گئیں، اور چاٹگام تک لانا بھی آسانی سے ہوا، اب ان کو ٹھیک جگہ پر ڈالنا اور مطالعے کے لئے ماحول بنانے کا سوال ہے، اللہ کرے وہ بھی توقع کے مطابق بہتر طریقے سے انجام پائے۔

آپ سے وہاں کے مشورے کے مطابق ایک طرف بھابی اور بچوں کو یہاں تفریحا لانا تھا، پھر میری واپسی کے بعد آپ کا فون پر حلیم (مولانا کا چھوٹا بھائی) سے یہ کہنا کہ اب بھابی کو تفریحا نہیں بلکہ یک بارگی لایا جائے، اور آپ یہ بھی بتائے ہیں کہ حسین احمد سے بات تفصیلی کروں گا اور ان کو بتادوں گا، تو میں منتظر تھا آپ کے فون کا، تقریباً ہفتے کے بعد میں نے حمید کے ذریعے خبر بھیجی کہ آپ فون کریں، دو چار دن پھر انتظار، پھر میں نے فون کیا، پھر انتظار کیا، پھر ولی اللہ کی معرفت سے خبر دی، مگر آج تک کوئی خبر نہیں ملی تو تردد ہوا، میں آپ کے حکم کی تعمیل میں آج کل حلیم کو بھیجنے جا رہا ہوں، اگر لانے کے

(۱) جناب الحاج عبدالغفار صاحب مرحوم یہ مولانا حسین احمد صاحب کا بڑے بھائی تھے، بہت اچھے انسان تھے، جن کا انتقال سعودی عرب میں ہوا ہے، اور جن کا تذکرہ پچھلی سطور میں کیا جا چکا ہے۔

حوالے سے کوئی چیز سامنے آئی تو فون پر بتائیں، اور وہ بھی تفصیل اور ترتیب سے، اب انہیں اور والدہ کو حج بیت اللہ کے لئے وہاں لئے آنے کا جو پروگرام تھا، وہ کہاں تک ہے؟

باقی ملکی حالات تو بہت نازک ہیں، جو آپ سن رہے ہیں، لیکن میں اپنی بصیرت سے جو کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے ہاتھوں سے (ملک) پوری طرح نکل گیا ہے، خدا جانے کب اور کیوں کر اس کی واپسی ہوگی، اور کتنی جانکنیوں اور قربانیوں کے بعد ہوگی؟

چند دنوں کی بات ہے کہ یونس بھی تھائی لینڈ سے ہو کر یہاں پہنچا ہے، پروگرام سنا یا سعودیہ جانے کا، آج کل بارڈر پار کر کے بوسیدنگ گیا ہوا ہے، اس کی واپسی پر اور حالات آئیں گے بھابی کے سلسلے میں، اور میں نے اس کو یہاں تک بتادیا کہ بھابی آنے کو تیار ہے تو تم سعید احمد کو کسی نہ کسی تدبیر کے ذریعے دکان بچوا دینا، اور بھابی کے یہاں سے چلے جانے کی بات صیغۂ راز میں رکھنا، اگلے دو ایک دن میں اس کی آمد کی امید کی جا رہی ہے، حالات کا پورے جائزہ لینے کے بعد حلیم کو جلد بھیج دوں گا، والدہ خیر وعافیت سے ہیں، مگر آپ لوگوں کی پریشانی سے دو چار ہیں، اور بال بچے سب خیریت سے ہیں، ان کا سلام قبول فرمائیں، اور دعاؤں میں یاد رکھیں!

حسین احمد

چاٹگام، بنگلا دیش

مراسلہ نمبر (۱۴)

بھائی مولوی نور محمد صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،،

اللہ تعالی آپ کو ہمہ گیر ترقیات سے نوازے، اور خیر وعافیت ہوں، آپ شر وآفات سے محفوظ رہیں، بڑی دیر ہوگئی کہ آپ کی کوئی خبر بھی نہیں آئی، آپ کی آخری تحریر میں بھی غالبا یہ شکایت دیکھی کہ میں خط نہیں لکھتا، اس طرح مولوی محمد جلیل بھی، عجیب بات یہ ہے کہ میں خط نہیں لکھتا تو لکھتا کیا ہوں؟ اور حیرت تو اس پر ہے کہ آپ کی عادت پڑ گئی ان شکایات کی، یا سچ میں خط نہیں ملتے؟ مگر ادھر سے لکھتا

رہتا ضرور ہوں، تاکہ حالات سامنے رہے۔

بہر حال آپ تو خط دے سکتے اور حالات سے واقف کرا سکتے تھے، اب تک حضرت والدہ یہاں نہیں آئیں، کچھ دنوں پہلے عبدالحلیم آیا ہوا تھا، ادھر آج کل میری سب سے بڑی پریشانی یہ رہی ہے کہ والدہ آتی نہیں ہیں، یوں مجھ ناچارہ کے لئے کوئی سکون وآسرا نہیں دکھائی دیتا۔

بال بچے سب خیریت سے ہیں، انور تو مکتب نشینی کا قابل ہو رہا ہے، دعا کیجئے کہ اللہ تعالی انسان رکھے، ملکی حالات کیا بتاؤں؟ پوری اندھیاری کی دنیا میں کسی طرح امن کا دھندلا سا چہرہ دکھائے دے رہا ہے، اللہ کرے کہ ہمارے سروں پر سے گھٹائیں ہٹ جائیں، اور ہم اپنا مستقبل سنوارنا جانیں۔

زینب سمیت تمام اولاد کو اللہ تعالی خیر رکھے، عزیزۂ قلب وجگر ساجدہ کو اللہ ہی بس، آپ اپنے حالات سے آگاہ کیجئے! بڑی ماں کو سلام سنانا، حضرت استادِ محترم (۱) کو سلام اور درخواست دعا پیش ہو، استادی ومشفقی حضرت ناظم صاحب مدظلہ (۲) محترمی واستادی مولانا محمد شفیع صاحب مدظلہ (۳) کو بھی وقت نکلا تو سلام سنانا، اور پیغام یہ ہے کہ میں قریبا آرہا ہوں۔

آپ کا مخلص:

حسین احمد

۱۳/ ۰۱/ ۱۹۹۰ء۔ چاٹگام، بنگلا دیش۔

---

(۱) جلیل االقدر عالم دین حضرت مولانا ولی احمد صاحب خیر مورہ فاروی رحمۃ اللہ علیہ جو مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، جو مولانا حسین احمد صاحب کے استاد تھے، یاد رہے کہ حضرت مولانا ولی احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا نور محمد صاحب (جو مولانا حسین احمد صاحب کے بہنوی ہیں، آج کل مدینہ منورہ میں مقیم ہیں) کے بڑے بھائی ہیں، جن کا تذکرہ سطور بالا میں ہے۔

(۲) حضرت مولانا تمیز الرحمن صاحب بوسیدنگی (سابق استاد وناظم تعلیمات جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ) بڑے اور بزرگ ترین عالم دین ہیں، عرصۂ دراز سے مکہ مکرمہ میں مع اہلِ خانہ مقیم ہیں، جو میرے اور مولانا حسین احمد صاحب کے علاوہ بہت ساروں کے استاد ہیں، جن کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔

(۳) حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کوئندنگی بوسیدنگی، جو مولانا حسین احمد صاحب کے شفیق استاد ہیں، شنید ہے کہ آپ کراچی میں حیات سے ہیں، ان کا تذکرہ بھی فٹ نوٹ میں اوپر گزر چکا۔

مراسلہ نمبر (۱۵)

جناب مکرمی ومحترمی الحاج مولوی عبدالقادر صاحب! (۱) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

بخیر وعافیت سے ہوں۔ کچھ دنوں پہلے آپ اور مولوی محمد صابر کے نام دو الگ الگ لفافے بھیجے گئے تھے، جس میں محترم مولانا حنیف کی جماعتِ مجاہدین کی زبانی ایک کاغذ بھی شامل تھا، ملا ہوا ہوگا، اشاعت کے لئے نہیں بس معلومات کے لئے تھا، جوابیہ سے محروم رہ کر یہ دوسرا پرچہ بھیج رہا ہوں۔

مولوی عبدالرحمن کے متعلق آپ نے کیا سوچا؟ آپ اور دوسرے ذرائع سے حسبِ وعدہ پروگرام کے بارے میں انہی مطلع کیا گیا تھا، کہ وہ بنگلا دیش آئے، مگر ان کی مسلسل روگردانی اور دل آزاری سے تھک گیا ہوں۔

میرا سعودیہ آنے کا پروگرام مدت سے ٹلتا رہا ہے، پروگرام تھا کتنے دنوں پہلے آنے کا، مگر آج یہ ہے اور وہ ہے کر کر کے اتنی دیر ہوگئی ہے، اور دیر کرنا مشکل ہوگیا ہے، حالا جو بنگلا دیش میں دعوت تبلیغ کی نسبت سے اجتماع ہونے والا ہے، جس میں دنیا کے کونے کونے کے اہل دل جمع ہوں گے اس سے محروم نہ جانے کی امید پر اور چند دن یہاں ہوں۔

چلنے والا ماہِ جنوری کا ۱۹/ ۲۰/ ۲۱ رتین روزہ اجتماع ہوگا، انشاء اللہ تقدیر نے وفا کی اور حالات بھی سازگار رہے تو اواخر جنوری سعودی عرب آرہا ہوں، دعا کرنا کہ توفیق ہو، تفصیلی گفت وشنید ملاقات کے موقع پر ہوگی۔

آپ اپنے یار وآشنا کو میرا سلام سنانا، تمام بچے خیر وعافیت سے رہے، خوش وخرم رہے، والسلام۔

آپ کا مخلص

حسین احمد

۰۳/ ۰۱/ ۱۹۹۰ء۔ چاٹگام، بنگلا دیش۔

---

(۱) مولوی عبدالقادر سانگری بیلی بوسیدنگی صاحب مولانا حسین احمد صاحب کے قریبی ساتھیوں میں ایک بڑے تاجر تھے، قومی خدمات میں مرتے دم تک پیش پیش رہتے تھے، کچھ مہینے پہلے انتقال ہوگیا، اور مکہ مکرمہ میں مدفون ہیں۔

مراسلہ نمبر(۱۶)

جناب صدر صاحب! روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن(RLO)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

بخیر وعافیت سے ہوں، اللہ تعالی آپ کو اپنے احباب ومتعلقین کے ساتھ بخیر وعافیت سے رکھے۔

چند دن پہلے کا مکتوب کل ہی پوسٹ کیا گیا، آج میرا دوسرا خط مکہ مکرمہ سے، میں آج بھی فون پر گفتگو کرنا چاہا تو لائن کی مصروفیت نے کرنے نہ دیا، ضروری اور ہنگامی چیزوں پر آپ کی نگاہ محتاط رہی ہوگی، ادھر میں نے آج تک سکون سے دم نہیں لیا، رمضان والی تاخیر نے جو کچھ کیا وہ بظاہر نا قابل تلافی ہے، مگر قدرت کو جو کچھ منظور ہوگا ہو کر رہے گا، آپ مطمئن رہیں اور دوسروں کو اطمینان دلائیں۔

مولانا سیف اللہ صاحب کی فیملی آ گئی ہوگی، نظر رکھی جائے، حسین احمد چاٹگام آ گئے تو فون پر گفتگو کرا دینا، اور اطلاع دینا کہ مجھے ٹیکٹ بھیجنا ہے، موصوف کے ڈھاکہ جانے سے پہلے والی گفتگو اچھی تھی، احسان بھائی کو چاٹگام کی جگہ وہی غیر قوموں (اہل وطن بھائیوں) کی تنظیم سے دوستی کی راہ پر لگا نے والی آپ کی رائے صحیح ہے، مگر محتاط اور معقول انداز سے، ہم دوستی کے طلب گار رہیں۔

میں نے پہلے بھی لکھا کہ عزیز مولوی ابوطاہر اور احمد الرحمن (۱) کو دین وایمان اور وطن کی خدمت کے لئے قبول فرمائے، صبر وثبات، فہم وفراست اور علم دین کے بیش بہا خزانوں سے نوازے، دوسرے تمام عزیزوں کی فلاح وبہبودی چاہتا ہوں، اور آج تک کے لئے رخصت لیتا ہوں، والسلام۔

آپ کا مخلص:

حسین احمد

۱۳رشوال، مکۃ المکرمہ، سعودی عرب۔

---

(۱) صدیق مکرم جناب مولوی احمد الرحمن صاحب کی پیدائش ارکان کے معروف علاقہ کیوکتوی میں ہوئی، ابتدائی و متوسطہ کی تعلیم وہیں پاکر بنگلادیش آئے اور مدرسہ حکیمیہ عالیہ چنوتی سے سند فراغت حاصل کی، چاٹگام یونیورسیٹی میں سال دوسال پڑھتے رہے، مولوی صاحب بڑے ذہین وفطین اور حساس طالب علم تھے،، اللہ تعالی رحم کرے۔

مراسلہ نمبر(۱۷)

برادرِ محترم الحاج زبیر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

بخیر وطالبِ خیر ہوں۔

حجاز اقدس کی حاضری کے بعد حرم مکی کی زیارت اور ملتزم پر حاضری، ہر جگہ آپ کی یاد ستاتی رہی، آپ کے نام لے کر دعائیں دیں ان مبارک موقعوں پر، مگر کسی طرح کی خبر دیتے ہوئے دیر اس لئے لگ گئی کہ یہاں پہنچ کر ارادے کے بالکل ہی خلاف حالات دیکھے، ایک طرف عزیز محمد جلیل ریاض گیا ہوا ہے، دوسری طرف دوسرے عزیزوں کے حالات ناسازگار، تب ہی آج نہ ہو کل پرسوں کر کر کے آج تک دیر لگ گئی، آخر ناچار یہ خط دے رہا ہوں، پیسے حسبِ اشارہ دوایک دنوں میں آپ کو مل جائیں گے، پیسے بھیج دینے کے بعد اور ایک خط ڈالوں گا۔ والسلام۔

---

(۱) الحاج محمد زبیر یا زبیر احمد صاحب غالبا خیر فارہ منگڈو کے رہنے والے تھے، لیکن یہ یقینی بات ہے کہ آپ روہنگیا لبریشن آرگنائزیشن (RLO) کے صدر جناب الحاج مسٹر سلیم احمد صاحب مرحوم خیر فاروی کے قریبی رشتے داروں میں سے تھے، ۱۹۸۷ء سے لے کر عرصۂ دراز تک آپ کو سلیم صاحب کے قریب رہتے ہوئے دیکھا گیا تھا، جبھی ہمارا سلیم صاحب کی رہائش گاہ جانا ہوتا تھا، ہم آپ کو ان کی رہائش گاہ میں دیکھتا تھا، لوگوں کی خدمت کرنا گویا آپ کا شیوہ بن چکا تھا، صوم وصلاۃ کے بڑے پابند انسان تھے، اخلاقی اعتبار سے بھی آپ کا پایہ بہت ہی بلند تھا، خدا معلوم آج کل آپ کا کیا حال ہے، معلوم نہیں کہ آیا حیات سے ہیں یا دنیا سے چلے گئے ہیں؟ آپ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے چاہنے والوں میں سے تھے، جو مرقومہ مراسلہ سے ظاہر ہے، اور مولانا بھی آپ کے بڑے مداح اور دعا گو ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ پر رحم فرمائے، آمین یارب العالمین۔

مراسلہ نمبر (۱۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزم مولوی ابوطاہر سلمہ ربہ   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،،

خیر و عافیت کی صبح و شام میں خیر وفلاح کی امیدیں لے کر ہوں، تمہاری رفاقت نے آج تک جتنی منزلوں سے گزر کر رفیق سفر کا کام دے رہا ہے، یاد کرنا کجا یاد آنا بھی اپنی جگہ بارِگراں کا کام کر رہا ہے، مگر ان بارِگراں کو مدت سے بارِگرامی کی جگہ دے کر آگے بڑھتا آرہا ہوں، تو لکھنے بیٹھا تو کوئی عجب نہیں، تم بھی ان جوانوں میں دکھائے دو گے جن کی قلت و کثرت کی ہمیں کوئی بھی شکایت نہیں تھی، میری توقع کی چیز نہیں تھی، میں بہت یقین سے جانتا تھا کہ تہی دامن ہو علم وثقافت کے ان باریک معنوں میں، جن کا ہمارے یہاں بہت چرچا رہا ہے، وہ یقین والی بات ٹھیک رہی، مگر دوسری وہ بات بھی یقین کی حد کی تھی تم ملک وملت کے حق میں ایک نادر پھول بن کر تاریخ ملت کے روشن ابواب کی سرخی بنو گے، قوم وملت کے سپوتوں کے قافلے میں ایک سرخیل کی جگہ پوری کرو گے، مگر تقریباً اس یقین والی بات میں میری ڈگمگاہٹ تم خود اچھی طرح نظارہ کر رہے ہو، میں نے تمہیں بار بار کہتا آیا کہ تم میری باتوں کی مراد پانے میں بامراد رہا کرو، ان لوگوں میں جانہ ملو جنہیں نہ باتیں آتی ہیں اور نہ باتیں سمجھنے کی صلاحیت ہے، تم یہ بھی یقین مانو کہ تم سے جو کام مجھے لینے تھے، (اللہ کرے لیا بھی جائے) قوم میں تقریباً اور دو چار نہیں ہیں، تم آج بھی وہی اکیلا ہو جو کوئی دس سال پہلے تھا، زمانے نے میری باتیں سمجھنے میں اور مرادیں پالینے میں ہمیشہ نامرادی کا ثبوت دیا تو عجب کیا؟ آج بالکل سرمو انحراف کئے تم نے بھی وہی چال چلنا شروع کیا جس کے زخم سے میں چور اور رنجور ہی آیا ہوں۔

تمہیں میں نے بار بار کہتا آیا کہ یہ اہل خلوص وایمان کی راہ ہے، سودا بازی کی منڈی نہیں، یہاں اپنا سب کچھ بھولے ہوؤں کا کام ہے، چیز و ناچیز سے لو لگائے ہوؤں کا کام نہیں، مگر تم ہر سنی باتوں کو ان سنی باتوں میں اور ہر دیکھی چیزوں کو ان دیکھی چیزوں میں برابر کے تازیانے برسانے لگے، اور دنیا والوں کو دعوتِ نظارہ دینے لگے، یہی کچھ ہے اس سوختۂ غم کے سوز و ساز سے، تم خوش رہو، پرسعادت رہو اپنے میشن کے ساتھ، مگر کٹھن منزلوں سے دو چار، اللہ کرے کہ تمہاری اداسی کی عمر اور دراز نہ ہو۔

نوٹ: مجھے تعجب ہے اس بات پر کہ درِکریم کی چوکھٹ میں تمہارے نام یاد آنے میں کبھی خطا نہیں ہوئی، خوب مانگا تمہاری خیر وفلاح کے لئے، فوز وصلاح کے لئے، والسلام۔

تمہیں شادمان دیکھنے کا خوگر:

حسین احمد

مکہ مکرمہ، سعودی عرب۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۱۹)

بسم اللہ الذی فی کل سورۃ سمہ

عزیز گرامی میاں مولوی ابوطاہر سلمہ ربہ!

خیر و عافیت کا پیغام اور دعائیں دیتا ہوں۔ تمہارے نام کا گویا میرا دوسرا خط ۱۰؍دسمبر کو ڈاک سے بھیجا تھا، آج ۳۱؍دسمبر ہے، پہلا خط مولوی نور الہدی کے ہاتھوں ذوالحجہ کے آخری عشرہ کو بھیجا گیا تھا، تین چار مہینے کی مسلسل خاموشی کے بعد دل کو ایک گونہ خطرہ گزر کر ڈاک کا بھیجا تھا، اس کے بعد بھی آج تک کی بے خبری اور بھی تکلیف دے رہی ہے، صرف اتنی سی بات کسی طرح سمجھ آ گئی ہوتی کہ تم سلامت اور قیدِ حیات سے ہو اور مجھے خط لکھنا نہیں چاہتے ہو تو کوئی بات نہیں، حیات رہی تو ٹھیک ہے، پھر مجھے نہ لکھنا میری توقع کے باہر کی چیز نہیں تھی، میں اتنا لائق کہاں ہو گیا کہ لوگ مجھ سے ضابطے کے خط و کتابت کرنے لگے؟

کسی نہ کسی تدبیر سے اتنی سی بات پہنچ گئی ہوتی کہ زندہ وسلامت ہو تو اپنی ذمے داری سنبھالنے کی کوشش پر لگا رہتا، یوں تو تمہارے دو ایک پرچے پہنچے تھے، میں نے بے اعتنائی نہیں بلکہ سوچ اور سمجھ کر جواب لکھنے میں تاخیر کی، اور اتنی بھی عقل نہیں رہی تھی کہ یہ سوچ اور سمجھ کی تاخیر زندگی کی تمام سنی باتوں کو ان سنی کر دے گی، مستقبل کے تمام سرسبز خوابوں کو خاک وخون کر دیا جائے گا:

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

جن کی زندگیاں اپنے خواب وخیال کی سرسبز جنت سے گزر کر کبھی عمل وتطبیق کی لذت وکردار سے آشنا ہوسکتی ہوں، ان پاک طینتوں کا کیا کہنا؟ یوں تو زندگی کم نہیں گئی، ''عقود من السنین'' کے بھاری الفاظ سے یاد کی جائیں تو کچھ مبالغے کا کام نہیں ہوگا، اتنی لمبی مدت ہوگئی، جس کے اندر دنیا کی تاریخ میں بہت ساری شخصیات کا ابھرنا اور کامل ومکمل ابھرنا دیکھا گیا، ابوالکلام کو دنیا تیس اور چالیس سالوں میں نہیں بلکہ پندرہ اور بیس کے درمیان پوری طرح مان گئی، میرے اشارہ شبلی سے ملاقات اور ان کی پیش گوئی کی طرف ہے، جو گفتگو تھی ایک کہنہ مشق اور فنان علامۂ زمان سے ایک سترہ سالہ نونہال کی بابت، علامہ بنوری کو چودہ سالہ زندگی میں آپ کے ہندوستان نے ''المحدث الکبیر'' کا بھاری لقب دیا، علی میاں ندوی تو عرب وعجم کے صفحاتِ تاریخ میں نہیں بلکہ الواحِ دل ودماغ پر بیس اور پچیس کے درمیان ثبت ہوگئے، جمال الدین افغانی کی قیادت امت کی وسیع فضا میں جب گونج رہی تھی تو ان کی عمر شریف کی عمر ابھی بیس سے آگے نہیں پہنچی تھی، تو ہم پینتیس سے چالیس کے درمیان سانس لے رہے ہیں، کام کیا ہوا؟ صرف اور صرف خواب کی عمارتیں اٹھیں، جو بیداری کی انگڑائیاں لیتی ہوئی گر کر مسمار نظر آتی ہیں، سچ میں ایسی زندگیوں پر رحم کھاتے ہوئے ساتھویں صدی کے ایک صاحب دل انسان کا منہ کھولا تھا، اور وہ اپنے سے مخاطب تھے:

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاج تو از حالِ طفلی نہ گشت

اور تو وہ شاعر تھا، عارف تھا، آج کا یہ غم کھاتا ہوا انسان وہ شاعری کہاں سے لاتا کہ غم کھانے کا ایک ڈھنگ اپنے پیچھے چھوڑ جاتا؟

مادرِ وطن کے گیسوئے آبرو کو شکستہ سے شکستہ ترین دیکھ کر دل کا آئینہ بھی ٹوٹ جاتا ہے، آج کل حال بد نہیں بلکہ بدترین حال سے دوچار ہے، سدھرنا اور سنورنا خود ہمارے سر تھا، وہ بھی ٹوٹ کر گرنے لگا:

بال وپر ٹوٹے ہوئے پرواز کی طاقت نہیں
تاک میں صیاد ہے گلشن کی دیواریں بلند

قومی زندگی کے ان تلخ نوا حالات پر کسی حساس انسان کا دل ودماغ کھولا تھا، میں دو مہینے ہوئے دن گزار رہا ہوں حجازِ مقدس کے سفر کے لئے، خلیج کے المناک حالات نے انتظار میں رکھا، پندرہ جنوری تک مزید انتظار رہے گا، خدا کرے کہ تمہاری زندگی ہمہ گیر قسم کی کامیابیوں سے ہم کنار ہو جائے۔

تمہارے منتظرِ فردا:

حسین احمد

۳۱/دسمبر/۱۹۹۰ء۔ عابدہ منزل، چاٹگام، بنگلا دیش۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۲۰)

بسم اللہ سبحانہ

عزیزی وعزیز کبدی! اللہ تعالیٰ تمہاری سلامتی کا فیصلہ کرے۔

میں تمہارے نام اپنی زندگی کا ایک گونہ پہلا پیغام بھیج دیتا ہوں، خطوط بہت ملے، تمہاری غیر متوقع (بلکہ پوری توقع کی) کامیابی پر شکر وسپاس سے ہوں، یہ کوئی فلسفیانہ پیش گوئی تو نہیں تھی، تھی صرف اتنی کہ ایمان وفراستِ ایمانی کی کرشمہ سازی کہ:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

آج اس کا دوسرا مصرعہ بھی لئے لینا:

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

ان دونوں مصرعوں کے خاموش حقائق سے تہی دامنی کی شکایت تم سے بھی کی تھی، مگر آج سمجھ آگئی کہ میری آنکھوں کا وہ قطرہ یا نگاہوں کا پتلی جو آج کل گوہر تو ضرور ہے مگر گوہر قابلِ یقین نہیں، لیکن اپنے گوہر قابلِ یقین بننے کی تمناؤں میں موج وطلاطم کا شکار شورِ دریا پر وقت گزار رہا ہوں۔

آج اپنی زندگی کی پیاری چیز رہن میں چھوڑ کر تمہارے پیغام کا تیار ہوا، مگر چند دنوں کے اندر تمہارے پورے سال کا توشہ پہنچا دیتا ہوں، خدا کرے کہ یہ خوش گوار سلسلہ دراز سے دراز تر رہے، ادھر تمہاری نونہال زندگی پر لوگوں کی خشک حسرت تھی:

حسرت ہے ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا گئے

الحمدللہ آج تو کلیاں چھٹک رہی ہیں کھلنے اور آب وتاب سے کھلنے کی فکر میں۔

حسین احمد

جون/۱۹۹۰ء۔عابدہ منزل، چاٹگام، بنگلا دیش۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۲۱)

عزیزم مولوی ابوطاہر سلمہ ربہ وسالم بہ حفظہ!

تمہاری خیر و عافیت کی چاہت سے دل دکھتا رہتا اور فضا پریشان ہوتی رہتی ہے، حجازِ مقدس سے واپسی کے فوراً بعد میرے لینے دینے میں پہلا شخص وہ نکلا جس نے تمہارے چند خطوط دیئے ہیں گھر پر پڑے ہوئے، پڑھ پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور پریشانی بھی۔

دوسری طرف آج جب پہلی مرتبہ اپنے پرانے اور نئے تعلقات کے سلسلے پر نظر ڈالتا ہوں تو تمہارے نام کا فال نکل آیا، تم خوش رہو، خرم رہو، آباد رہو اور مقدام رہو۔

خوشی اس بات پر تھی کہ تمہاری زندگی کے نازک دامن سے جڑی ہوئی میری تمناؤں اور چاہتوں، امنگوں اور آرزوؤں کی دنیا آباد ہونے جارہی ہے، اور پریشانی اس بات کی ہے کہ میں وقت پر کام نہ آسکا، اور حجاز سے لکھنے لکھوانے کا تھا وہ بھی نہ ہوسکا، خدا کرے کہ تم آزمائشوں کے اس پار اپنی خاص مسکراہٹ سے نکل جاؤ گے۔

ادھر میرا تقریباً اس مہینے کا پروگرام تھا ہندوستان آنے کا، مگر یہاں کے حالات دیکھتا ہوں کہ تھوڑا ٹل جائے گا، میرے اس پرچے کے بعد اپنے سفر اور زادِ راہ کے متعلق کسی قدر بے نقاب الفاظ میں

مجھے اطلاع دینا، میں بڑے تردد سے دوچار ہوں، کہ تمہارے آج کل کے گزرنے والے دنوں کا سوال کہاں ہے۔

اس پوری زندگی کی طبیعت اور خصوصیت، دینی اور دعوتی کاموں کی رنگارنگی اور اسی راہ کی مشکلات و معضلات پر میری نگاہ ہر وقت تیز رہتی ہے، ادھر اور ایک کام نے تم پر سوچنے کی اہمیت بڑھا دی، اور وہ کام بھی اشارے پر لئے رکھو!

کتابوں کی قدیم فہرست جو خریدنی اور جمع کرنی تھی، اس سال تقریباً ۶۰٪ پوری ہوگئی، سعودیہ سے میری آنکھوں کے سامنے کارگو کا کام ہوا، یہاں پہنچ کر ڈھاکے سے خبر بھی آگئی کہ کتابیں ایرپورٹ تک پہنچ گئیں، اب اس راہ کی تیاری پر ہوں، تم سے فون پر بات کروں گا، اہم کتابوں کے نام ساتھ دیتا ہوں۔

ادھر تم آسانی سے سمجھ جاؤ گے کہ عام استفادے کی کتابیں کہاں جمع ہوتیں، اور وہ جگہ کس آن بان اور شان وشوکت کی ہوتی ہے، اور اس کام کا ادارتی اور انتظامی کام کتنی ذمے داری اور توفیق کا ہوتا ہے، مجھ ناتواں، بدتوفیق اور غریب الدیار سے کیسا بن پڑتا؟ سوائے اس نظام غیب کی کوئی چارہ جوئی کے، جو نااہل کی اہلیت اور ناتواں کی توانائی کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے، اور وہی کارسازِ حقیقی ہے۔

میرے سفر کے دنوں میں بہت کم وقت ایسا ہوگا جس میں تمہاری یاد نے تکلیف نہ دی ہو، بہت کم مقدس مقامات گئے ہوں گے جہاں تمہاری یادیں، تمہاری زندگی کی سرتاپا تصویر میری نگاہوں میں نہ رہی ہو۔

باقی سارے عزیز اچھے اور خیر سے ہیں، تمہاری چاہت کے مطابق ام انور سے دعائیں دلائیں، میں نے اپنی طرف سے بھی مانگیں، اور مانگنے کی دعائیں دیں، تم میرے دل کی باتیں سمجھنا شروع کرو، اللہ تعالیٰ تمہارا ساتھ رہے گا، والسلام۔

حسین احمد

عابدہ منزل، چاٹگام، بنگلا دیش۔

مراسلہ نمبر (۲۲)

عزیزم مولوی ابوطاہر سلمہ ربہ !

سلام مسنون کے بعد،

میری آج کل کی زندگی پوری طرح مسافرت میں گزر رہی ہے، یوں تو نابہ کار ہوں، شروع سے کم فرصتی نے اور بھی ویران کر دیا۔ سعودیہ سے واپسی کے بعد اتنے دنوں تک کتنے ارادے اور پروگرامز گئے کہ تمہی کچھ لکھوں، لکھنا متعدد دفعہ ہوا، بھیجنا ایک دفعہ بھی نہ ہوکر پریشانی ہوئی، اور تم بھی پریشان ہوئے ہوگے، آج کل دوسرے ایک طویل سفر کے لئے نکلنا ہو رہا ہے، مختصراً یہ پرچہ لکھنے بیٹھا ہوں۔

دوسری جگہوں پر تمہارے اشارے سے جو سمجھ رہا ہوں، یہ کہ تم اس سال رمضان کے بعد ادھر چلے آرہے ہو، وہ اگر سیرا ہے تو کسی طرح صحیح کہہ دیتا ہوں، دوسری کسی اور صورت پر ہے تو ابدا نہیں، کہ طالب علمی کے اس ادھورے پن میں تم بننے والے مستقبل سے آنکھیں بند کر کے ناعاقبت اندیشانہ حرکت کر بیٹھو، اور زمانے کے اس قافلے میں شامل ہونے آجاؤ، جس کے ہر ایک افراد ناسمتِ شناس مسافر ہیں۔

زندگی بنانے کی فکر میں (علم و تطبیق کے سارے میدان پر) اور چند دن وہاں گزارنا مناسب سمجھتا ہوں، ادھر حالات پر اتنی واقفیت نے کہ کسی طرح چلتا رہتا ہے، مجھے ایک گونہ بے فکر رکھا، آئندہ حالات صاف الفاظ میں لکھو کہ تشویشِ خاطر کا سبب نہ بنے، اور خدا حافظ۔

حسین احمد

۱۰/جنوری/۱۹۹۰ء

عابدہ منزل، چاٹگام، بنگلادیش۔

☆☆☆

مراسلہ نمبر (۲۳)

عزیزم مولوی ابوطاہر سلمہ ربہ وسالم بہ الدہر! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،،،،

امید نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ تمہاری ہمت وحوصلے کام میں لگ گئے ہیں، تمہارے دو چار پرچے یہاں تک ضرور پہنچے، مگر میرا کوئی لفافہ پوسٹنگ نہیں ہوا، بجز اس کے جو مولوی نورالہدی کے حوالے تھا، جس کے پیٹ میں پچاس ڈالر کا ایک نوٹ بھی بھرا ہوا تھا، اس دن سے آج تک کی اتنی لمبی مدت و مسافت مسلسل اور غیر متوقع خاموشی کی شکار گئی، تو حیرت کی حد ہوگئی۔

مولوی جشیم اور ایک طالب علم کی زبانی اتنی سی بات پا کر کہ ندوے میں ہے کہ ذہن و دماغ کو کسی قدر صدمہ بھی ہوا۔

یوں تو میری عادت نہیں لکھنے لکھوانے کی، لیکن تمہارے نام لکھنا کوئی گراں قدر اور گہرے انداز کا ہونا تھا، نہ ہوسکا، اس کو زمانہ کیا کہے نہ کہے انتظار نہیں، میں خود کہہ دیتا ہوں کہ یہ بے زبان کی گویائی تھی جو تمہاری سمعِ ناتواں کی مسلسل بے اعتنائیوں کی تاب نہ لا کر مایوس و غمگیں یہاں واپس پہنچی تو یہ اسی دوررس اور بارآور انجام کا آغاز دوسرے لباس میں ہو رہا ہے، گویا یہ الفاظ و محاورات کی شکل وصورت ہے حقائق و معانی کا رنگ و بو نہیں۔

مولوی نورالہدی والے پرچے میں میں نے صاف لکھ دیا تھا کہ دو ایک مہینے کے اندر پورے سال کا توشہ بھیج دیئے دیتا ہوں، مگر مقدر کو کیا منظور خبر نہیں، عزیز مولوی محمد جلیل وغیرے اچھی طرح روٹھ گئے، جس پر مجھے سعودیہ کا سفر پیش آیا، ایک ہفتے کے اندر روانگی ہوگی، انشاءاللہ۔

تم ابتر سے ابتر حالات کا مقابلہ اس ڈھب سے کرنا کہ خود حالات تھک کر عاجز آجائے، یہ تمہاری زندگی کی منزلیں ہیں گزرنے والی سڑکوں کا اسٹیشن نہیں، بلکہ مستقبل کی ہمہ گیر ترقیوں کے زینے ہیں جو ایک ایک کر کے طے پا رہے ہیں، بہت تلخ نوا حالات سے بھی گزر رہو گا، تم آزمائش و امتحان کے طوفان سے بھی دو چار ہوگے، ان صبر آزما اور دشوار گزار گھاٹیوں سے ہو کر اپنی زندگی اور زندہ روی کا لہلہاتا ہوا سرسبز باغ سامنے ہوگا، جو تم نہیں، قوم نہیں، ملت نہیں بلکہ پورے ایک عہد کو تازہ، زندہ اور سدا بہار کر دے گا۔

مگر ایک بات یادرکھنا اور کبھی بھول جانا نہیں! ندوے کی بزمِ علماء، دیو بند کا مدرسہ، تھانہ بھون کی خانقاہ اور نظام الدین کا مرکزِ دین و دعوت ہر وقت پورے اعتراف، پورے توازن اور پوری عقل مندی کے ساتھ نظروں میں رکھنا۔

یہ سب حکمت و دعوتِ ولی اللہی کے شجرۂ طیبہ کی ایک ایک ٹہنیاں ہیں، جو ہر وقت جداگانہ پھل اور پھول، جداگانہ رنگ اور مزہ دیتی رہی ہیں، اس شجرۂ طیبہ کی بیج اور چھوٹے چھوٹے پودے جنھوں نے آپ کے وطن عزیز کی فضا کو بھی علم و معارف کے حوالے سے عطرِ مجموعہ کا سروسامان کیا ہے، ورنہ آپ کی علمی و تحقیقی زندگی کے قدِ زیبا میں توازن و متانت کا فقدان آئے گا، اور شخصیت کی رنگارنگی اور ہمہ گیری سے آپ محروم بلکہ ایک گونہ نا مانوس وطن لوٹے ہوں گے، اس شکل میں ہماری امیدوں، امنگوں، تمناؤں اور چاہتوں کی دنیا ویران اور برباد نظر آئے گی، آپ ایسا تو نہیں چاہتے؟

انور کی بسم اللہ کرائی گئی الحمدللہ، ماشاءاللہ استاد کے پاس اس کی پذیرائی دیکھ کر آپ کا پرانہ خواب یاد آتا ہے، اور دل کو ایک گونہ خوشی بھی، ام انور کا سلام اور دعا قبول کرنا۔ والسلام۔

حسین احمد

۱۱/ ۱۲/ ۱۹۹۰ء

عابدہ منزل، چاٹگام، بنگلا دیش۔

ارکان اور اس کے متعلق بعض نمایاں تاریخی واقعات

۲۶۶۶ق م ۔ سے دھنووتی/ دھنیاودی پہلے عہد حکومت، جس کا سلسلہ ۸۰۰ق م تک جاری تھا۔

۸۲۵ق م ۔ سے دھنووتی/ دھنیاودی دوسرے عہد حکومت، جس کا سلسلہ ۷۸۸ء تک جاری تھا۔

۷۸۸ء ۔ ویسالی دورحکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۰۱۸ء تک جاری تھا۔

۹۵۷ء ۔ ارکانی راجا چولاٹنگ چندرا کے زمانے میں ارکان پر منگولوں کا حملہ، اور ارکان کی تاخت وتاراج۔

۱۰۱۸ء ۔ پن سا پہلے دورحکومت کی ابتداء، جو ۱۱۰۳ء میں اپنی انتہاء کو پہنچی تھی۔

۱۱۰۳ء ۔ پارن دورحکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۱۶۷ء تک جاری رہا۔

۱۱۶۷ء ۔ کریٹ دورحکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۱۸۰ء تک جاری تھا۔

۱۱۸۰ء ۔ پن سا دوسرے دورحکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۲۳۷ء تک جاری تھا۔

۱۲۳۷ء ۔ لنگریٹ دورحکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۴۰۴ء تک جاری تھا۔

۱۴۰۴ء ۔ برمی غاصب راجا ''من کھاؤن'' کا ارکان پر حملہ، نرامیخلا کی ارکان کی سلطنت سے بے دخلی۔

۱۴۰۴ء ۔ ارکانی باشاہ نرامیخلا (محمد سلیمان شاہ/ من سامون) کا ترک وطن یا جلاوطن۔

۱۴۳۰ء ۔ سلیمان شاہ کی ارکان واپسی اور مروکو حکومت کی بنیاد، جس کا سلسلہ ۱۷۸۴ء تک جاری تھا۔

۱۶۶۰ء ۔ بدنصیب مغل شہزادہ شجاع کی ارکان میں آمد، بعد میں اس کا مع اہل وعیال قتل۔

۱۶۶۶ء ۔ مگھ اور پرتگیز لٹیروں کی وجہ سے مختلف آلام و پریشانیاں۔

۱۷۱۰ء ۔ ارکان میں خانہ جنگی، اور وسیع پیمانے میں نقصانات۔

۱۷۸۴ء ۔ برمی غاصب راجا بودھوپھیا کا ارکان پر حملہ وقبضہ، اور اس کی دہشت گردی، اور قتل عام۔

۱۷۹۶ء ۔ تیس ہزار ارکانیوں (مگھ/ مسلمانوں) کا ترک وطن اور بنگال میں ان کی پناہ۔

۱۷۹۸ء ۔ جنرل علیہ بائنگ/ علی بھائی (مسلمان) وغیرہ کی برمی غاصبوں سے آزادی کی جدوجہد۔

۱۸۱۱ء ۔ سین فیا (KINGBERING) اور مسلم لیڈروں کی قیادت میں ہونے والے انقلاب کی ناکامی۔

۱۸۲۵ء ۔ پہلی انگلو برمن جنگ۔

۱۸۲۶ ۔ ارکان پر برطانیہ کا قبضہ۔

۱۹۳۰ء ۔ برمی مسلم تاجر'' اوباؤ ''کے تعاون سے برما مسلم سوسائٹی کا قیام۔

۱۹۳۰ء ۔ مگھ ڈاکو (بورینگ اونگ) اور اس کے حواریوں کی بربریت اور مسلمانوں کی بڑے پیمانے سے ہجرت۔

۱۹۳۰ء ۔ وسطی، تحتی برما اور ارکان میں مسلمانوں کا قتل عام اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۳۳ء ۔ روہنگیا جمعیت علمائے اسلام ارکان کی بنیاد۔

۱۹۳۶ء ۔ برطانوی ہند سے برما کی انتظامی علیحدگی، اور ملک بھر سے مسلمانوں کا کریک ڈاؤن۔

۱۹۴۲ء ۔ رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ۔

۱۹۴۲ء ۔ ارکانی مسلمانوں کا تاریخی قتل عام، اور بڑے پیمانے پر ان کی ہجرت۔

۱۹۴۲ء ۔ منگڈو، بوسیدنگ اور راسیدنگ پر مشتمل تاریخی ''مسلم ریاست'' کا قیام۔

۱۹۴۵ء ۔ ارکان میں برطانویوں کی دوبارہ واپسی۔

۱۹۴۵ء ۔ ''برما مسلم جنرل کونسل'' نامی تنظیم کا قیام۔

۱۹۴۵ء ۔ مسٹر عبدالرزاق کی صدارت میں برما مسلم کانگرس کا قیام۔

۱۹۴۶ء ۔ مسٹر عبدالرزاق کی سربراہی میں پمنا رپیومنا مسلم کانفرس کا انعقاد۔

۱۹۴۷ء ۔ سازش پر مبنی بدنام زمانہ ''پیلونگ کانفرنس'' کا انعقاد۔

۱۹۴۷ء ۔ برمی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات۔ جس میں ارکانی مسلمانوں کو قانونی طور پر نمائندگی ملی تھی۔

۱۹۴۷ء ۔ محمد جعفر حسین قوال کی زیر قیادت ''جہاد کونسل'' کی تشکیل اور ظالموں کے خلاف اعلان جہاد۔

۱۹۴۸ء ۔ برطانیہ سے برما یا برمیوں کو حصول آزادی۔

۱۹۴۸ء ۔ محمد قاسم بن عطاء الدین کی قیادت میں ''مجاہد پارٹی'' کا قیام۔

۱۹۴۹ء ۔ مولانا مظفر احمد کی زیر صدارت انجمن مہاجرین ارکان کا قیام۔

۱۹۵۰ء ۔ بی ٹی ایف کی بربریت، ہزاروں مسلمانوں کی شہادت اور ہزاروں کی ہجرت۔

۱۹۵۰ء ۔ بانیٔ تحریک آزادیٔ ارکان محمد جعفر حسین قوال کی افسوسناک شہادت۔

۱۹۵۱ء ۔ آزاد برما میں قومی اسمبلی کے پہلے عام انتخابات۔

۱۹۵۴ء ۔ ارکان میں بنگالی مگھوں کا دخول عام، مسلم بستیوں پر قبضہ، مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۵۶ء ۔ برمی قومی اسمبلی کے دوسرے انتخابات۔

۱۹۵۹ء ۔ ارکان میں اور ایک مرتبہ بنگالی مگھوں کا دخول عام، مسلم بستیوں پر قبضہ، مسلمان ترک وطن پر مجبور۔

۱۹۶۰ء ۔ مایو فرنٹیر اڈمنسٹریشن کا نفاذ۔

۱۹۶۱ء ۔ برمی قومی اسمبلی کے تیسرے عام انتخابات۔

۱۹۶۱ء ۔ راغب اللہ مرحوم وغیرہ کی قیادت میں ۲۹۰ سے زائد مجاہدین کا برمی فوجی قیادت کے سامنے سارنڈر۔

۱۹۶۲ء ۔ جمہوری آئین کی معطلی، اور اقتدار پر جنرل نے ون کی قیادت میں برمی فوج کا مکمل قبضہ۔

۱۹۶۲ء ۔ برما میں شوشل ازم کا نفاذ۔

۱۹۶۳ء ۔ نے ون کے نام نہاد قومی اسمبلی کے انتخابات۔

۱۹۶۴ء ۔ روہنگیا انڈیپنڈنٹ فورسس (RIF) کی تشکیل۔

۱۹۶۶ء ۔ مگھ شر پسندوں کی شر پسندی اور برمی بربروں کی بربریت کی وجہ سے مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۶۶ء ۔ محمد جعفر ثانی کی قیادت میں ارکان آزاد فوج (RNLP) کی تشکیل۔

۱۹۷۳ء ۔ نے ون کی قیادت میں برمی فوج اور اس کے لالے پالے غنڈوں کے مظالم، اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۷۳ء ۔ محمد جعفر حبیب (رحمہ اللہ) کی زیر قیادت روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کی تشکیل اور اعلان۔

۱۹۷۵ء ۔ جنرل نے ون کی ایماء پر مسلمانوں کی وسیع پیمانے میں گرفتاریاں اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۷۵ء ۔ ارکان ہسٹریکل سوسائٹی (AHS) کا قیام۔

۱۹۷۷ء ۔ روہنگیا مسلم طلبہ تنظیم ''رابطۃ الطلاب المسلمین الروہانجیین کا قیام۔

۱۹۷۸ء ۔ نے ون کے نام نہاد برمی قومی اسمبلی کے انتخابات۔

۱۹۷۸ء ۔ ناگامن آپریشن، برمیوں اور مگھوں کی غارت گری، مسلمانوں کی عام گرفتاریاں، قتل عام اور ہجرت۔

۱۹۷۹ء ۔ روہنگیا جمعیت علماء (مسلح) کی زیر زمین جدوجہد کا آغاز۔

۱۹۸۲ء ۔ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی تشکیل۔

۱۹۸۲ء ۔ مولانا عبدالقدوس مجاہد کی امارت میں حرکۃ الجہاد الاسلامی نامی تنظیم کی جدوجہد کا آغاز۔

۱۹۸۲ء ۔ نے ون قومی اسمبلی کے اور ایک نام نہاد انتخابات۔

۱۹۸۶ء ۔ ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کی تشکیل۔

۱۹۸۶ء ۔ مولانا عبدالحمید مجاہد کی زیر امارت ''روہنگیا اسلامی محاذ'' نامی تنظیم کی تشکیل۔

۱۹۸۶ء ۔ روہنگیا طلبہ تنظیم، اتحاد الطلاب المسلمین ارکان۔ برما۔ (ITM) کی بنیاد۔

۱۹۸۸ء ۔ جنرل نیون کی اقتدار سے ہمیشہ کے لئے چھٹی، اور سین لوین کی گدی نشینی۔

۱۹۸۸ء ۔ ڈاکٹر مونگ مونگ کی چند دنوں والی حکومت۔

۱۹۸۸ء ۔ جنرل سا مونگ کی قیادت میں اقتدار پر فوج کا دوبارہ قبضہ۔

۱۹۸۸ء ۔ مولانا محمد حنیف راغب ارکانی کی قیادت میں ''اتحاد المجاہدین'' نامی تنظیم کی تشکیل۔

۱۹۸۸ء ۔ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کا اعلان۔

۱۹۹۰ ۔ ارکانیوں کی نمائندہ جماعت ''نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی فار ہیومن رائٹ (NDPHR) کا قیام۔

۱۹۹۰ء ۔ نام نہاد انتخابات / اقتدار پر فوج کا قبضہ، جس کا سلسلہ تان شوے سے لے کر اب تا جاری ہے۔

۱۹۹۱ء	۔	روہنگیا مسلمانوں پر مظالم اوران کی بڑے پیمانے پر ہجرت۔
۱۹۹۱	۔	مسلمانوں کا قتل عام،وسیع پیمانے میں مسلمانوں کی گرفتاریاں،اوران کی بڑے پیمانے پر ہجرت۔
۱۹۹۵ء	۔	روہنگیا نشنل الائنس (RNA) نامی الائنس کی تشکیل۔
۱۹۹۸ء	۔	ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کی تشکیل اوراعلان۔
۲۰۱۱ء	۔	ارکان روہنگیا یونین (ARU) کی بنیاد اوراعلان۔
۲۰۱۲ء	۔	مسلمانوں کا قتل عام،ہزوروں شہادت،ہزاروں ماں بہنوں کی عصمت دری،اورلاکھوں کی ہجرت۔

مصنف کی بعض مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف

سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی	سازش کا طوفان عقلیت ومادیت کے روپ میں
روہنگیا مسلمانوں کے جانگسل المیے	تذکرۂ علامہ سید الامینؒ
تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانیؒ	روہنگیا مسلمان اوران کی ہجرت کے اسباب
ارکان کے عظیم شاعر علاول،حیات وکارنامے	ارکان روہنگیا یونین،ماضی اور حال کے تناظر میں
روہنگیا چیخ وپکار اور مطالبات (ترجمہ)	حیاتِ نور (تذکرۂ ارکانی لیڈر جناب نورالاسلام)
وادئ پرخار کے گمنام مسافر	سالارِ کارواں محمد جعفر حبیبؒ
سرخیل کارواں	جمعیتِ علمائے اسلام ارکان
روہنگیا رسم الخط کا ایک علمی اور فکری جائزہ	روداد سخن
نقوش خیال	ارکان کے دو بڑے ستارے
حیاتِ ڈاکٹر محمد یونس	اارکان کے چند ندوی فضلاء
نقوش رفتہ	علماء اور جمعیت علمائے ارکان
دیوان طاہر	روہنگیا رسم الخط کا ایک علمی اور فکری جائزہ
مدارس اسلامیہ کا نصاب ونظام اور جدید تقاضے	دو نظام تعلیم
ارکان کے روہنگیا مسلمان موت وحیات کی کشمکش میں	ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO)
حرکۃ الیقین (ARSA)	شعرائے ارکان
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۱)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۲)
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۳)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۴)
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۵)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۶)
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۷)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۸)
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۹)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۱۰)
تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۱۱)	تاریخ ارکان کے درخشان ستارے،جلد(۱۲)


Kachin
Myitkyina
Sagaing
Hakha
Sagaing
Mandalay
Chin
Shan
Mandalay
Taunggyi
Akyab
Magwe
Magwe
Naypyidaw
Arakan
Loikaw
Kayah
Bago
Bago
Pathein
Yangon
Kayin
Hpa-an
Ayeyarwady
Yangon
Mawlamyine
Mon
Dawei
0 100 200 300 400 500 km
Tanintharyi


CHIN STATE
Taung Pyo Letwe
Buthidaung
Maungdaw
Kyauktaw
Mrauk U
Rathedaung
Ponnagyun
Minbya
Pauktaw
Sittwe
Myebon
RAKHINE (ARAKAN) REGION
MAGWE REGION
Ann
Kyaukphyu
Ramree
Taungup
Manaung
Bay of Bengal (Indian Ocean)
BAGO REGION
Thandwe
Kyeintali
Gwa
Rohinga minority
Rohinga majority
AYEYARWADY REGION